PAGES MISSING
WITHIN THE
BOOK ONLY

TIGHT BINDING BOOK

مستعار لے کر ان سے استفادہ کیا گیا - بعض اخباروں کے صرف متفرق پرچے ہی ہاتھہ آسکے ' میں سمجھوں گا میری محنت سپھل ہوئی اور میری کوشش مقبول ہوئی اگر کسی بہتر و سایل اور قابلیت کے اہل وطن کو اس سے اس موضوع کو آگے لے جانے کا شوق پیدا ہوجاے - ہمارے ملک میں کوئی کتب خانہ اردو کے صحایف و جراید یعنی موقت الشیوع لٹریچر کا نہیں - کیا اچھا ہو کہ کوئی صاحب یا منظم جماعت ایک ایسا کتب خانہ قایم کرنے کا عزم بالجزم کریں —

آج کل سنہ ۱۹۳۴ ع ھے - میں نے جو نصف صدی کی قید لگائی ھے اس میں سنہ ۱۸۸۴ع تک کے اخبار آتے ھیں - اس لئے میرا دل بہت کڑھا جب مجھے سنہ ۱۸۸۵ ع اور اس کے بعد کے اخباروں کو اس مضمون سے خارج کرنا پڑا - یہ زمانہ نسبتاً حال کا ھے اس کے تاریخی کوایف فراہم کرنے میں اُتنی دقتوں کا سامنا نہیں - ممکن ھے کہ کوئی اہل ہمت یا یہ ناچیز ہی کبھی یہ خدمت بھی انجام دے سکے - اب اردو صحافت کی مختصر اور اجمالی تاریخ کے ساتھہ اکثر اخباروں سے اقتباس مع اُن کی تاریخ اجرا وغیرہ کے پیش کئے جاتے ھیں - امید کہ ہماری صحافت کے باغ کے رنگا رنگ گل بوٹوں کی سیر سے آپ محظوظ ہوں گے - اور معترف ہوں گے کہ اس دور دراز کے زمانے میں اور اُس کم مایگی اور بے سروسامانی کے باوجود سلف نے واقعی صحافت کی داد دی —

اب تک کی تحقیقات سے یہ پایا جاتا ھے کہ سنہ ۱۸۳۵ ع میں شمالی ھند کی دفتری زبان فارسی سے اردو ہوئی اور سنہ ۱۸۴۲ ع سے دھلی کی سوسائٹی میں علمی کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ ہونے لگیں - اردو کا پہلا اخبار جیسا کہ اب تک دریافت ہوا ھے سنہ ۱۸۳۶ ع میں

دهلی سے جاری هوا - اس کا نام تها 'اردو اخبار' یه اخبار شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر نے نکالا اور سنه ۱۸۵۷ ع تک خوب چلتا رها - اس اخبار کے پرچے اب بہت هی کمیاب هیں - عملی نقطۂ نظر سے اردو اخبار اور اس کے مطبع کو اشاعت خیالات تربیت راے عامه اور طباعت کتب میں اولیت کا امتیاز حاصل هے - ۱۳ ستمبر سنه ۱۸۴۳ ع کے 'سراج الاخبار' سے ظاهر هوتا هے که اُن دنوں یعنی سنه ۱۸۴۳ ع میں مولوی محمد باقر نے ایک اور اخبار بهی نکالا تها جس کا نام 'مظهر حق' تها - اس کا ذکر سراج الاخبار کی مذکورہ اشاعت میں "خبر اخبار جدید" کے عنوان کے نیچے آیا هے - یه اخبار 'مظهر حق' اردو میں تها - اس کی عمر کی مُدت معلوم نه هو سکی —

اردو کے دوسرے اخبار کا نام 'سید الاخبار' هے - یه اخبار سر سید احمد خاں مرحوم کے بڑے بهائی سید محمد خاں نے سنه ۱۸۳۷ ع میں دهلی سے نکالا تها - لیکن عین شباب میں ان کا انتقال هوگیا - یه اخبار کچهه دن سر سید احمد خاں نے چلایا لیکن پهر وہ اور کاموں میں مصروف هو گئے اور اخبار بند کر دیا گیا - ۱۴ اگست سنه ۱۸۴۳ ع کے 'سراج الاخبار' سے پایا جاتا هے که کم سے کم اس تاریخ تک یه اخبار زندہ تها - 'سراج الاخبار' آپ کو معلوم هے قلعه کا فارسی اخبار اور بادشاہ دهلی کا ایک قسم کا روزنامچه تها - اس کی اشاعت مذکورہ میں ایک خط ابوالقاسم کی طرف سے شایع هوتا هے جو اس نے سراج الاخبار کے مهتمم یعنی اڈیٹر سید اولاد علی کو بهیجا تها - یه اس تنقیح پر روشنی ڈالتا هے - (ترجمه ملاحظه هو) :-

" بندہ گنهگار ابوالقاسم کا التماس سید اولاد علی صاحب کی خدمت میں یه هے که میر سید محمد خاں بهادر جو مطبع

'سیدالاخبار' کے مالک اور بزرگ اور بزرگ زادہ ہیں آپ کی تحریر دیکھ کر غریب خانہ پر تشریف لائے - اور فرمانے لگے کہ میں نہیں جانتا کہ عبدالغفار خاں نے کس اخبار میں خدام مہتمم 'گیتی نما' کی شان میں بے ادبی سے لکھا ہے - یہ اسی سے دریافت کیا جائے - اور اگر اخباروں کے لکھنے پر ایسا گمان کیا جائے تو اس میں سید عبدالغفور کا قصور نہیں کیونکہ 'سیدالاخبار' کا طرز ایسا نہیں ہے" —

اس سے یہ صاف ثابت ہوگیا کہ سنہ ۱۸۴۳ع کے اگست تک سید محمد خاں اور ان کا 'سید اخبار' زندہ تھے - دوسری بات یہ پائی جاتی ہے کہ اسی زمانے میں کوئی اخبار 'آئینہ گیتی نما' کے نام سے بھی نکلتا تھا اور غالباً اس کا مالک یا سر پرست شاہی خاندان کا کوئی ممبر تھا جس کی شان میں کہیں گستاخانہ کلمے لکھے گئے تھے - کیونکہ اس خط میں یہ الفاظ آئے ہیں :- "در کدام اخبار نسبت بہ خدام مہتمم آئینہ گیتی نما کلمۂ سوء ادبی نوشتہ اند" - اس سے واضح ہوتا ہے کہ آئینہ گیتی نما کا مہتمم خاص ممتاز حیثیت رکھتا تھا —

سمجھنے اور سمجھانے کی آسانی کی غرض سے زمانۂ زیر سلوک کو میں نے تین حصوں پر تقسیم کیا ہے :—

۱ - ابتدا سے سنہ ۱۸۵۹ع تک

۲ - سنہ ۱۸۶۰ع سے سنہ ۱۸۶۹ع تک

۳ - سنہ ۱۸۷۰ سے سنہ ۱۸۸۴ع تک

کوشش ہوگی کہ ہر عہد کے بعض نامی اخباروں سے جستہ جستہ اقتباس پیش کیے جائیں - جو نوعیت اور موضوع کی قید سے آزاد ہوں گے - ہر

دور کے آخر میں تبصرے کی طور پر مختصر نوت دئے جائیں گے تاکہ آپ کو رائے قایم کرنے میں آسانی ہو —

تاکہ مغالطہ کا محل باقی نہ رہے یہاں یہ ذکر کر دینا ضروری ہے کہ کئی اخبار اپنے ماسبق کے ہمنام بھی ہیں - قدیم 'اردو اخبار' کی نسبت آپ ابھی سن چکے ہیں کہ سنہ ۱۸۵۷ ع میں بند ہوا - اسی نام کا ایک اخبار دہلی ہی سے ۱۸۷۱ ع میں نکلنا شروع ہوا - اس کا نام بھی اردو اخبار' ہی تھا دہلی کے اضافہ کے ساتھہ - یعنی " اردو اخبار دہلی " - یہی حال 'سفیر ہند' وغیرہ ناموں کا ہے —

اردو کا تیسرا اخبار 'فواید الناظرین' ہے - یہ اخبار ریاضی کے مشہور عالم اور محقق و موجد ماسٹر رام چندر نے سنہ ۱۸۴۶ ع میں دہلی سے نکالا - اس میں مشہور اشخاص کی تصویریں اور مقامات وغیرہ کے نقشے بھی ہوتے تھے جو اب تک اور کہیں معدوم تھے - اس کی ایک جلد میرے کتب خانے میں موجود ہے - یہ اخبار ماسٹر صاحب کے مطبع دارالعلوم دہلی میں چھپتا تھا - یہ اردو کا پہلا اخبار تھا جس میں نقشہ اور سائنٹیفک مضامین کے علاوہ بعض علمی آلات اور تاریخی اشخاص کی دستی تصویریں بھی ہوا کرتی تھیں' اور ان امور کے لحاظ سے اس اخبار کو اولیت کا امتیاز حاصل ہے —

اسی سنہ ۱۸۴۶ ع میں ایک اور اخبار دہلی سے جاری ہوا اس کا نام 'قران السعدین' تھا - گوالیار کے معزز و مشہور کرنل سر کیلاس نراین ہاکسر کے دادا پنڈت دھرم نراین (بعد میں راے بہادر سی - ایس - آئی) مولانا صہبائی کے تلمیذ رشید نے یہ اخبار نکالا تھا جو بارہ برس تک چلتا رہا —

موجودہ وسایل تحقیق کی رو سے اردو کا پانچواں اخبار 'اسعدالاخبار' ہے - اس کی اشاعت ۷ مئی سنہ ۱۸۴۷ع سے شروع ہوئی - آگرہ سے ہفتہ وار نکلتا تھا - کوئی صاحب قمرالدین پھلتی بازار آگرہ سے نکالتے تھے - تقطیع ۱۴ × ۹ تھی اور قیمت آٹھہ آنہ مہینا بلا محصول ڈاک - پتا چلتا ہے کہ ۱۱ اگست سنہ ۱۸۵۱ع تک یہ اخبار ضرور جاری تھا - دیوان تفتہ کی جلد اول اسی اخبار کے مطبع سے نومبر ۱۸۴۹ ع میں شایع ہوئی تھی —

۲۰ نومبر ۱۸۴۸ ع کی اشاعت میں مرزا حاتم علی مہر کا یہ قطعہ تاریخ درج ہے جو انہوں نے لارڈ ڈلہوزی کے خیر مقدم میں کہا تھا : —

لارڈ ڈلہوز است رونق بخش ہند　　اے صبا در شش جہت ایں مژدہ گو
مصرع تاریخ مقدم گفت 'مہر'　　افتخار ہند بادا نجم تو
۱۸　　　　　　　۴۸　　　ع

۲ مارچ سنہ ۱۸۴۹کی اشاعت میں مرزا غالب کی پنچ آہنگ کا اشتہار ایک لمبی نظم میں درج ہے - یہ کتاب شاہی طبیب حکیم احسن اللہ خاں کے توسل سے قلعہ دہلی کے مطبع سلطانی میں چھپی تھی —

اس اخبار سے ایک اقتباس اور لیا جائے گا - یہ غالب کے خطاب سے متعلق ہے جو انہیں حضرت بہادر شاہ کے دربار سے عطا ہوا - ۱۵ جولائی سنہ ۱۸۵۰ ع کے اسعدالاخبار میں یہ خبر درج ہے : —

" ان دنوں شاہ دیں پناہ نے جناب معلے القاب مرزا اسداللہ خاں غالب کو بہ فرط عنایت اپنے حضور طلب کر کے ایک کتاب تواریخ کے لکھنے پر جو تیمور کے زمانے سے سلطنت حال تک ہو مامور کیا اور اس کے کاتبوں کے خرچ کو بالفعل پچاس روپیہ مشاہرہ مقرر کر کے آیندہ انواع پرورش کا متوقع کیا اور نجم الدولہ دبیر الملک اسداللہ خاں بہادر نظام جنگ خطاب

دے کر چھہ پارچہ کا بیش بہا خلعت اور تین* رقم جواھر عطا فرمائے۔
یقین ھے کہ تواریخ مذکور ایسی دلچسپ اور متعین عبارت میں
لکھی جائے گی کہھر ایک اس کے لطف عبارت سے فیضیاب ھوگا"۔

دھلی میں ایک شاھی مہر کن تھے - شہر میں ان کا نام بدرالدین مشہور تھا - لیکن ۹ دسمبر ۱۸۵۰ع کا اسعدالاخبار انھیں بدرالدین علی خاں لکھتا ھے - ملکہ وکٹوریہ کی فرمایش پر انھوں نے دو مہریں کندہ کیں ایک ملکہ معظمہ کے نام کی اور دوسری ان کے رفیق زندگی پرنس البرٹ کے نام کی - اخبار مذکور سے وہ الفاظ نقل کیے جاتے ھیں جو ان مہروں پر کھودے گئے - دیکھئے انگریزی اور لاطینی الفاظ کا ترجمہ کس خوبی سے کیا ھے :—

۱ - "شہنشاہ سلیمان جاہ کیوان بارگاہ خاقان ادھر سلطان البحر
مورد الطاف ایزد رحمان بادشاہ انگلستان وایرلند
و فرمانفرمائے ملک ھند ناصردین مسیحا ملکہ وکٹوریہ

۲ - "المؤید بتائید الہی فخر خاندان شہنشاھی برنسوک
انیس معزز ملکہ معظمہ رفیع القدر والا شان سر آمد بارگاہ
انگلستان البرٹ فرانسس اکسس جارلس ایمان دل"۔

سنہ ۱۸۵۰ع میں کوہ نور کا ظہور ھوا - یہ پنجاب کا اولین اخبار ھے - اس کو نئے طرز کا پہلا اخبار کہا گیا ھے - منشی ھر سکھہ راے سکندر آباد (مضافات دھلی کے رھنے والے تھے - انھوں نے ۱۸۵۰ع کے شروع سے لاھور میں یہ اخبار جاری کیا - اس سال کے اختتام پر اس کے خریداروں کی تعداد دو سو ستاون تھی - خریداروں اور چندے کی

* جیغہ - سر پیچ - مالائے مروارید

وصولی کی فہرستیں وقتاً فوقتاً اخبار میں چھپا کرتی تھیں - چنانچہ سر جان لانس ، لفٹنٹ اِنس ، مسٹر میکلوڈ ، مسٹر سلیمن اور مسٹر میگریگر وغیرہ اعلیٰ انگریز افسروں کے نام ایسی فہرستوں میں ملتے ھیں پایا جاتا ھے کہ اس اخبار کی خریداری مدراس ، بمبئی اور کلکتہ تک پھیلی ہوئی تھی - سنہ ۱۸۸۳ ع میں یہ اخبار ھفتہ وار سے روزانہ ہوگیا لیکن پھر ھفتہ وار ھوگیا - یہ واقعہ دلچسپی سے سنا جائے گا کہ سنہ ۱۸۵۸ ع میں یا اُس تک مشہور ھندو منشی نول کشور ' کوہ نور ' کے عملے میں کام کرتے تھے - لاھور کے تین اخباروں کی ادارت سے جتنے علما اور ادیبوں کو وابستگی رہ چکی ھے اُتنی لکھنو کے ' اودہ اخبار ' کے سوا شاید کسی اخبار کو نصیب ھوئی ھو - یعنی ' کوہ نور ' ' پیسہ اخبار ' اور ' زمیندار ' کوہ نور کی ایک امتیازی خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ بلا لحاظ مذھب و ملت ھندو مسلمان اور عیسائی اڈیٹروں کے ھاتھوں میں رھا - (چنانچہ نادر علی شاہ تاج الدین - منشی نول کشور ، مرزا موحد منشی نثار علی شہرت ، مولوی سیف الحق ادیب ، مولوی محمد دین فوق اور منشی محرم علی چشتی و غیرھم اصحاب اس کی ادارت کے کفیل رہ چکے ھیں —

خدا معلوم کوہ نور کے نام میں کیا جادو تھا کہ اس کی پیدائش کے بعد بہت سے اخبار ایسے نکلنے لگے جن کے نام نور سے ترکیب دے گئے تھے مثلاً دریائے نور لاھور سے ، نورالاخبار اور نور افشاں لدھیانہ سے ، نورالانوار اور مطلع نور وغیرہ —

آخر یہ نامی گرامی اخبار بہت سے انقلابات جھیلتا ھوا سنہ ۱۹۰۴ ع میں بند ھوگیا —

سنہ ۱۸۵۳ ع میں رائے دیوان چند رئیس سیال کوٹ نے ایک اخبار 'پساپے بہا' مطبع چشمۂ فیض سے جاری کیا - یہ اخبار وکٹوریا پیپر کے نام سے اب تک جوں توں زندگی کے دن بھر رہا ہے —

'اخبار عام' سنہ ۱۸۷۱ ع میں لاہور سے جاری ہوا' ہفتہ وار نکلتا تھا اور ایک پیسہ میں بکتا تھا' پنڈت مکند رام متر ولاس پریس سے نکالتے تھے' رفتہ رفتہ روزانہ ہوگیا یہ اخبار اب بھی جاری ہے اور اس وقت پنجاب میں سب سے پرانا اخبار ہے —

'اودھ اخبار' سنہ ۱۸۵۸ ع میں لکھنو سے جاری ہوا - لاہور میں کوہ نور کے دفتر میں بیٹھہ کر پریس اور اخبار کے چلانے کے رموز پر حاوی ہوکر منشی نول کشور (پھر سی' آئی' ای) نے یہ اخبار نکالا جو سنہ ۱۸۷۴ ع میں روزانہ ہوا اور اس وقت تک آب و تاب سے روزانہ چل رہا ہے - کسی نہ کسی جذبے سے متحرک ہوکر حاسد لوگ کہتے تھے کہ اودھ اخبار پایونیر کا ترجمہ ہوتا ہے - یہ کچھہ ہی ہو' محض یہ واقعہ کہ وہ اپنے صوبہ کا یا غالباً کل اردو دنیا کا پہلا روزنامہ ہے اور یہ کہ مشہور عالم فسانۂ آزاد اول اول اسی اخبار کے ضمیمہ کی طور پر اشاعت پذیر ہوا کرتا تھا کیا اس کے لئے طرۂ امتیاز نہیں - ملک کے بعض نہایت قابل اور نامی اصحاب اس اخبار کی ادارت کو فخر بخشتے یا شعبۂ ادارت سے وابستہ رہے ہیں مثلاً مولوی غلام محمد تپش تلمیذ غالب - مولانا سید امجد علی اشہری - پنڈت رتن ناتھہ سر شار - منشی نوبت رائے نظر مرزا حیرت دہلوی - حضرت جالب دہلوی - مرزا یاس عظیم آبادی (اب مرزا یگانہ لکھنوی) - مسٹر شوک تھانوی - مرزا محمد عسکری اور مسٹر پیارے لال شاکر رغیرہم - اس اخبار کو

عہد حاضر کے صحیفوں میں سب سے پرانا کہنا چاہئے —

لکھنؤ میں 'اودہ پنچ' کے اجراء نے جو سنہ ۱۸۷۷ ع کا واقعہ ہے - اردو ادب میں ایک نئے ادارہ کا دروازہ کھولا - یعنی مزاح حسنہ اور مطائبات کو رواج دیا - اب تک لوگوں کا علم مطائبات سعدی اور ہزلیات جعفر زٹلی تک محدود تھا جن کو وہ کوٹھری کا دروازہ بند کر کے پڑھتے اور بد مذاقی کے مزے لوٹتے تھے - یا احباب کی بے تکلف صحبتوں میں ان کی تاویل و تعبیر کرتے - لیکن 'اودہ پنچ' نے واقعات حاضر اور سوشل اور سیاسی معاملات کے گتھل مدارج کو ظرافت کی برچک دی - نہ صرف یہ کہ جس طرح اکبر مرحوم کو کانگرس اور لیگ سامنے کے موضوع مل گئے - منشی سجاد حسین کو سر سید احمد خاں اور علی گڑہ کی تحریک جدید ہاتھہ آ گئے - بلکہ منشی صاحب مرحوم کی غایر نظر سے کوئی واقعہ یا شخصیت جو مزاح کا عنصر رکھتی ہو یا جس کی کوئی کل ڈھیلی ہو بچ نہیں سکتی تھی ان کے وار کو کوئی خالی نہ دے سکا - کارٹوں کی ابتدا بھی اودہ پنچ ہی کی ذات سے ہوئی - اودہ پنچ کی ہر دلعزیزی اور قبولیت عام کا موازنہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے مندرجات کے انتخاب کے دو خاصے ضخیم مجموعے اب تک شایع ہو چکے ہیں - ایک گلدستۂ پنچ اور دوسرا انتخاب اودہ پنچ —

ذیل کی جدول سے وہ اردو کے قریباً ساٹھہ اخباروں کے کوایف معہ سنہ ابتدا وغیرہ کے معلوم ہوں گے' جس کے بعد بعض اخباروں سے اقتباس پیش کئے جائیں گے' اور اپنے قایم کئے ہوے ہر دور کی صحافت پر مختصر تبصرہ بھی ہوگا —

تفصیل دور	شمار	نام اخبار	مقام اشاعت	تاریخ اجرا	اڈیٹر
دور اول ابتدا سے سنہ ۱۸۵۹ ع تک	۱	اردو اخبار	دھلی	سنہ ۱۸۳۶ ع	مولوی محمد باقر
	۲	سید الاخبار	دھلی	سنہ ۱۸۳۷	سید محمد خان
	۳	سراج الاخبار (فارسی)	قلعہ دھلی	سنہ ۱۸۴۱	
	۴	فوا ید الناظرین	دھلی	سنہ ۱۸۴۶	ماسٹر رام چندر
	۵	قران السعدین	دھلی	سنہ ۱۸۴۶	پنڈت دھرم ناراین ھاکسر
	۶	ضیاء الاخبار	دھلی	سنہ ۱۸۴۹	شیخ محمد ضیاءالدین دھلوی
	۷	کوہ نور	لاھور	سنہ ۱۸۵۰	منشی ھرسکھہ راے
	۸	ھما بے بہا	لاھور	سنہ ۱۸۵۳	منشی دیوان چند
	۹	کشف الاخبار کاشف الاسرار	بمبئی	سنہ ۱۸۵۵	منشی امان علی لکھنوی
	۱۰	صادق الاخبار	دھلی	سنہ ۱۸۵۶	
	۱۱	مفرح القلوب (فارسی)	کراچی بندر	سنہ ۱۸۵۶	مرزا محمد شفیع خلف مرزا مخلص علی
	۱۲	اردو گائڈ	کلکتہ		
	۱۳	اودھ اخبار	لکھنؤ	سنہ ۱۸۵۸	منشی نول کشور
دور دوم سنہ ۱۸۶۰ ع سے سنہ ۱۸۶۹ ع تک	۱۴	اخبار عالم	میرٹھہ	سنہ ۱۸۶۱	محمد وجاھت علی خاں
	۱۵	اخبار انجمن اودھ موسوم بہ - بھارت پتر کا	لکھنؤ	سنہ ۱۸۶۲	
	۱۶	نجم الاخبار	میرٹھہ	سنہ ۱۸۶۳	مولوی محمد حیات
	۱۷	لارنس گزٹ	میرٹھہ	سنہ ۱۸۶۴	سید جمیل الدین
	۱۸	آگرہ اخبار	آگرہ	سنہ ۱۸۶۵	مولوی خواجہ یوسف علی
	۱۹	پنجابی اخبار	لاھور	سنہ ۱۸۶۵	

تفصیل دور	شمار	نام اخبار	مقام اشاعت	تاریخ اجرا	اڈیٹر
	۲۰	اکمل الاخبار	دھلی	سنہ ۱۸۶۶	منشی بہاری لال 'مشتاق'
	۲۱	علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ	علی گڑھ	سنہ ۱۸۶۶	
	۲۲	رھیلکھنڈ گزٹ	مراد آباد	سنہ ۱۸۶۶	منشی بشن سروپ
	۲۳	بدیا بلاس	جموں	سنہ ۱۸۶۷	بخشی کرشن دیال مالک غلام محی الدین اڈیٹر
	۲۴	مقصود الاخبار	گور کانو	سنہ ۱۸۶۸	قاضی قطب الدین احمد
	۲۵	ریاض الاخبار	خیر آباد	سنہ ۱۸۶۹	حضرت ریاض
	۲۶	مطلع نور	کانپور	سنہ ۱۸۶۹	منشی بہاری لال
دور سوم سنہ ۱۸۷۰ ع سے سنہ ۱۸۷۹ ع تک	۲۷	اخبار انجمن پنجاب	لاھور	سنہ ۱۸۷۰	
	۲۸	اخبار عام	لاھور	سنہ ۱۸۷۱	
	۲۹	نور الانوار	کانپور	سنہ ۱۸۷۱	
	۳۰	کوکب ھند	لکھنؤ	سنہ ۱۸۷۱	
	۳۱	نور افشاں	لدھیانہ	سنہ ۱۸۷۳	
	۳۲	ناصر الاخبار	دھلی	سنہ ۱۸۷۳	
	۳۳	آفتاب پنجاب	لاھور	سنہ ۱۸۷۳	دیوان بوٹا سنگھ مالک منشی فقیر محمد اڈیٹر
	۳۴	نصرت الاخبار	دھلی	سنہ ۱۸۷۳	مولوی نصرت علی
	۳۵	نصرت الاسلام	دھلی		مولوی نصرت علی
	۳۶	مرقع تہذیب	لکھنؤ	سنہ ۱۸۷۴	
	۳۷	مفید ھند	دھلی	سنہ ۱۸۷۵	منشی مہا نراین
	۳۸	خیر خواہ ھند	دھلی	سنہ ۱۸۷۵	منشی مہا نراین

تفصیل دور	شمار	نام اخبار	مقام اشاعت	تاریخ اجرا	اڈیٹر
	۳۹	مہر درخشاں	دہلی	سنہ ۱۸۷۵	؟
	۴۰	اخبار تمنائی	لکھنؤ	سنہ ۱۸۷۵	منشی پورن چند
	۴۱	جریدۂ روزگار	حیدرآباد دکن	سنہ ۱۸۷۵	
	۴۲	جام جمشید و بلند اختر	مراد آباد	سنہ ۱۸۷۶	سید جمشید علی
	۴۳	سفیر ہند	دہلی	سنہ ۱۸۷۶	منشی بلاقی داس
	۴۴	انوار الاخبار	لکھنؤ	سنہ ۱۸۷۶	محمد تیغ بہادر
	۴۵	اودھ پنچ	لکھنؤ	سنہ ۱۸۷۷	منشی سجاد حسین
	۴۶	قیصر الاخبار	الہ آباد	سنہ ۱۸۷۷	سراج الدین احمد خاں
	۴۷	نسیم آگرہ	آگرہ	سنہ ۱۸۷۸	بابوجمنا داس بسواس وکیل
	۴۸	نیر اعظم	مراد آباد	سنہ ۱۸۷۸	امجد علی نیر
	۴۹	مہر نیم روز	بجنور	سنہ ۱۸۷۹	
	۵۰	مشیر قیصر	لکھنؤ	سنہ ۱۸۷۹	منشی غلام محمد تپش
	۵۱	مظہر العجائب	مدراس	سنہ ۱۸۷۹	
	۵۲	ترجمان شرق	استنبول	سنہ ۱۸۷۸	
دور چہارم سنہ ۱۸۸۰ع سے سنہ ۱۸۸۴ع تک	۵۳	دہلی پنچ	لاہور	سنہ ۱۸۸۰	منشی نثار علی شہرت دہلوی
	۵۴	تجارت الاخبار	کلکتہ	سنہ ۱۸۸۰	
	۵۵	سفیر ہند	امرتسر	سنہ ۱۸۸۰	
	۵۶	خیر خواہ عالم		سنہ ۱۸۸۱	
	۵۷	ریختی اخبار	دہلی	سنہ ۱۸۸۱	منشی مہا نراین
	۵۸	بنارس گزٹ	بنارس	سنہ ۱۸۸۲	محمد حنیف منیجر
	۵۹	ریفارمر	لاہور	سنہ ۱۸۸۲	نتھو رام آنند

تفصیل دور	شمار	نام اخبار	مقام اشاعت	تاریخ اجرا	ایڈیٹر
	۶۰	شحنۂ ہند	میرٹھہ	سنہ ۱۸۸۳	مولانا شوکت حسین شوکت
	۶۱	اخبار النساء	دھلی	سنہ ۱۸۸۴	مولوی سید احمد
	۶۲	رفیق ہند	لاھور	سنہ ۱۸۸۴	منشی محرم علی چشتی

اردو اخباروں سے اقتباس پیش کرنے سے پہلے سراج الاخبار کو نبتاً دیدنا بہتر ہوگا کیونکہ پھر اردو صحیفوں کا سلسلہ پورا اور بلا مداخلت رہے گا، میں نے اس اخبار سے چند ایسے اقتباس چنے ھیں جو حضرت بہادر کی روزانہ زندگی اور شاھی اقتدار پر روشنی ڈالنے کے علاوہ ادب میں قلعہ کی کلچر اور زبان سے متعلق خبر دیتے ھیں - یہ اخبار اصل میں بادشاہ کا روز نامچہ تھا آخر میں خاص خاص خبریں بھی ھوتی تھیں جو عموماً دوسری سلطنتوں یا ریاستوں سے متعلق ھوتی تھیں، یا کبھی دھلی کی لوکل خبر موسم وغیرہ کی، یہ اخبار مطبع سلطانی میں "بہ اھتمام مصلح الدولہ سید ابوالقاسم خاں وقایع نگار و امداد علی بیگ خاں" ھفتہ وار چھپکر شایع ھوتا تھا، اس کی تین جلدیں سنہ ۱۸۴۱ ع اور سنہ ۴۳ ع اور سنہ ۴۴ ع کی میرے کتب خانے میں موجود ھیں - اس وقت میرے سامنے سراج الاخبار کی جلد اول نمبر ۳ کھلی ھے، عنوان ھے، 'سراج الاخبار' "روز جمعہ بست و چہارم جمادی الثانی سنہ ۱۲۵۷ ھ موافق سنہ ۴ جلوس معلے مطابق ۱۳ اگست سنہ ۱۸۴۱ ع" --

بہادر شاہ بغیر مُلک کے بادشاہ تھے لیکن لوگوں کے دلوں میں ان کی عزت اور اقتدار وھی تھا جو اُن کے بزرگوں کا رہ چکا تھا - اگرچہ

صرف قلعہ کی چار دیواری اور مختصر سے علاقہ خالصہ میں بادشاہ کی حکومت تھی شہر دھلی پرایست انڈیا کمپنی کا تسلط اور حکومت تھی - لیکن اس پر بھی شہر والے اپنی شکایتیں جو کمپنی کے افسروں کے خلاف ہوتیں بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا کرتے تھے - چنانچہ چوکیدارہ اور پولس کے خلاف شہر کی رعایا کی ایک عرضداشت گزرتی ہے —

''اشاعت متذکرہ صدر کی اصل عبارت یہ ہے پس از ادائے صلوۃ عصر از ڈیوڈھی خاص رونق افروز شدند ' راجہ جیسکھہ رائے و فخر الدولہ و احترام الدولہ و حکیم الممالک ' و رائے شادی رام و میر اشرف علی خاں خلف نجیب الدولہ و فوجدار خاں و مرزا راجہ بھولاناتھہ ' و موتمن الدولہ مرزا علی خاں عرض بیگی وغیرہ بہ تلثم عتبۂ فلک رتبہ پرداختند ' سواری مبارک درصحن دیوان خاص رسیدہ بود کہ انبوہ کثیر از رعایاء شہر و سکنائے صاحب باغ و دیگر املاک شاہی استغاثہ تعدی عملہ پولس در اخذ وجوہ چوکیدارہ مجوزہ حال کہ دو چند وسہ چاند از روے تعداد و نسبت معمول سابق بودہ نمودند و عرضداشتند کہ اکنوں رتبہ شدت بایں درجہ رسیدہ کہ اجناس و اثاث البیت بے اجازت مالکان خانہ گرفتہ می برند ؛ حضرت خدیو گیہاں از سماعت معروضات غریباں بہ سیف الدولہ مخاطب شدہ ارشاد فرمودند کہ از استبداد واصرار مجسٹریٹ بہادر بر تضعیف وجوہ چوکیدارہ واعتزار معظم الدولہ فرزند ارجمند اجلنٹ بہادر باوصف ادراک تکالیف رعایا ازیں تجویز ثابت می گردد کہ قانون نے تازہ دریں باب از صدر رسیدہ باشد '

زیرا کہ مجسٹریٹ بہادر بہ تعمیل احکام قانونی مامور است و
اجنٹ بہادر بحکم عدم مداخلت در امثال ایں امور مجبور
والحق بواسطہ بے اختیاری در اصلاح ایں مقدمہ ہر دو
معذور و بے قصور اندریں صورت شکایت گذاری ایشاں ناروا
بلکہ رجوع باھالیان صدر کے مخترع قوانین جامع النفع و
ناسخ آئین عامۃ الضرر اند مناسب و بجاست ... لازم کہ
بدو سہ کس ازایں مستغیثاں کہ بحلیہ فہم و فراست محلی
باشند بہ تشفی و دلاسا فہمانند کہ مرافعہ ایں مقدمہ بصدر
نمایند و از پیشگاہ والا ہم دریں باب شقہ خاص تفضل اختصاص
اسمی زبدۃ الامراء عالیشان عالیجاہ رفیع المکاں مقعہد سرانجام
مہمات سلطانی متکفل انصرام امورات جہانبانی ھنری طامس
کیمل رابرت سنہ لفتنٹ گورنر بہادر مستقرالخلافت اکبر آباد
صادر خواھد گردید ... ")

لفظ بہ لفظ ترجمہ محض طوالت ہے - اس اقتباس کا ملخص
یہ ہے کہ شہر وغیرہ کی رعایا کے نمایندوں نے یہ عرضداشت پیش کی کہ
رسوم چوکیدارہ پہلے سے دگنا تگنا کردی گئی ہیں - جو یہ رسوم ادا
نہیں کرسکتا پولس والے اس کے گھر کا مال اسباب زبردستی اٹھا لے جاتے
ہیں ایسا جبر اور ظلم جب سے شہر بسا ہے کبھی نہیں ہوا - اس عرضداشت
پر حضرت بہادر شاہ کا حکم نہایت مہتم بالشان ہے - فرمایا اس بارے
میں شہر کے میجسٹریٹ یا دھلی کے انگریزی رزیڈنٹ کو لکھنا فضول ہے
کیونکہ وہ صرف احکام صدر کی تعمیل کرنے والے ہیں ان لوگوں میں جو
سمجھہ بوجھہ والے ہیں ان کو سمجھادو کہ آگرہ جاکر محکمہ صدر میں

اپنی شکایت پیش کریں کیونکہ قانون اور حکم وهیں سے جاری هوتے هیں ان لوگوں کی اچھی تسلی کی جاے اور بتا یا جاے کہ اس بارے میں قلعہ سے بھی لفٹننٹ گورنر کو لکھا جاے گا ' کوئی اس حکم کو لطایف الحیل کہے یا مصلحت وقت پر مبنی - بہ هر حال خودداری کا اعلی ثبوت هے ' اس کے سوا بہادر شاہ کچھہ اور کر هی نہ سکتے تھے —

یہی اشاعت مظہر هے کہ :-

" روز شنبہ هیجدهم شهر گھڑی روز بر آمدہ حضرت شاهنشاہ در دیوان خاص بکرسی طلا کار رونق افزا شدند و امراے عظام و دیگر خدام ناصیہ سائی آستاں سپہر نشاں گشتند کپتان انجلو بہادر قلعدار معہ مصور سحر کار جادو نگار کہ شفت نام دارد بشرف مجرا رسید و مصور مذکور بہ تیاری شبیلہ اقدس مشغول گشت ")-

۱۹ ستمبر سنہ ۱۸۴۱ع کے اخبار سے پایا جاتا هے کہ مرزا غالب نے نو زائیدہ شہزادہ کا زایچہ ایک فارسی قطعہ میں نظم کرکے بادشاہ کی خدمت میں بھیجا تھا - جس کا ذکر اس طرح کیا گیا هے :-

" عرضداشت اسداللہ خاں غالب تخلص کہ زایچہ طالع نونہال حدیقہ اقبال را بہ نظم درآوردہ معرفت نوروز علی خاں فرستادہ و درآں داد سخنوری دادہ بود بہ نظر کرامت اثر گذشت و مورد تحسین گشت " —

اس سے ظاهر هوتا هے کہ اب تک غالب قلعہ کے دربار میں باریاب نہیں هوے تھے - یہ بھی ظاهر هوتا هے کہ ' ذوق ' کا خطاب ' سلطان الشعرا ' تھا نہ کہ ملک الشعرا - اور یہ کہ وہ ابھی تک ' خاقانی هند ' نہیں هوے تھے -

قطعہ میں جس کا ابھی ذکر ہوا چودہ شعر تھے - پہلا شعر یہ ہے :-

سپہر بارگہا فرقداں سریر شہا

طلوع کوکب مجد و علا مبارکباد (ردیف مبارکباد)

ظاہر ہوتا ہے کہ بادشاہ کبھی کبھی انگریزی دوائیں بھی استعمال کرتے تھے - ۱۹ شعبان سنہ ۱۲۵۷ھ کے اخبار میں ہے کہ :-

"بعد ازاں راجی سین بہادر کہ در زمانہ سابق سکرتر ایجنٹی خاص دارالخلافہ بودند و حالا بہ عہدہ کلکٹری و مجسٹریٹی علاقہ بہاول پور مامور اند بہ سعادت ملازمت رسیدہ اشرفی نذر گذرانیدند عرض حالات آب و ہوائے آں ضلع نمودند و بندگان اقدس برائے کدام دوائے انگریزی کہ مہیج اشتہا و مقوی اعضا باشد بہ موجب عرض سابق شاں ارشاد نمودند - معروض داشت کہ فردا از راس بہادر ڈاکٹر گرفتہ ابلاغ حضور فیض گنجور خواہم ساخت" -

اخبار نمبر ۱۲ جلد اول میں ہفتہ کے روزنامچہ میں درج ہے کہ بادشاہ نے اپنی غزل (بات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی) پر مصرع لگائے تھے - اسے "سلطان الشعرا شیخ محمد ابراهیم المتخلص بہ ذوق" نے پڑھ کر سنایا - اس سے اگلی اشاعت میں درج ہے کہ "شیخ محمد مشتاق حسین تخلص نے رباعی مرسلہ اسداللہ خاں غالب تخلص کہ شاعر نازک خیال است در شکریہ عطاے 'دال' کہ از پیشگاہ حضور انور شدہ بود بہ وسیلہ احترام الدولہ حکیم محمد احسن اللہ خاں بہادر بہ سمع ہمایوں رسانید"- یہ وهی رباعی ہے (بھیجی ہے جو مجکو شاہ جمجاہ نے دال) جو دیوان میں شامل ہے- یہاں بھی غالب کا نام بغیر کسی اعزازی لقب کے ہے-

مولوی ہی لکھہ دیا جاتا - ظاہر یہ ہوتا ہے کہ لفظ 'مرزا' قلعہ کی اصطلاح میں شہزادوں کے لئے خاص ہو چکا تھا اور مرزا غالب کا رسوخ قلعہ کے دربار میں ابھی بہت کم تھا —

۲ شوال سنہ ۱۲۵۷ھ کے سراج الاخبار میں ہے :-

" روز دو شنبہ بست و ہشتم رمضان المبارک چوں ہمگی ہمت والا نہمت حضرت قدر قدرت بہ خیرات مبرات مبذول است موافق معمول تقریب دیوالی برائے وزن جسم معظم و پیکر مطہر در تسبیح خانہ کہ میزان برپا کردہ بودند تشریف فرما شدہ بہ زر و نقرہ و دیگر فلذات وغلات ہندگانہ وزن فرمودہ بہ ارباب استحقاق عنایت فرمودند و لباس ملبوس بہ خاص تراشاں مرحمت گشت " —

خاص اشخاص کو بادشاہ خط نسخ کی تعلیم بھی دیتے اور اس فن میں شاگرد بناتے تھے اور شاعری میں بھی بادشاہ کے دربار میں غالب کی حاضری کم سے کم تین ہجری سالوں یعنی سنہ ۴۴-۴۳-۴۱ میں تو پائی نہیں جاتی لیکن رسل رسائل کی سبیل کا پتا چلتا ہے - ۵۵ال کی رباعی کا ذکر ابھی ہوا زانچہ والا قطعہ اس سے پہلے آ چکا تھا - اب غرہ ذیقعد سنہ ۱۲۵۷ کے اخبار میں لکھتے ہیں " اسد اللہ خاں غالب تخلص عبارت نثر را کہ حضرت نزد شاں ابلاغ داشتہ بودند در سلک نظم بطور مثنوی کشودہ بنابر ملاحظہ اقدس فرستادہ برائے خواندن بہ احترام الدولہ حکیم محمد احسن اللہ خاں بہادر فرماں شد حسب الحکم بہ سمع اقدس رسانید و مطبوع خاطر والا افتاد " —

اسی اشاعت میں بادشاہ کی ایک غزل مستزاد بہت نفیس درج

ہے جس کا مطلع ہے :-

جو عرش سے ہے فرش تلک آدمی میں ہے - دیکھہ آنکھہ کھول کر
کیا کیا نہیں ہے اس میں کہ سب کچھہ اسی میں ہے		پر چاھئے نظر

۲۲ ذیقعد سنہ ۱۲۵۷ کے سراج الاخبار سے واضح ہے کہ اس وقت سید الاخبار زندہ اور جاری تھا - بادشاہ برہمنوں کو بھی دان دیا کرتے تھے - چنانچہ ۱۰ محرم سنہ ۵۸ کے سراج الاخبار میں ہے کہ :

" عرضداشت برهمنے که به عنایت زنجیر فیل کامیاب گردیده بود مشعر طلب حصص* دیگر برهمناں که ملازم سلطانی اند به نظر انور گزشت ، حکم شد که این تصدق محض به ذات تو تعلق دارد دیگراں را دعوے شراکت نمی رسد " —

جون سنہ ۱۸۴۳ کے سراج الاخبار میں ایسٹ انڈیا کمپنی سے جو پنشن آتی تھی اس کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں :-

" به گوش حق نیوش رسید که پیشکش زر معمولی از خزانه انگریزی به خزانه عامره و نیز زر آمدنی کلید خانه همدست تاج محمد خاں سرچوکی دیوان خاص داخل شد " —

۵ جولائی سنہ ۱۸۴۳ کے اخبار میں " خبر لاهور " کے تحت درج ہے :-

" ... راجه دهیان سنگهه آزرده خاطر گشته معه اسباب و فوج خود به صوب جموں رخت کشید ، و مهاراجه شیر سنگهه بهادر از رفتن او بسیار کشیده خاطر گشت و بر سر محفل گفت که راجه دهیان سنگهه را تکبر بر فوج آراسته و تدبیر خود است مگر آں چناں سزاے این سرکشی به کنا رش خواهم نهاد که جمله متمرداں بر سر حساب خواهند آمد و جنرل و نتوره را

طلب نمودہ گفت کہ باچہار رجمت کار آزمودہ پیادگاں ودو
رجمت سواران جنگ دیدہ بر سرش شتافت ... ''

سراج الاخبار کی ان جلدوں سے جو میرے پاس ھیں یہ تو واضح ھوتا ھے کہ رزیڈنسی وغیرہ سے بادشاہ کی خدمت میں کبھی کبھی انگریزی میں بھی مراسلے جاتے تھے اور قلعہ سے ان کے جواب بھی انگریزی میں دیے جاتے تھے اور یہ کہ ایک انگریزی کا سکریٹری محض اس کام کے لئے تعین تھا جس کا نام بابو دلاور سنگھہ تھا لیکن کہیں یہ ذکر نہیں آیا کہ بادشاہ کو انگریزی کی شد بود تھی - مگر ۱۹ جولائی سنہ ۱۸۴۳ کے پرچے میں ھے :—

'' شقہ خاص ... کہ در خط و عبارت انگریزی بود بہ نظر قدسی آوردند ''

غالباً اس کی عرض دستخط کرنے یا مہر لگانے سے ھو گی —

۲ اگست کے اخبار میں '' مادرزن ایشان آیا ھے - خوشدامن چونکہ مہذب تھا استعمال نہ کیا - رزیڈنسی اور قلعہ کے درمیان بعض معاملے ایسے الجھے تھے کہ سلجھنے میں نہ آتے تھے - معلوم ھوتا ھے کہ بادشاہ تو اس سے بہت آزردہ رھتے تھے چنانچہ سنہ ۴۴ - ۴۳ ع میں مدتوں تک دربار موقوف رھا اور قلعہ سے باھر بھی شاذ ھی تشریف لے جاتے - اسی زمانے میں بادشاہ نے ایک انگریز سفیر الدولہ مشیر الملک مسٹر جارج طامس بہادر مصلح جنگ کو نوکر رکھا - اس نے انگریزی خواں سکرتری کی امداد سے تمام ضروری کاغذات اور عہد نامے وغیرہ انگریزی میں تیار کئے تجویز یہ تھی کہ وہ معہ مرزا محمد سلطان فتح الملک بہادر وغیرہ انگلستان جاکر ملکہ معظمہ کے دربار میں بادشاہ کے معاملات کی چارہ جوئی کریں - لیکن آخری خبر جو ھم تک پہنچی یہ ھے کہ واسرائے نے اس جوش و خروش

پر ٹھنڈا پانی ڈالدیا کہ مسٹر طامس انگریزی قوم اور رعایا سے ہے اس کا بادشاہ کی سفارت پر مامور ہو کر جانا نہیں ہو سکتا اور دوسرے یہ کہ مفت کی زیر باری ہوگی- سفیرالدولہ کی تنخواہ ایک ہزار روپیہ ماہانہ تھی-

سراج الاخبار کی ان تینوں جلدوں میں جن کا ذکر ابھی آیا ہے فارسی بہت پختہ اور تہنیت منشیانہ ہوتی تھی- لفاظی جو دربار کی شان تھی اس کے علاوہ اسلوب فصیح اور عبارت بلیغ ہوتی تھی - زبان کے قاعدے اور آیئن کی پابندی سخت تھی - یہ الفاظ اور مرکبات جو ان جلدوں میں سے اخذ کر کے ذیل میں لکھے جاتے ہیں غالباً دلچسپ ثابت ہونگے :-

ڈیوڑی معلے ' نواڑاہ ہاے ' ٹھیکہ داران ' دو گھڑی ' عملہ سرشتہ ایجنٹی چھٹی کمپ انگریزی ' یک ڈالی میوہ ہا ' برآمدۂ پیٹھک کلاں' نیلام ' کمشنری ' اپیلانٹاں ' اسپانڈنٹ ' چٹھی ' چٹھیات ' گن کوپ توڑا دار ' برسبیلی ڈاک ' رجسٹر ' رپورٹ ' کمیٹی ' مشایخان ' کانڈی نویس ' زربلی ' حوری لقا ' مادر زن ' (لباس) بہ حلق کشیدند (پھانسی دی) اہاے گورمینٹ ' چھاپہ خانہ ' فلات ھفتگانہ (سق نجا) وغیرہ وغیرہ —

یہ کہیں سے معلوم نہ ہوسکا کہ اس اخبار کی کیا قیمت تھی اور آیا یہ اور اخباروں کی طرح فروخت ہوتا تھا —

اردو اخباروں سے اقتباس

ابتدا سے سنہ ۱۸۵۹ ع تک

اردو اخبار | جلد ۱۹ - نمبر ۱۵ - مورخہ ۱۲ اپریل سنہ ۱۸۵۷ ع کی اشاعت میں درج ہے :—

" دھلی گزٹ کا ایک نامہ نگار کابل سے ۲۹ مارچ کو لکھتا ھے
کہ مختصر فوج جسے امیر دوست محمد خاں نے پیش بولاک
اور سرچھو خیل تیھلوں کی سر کوبی کے لئے روانہ کیا تھا
محمد شاہ خاں سے مقابلہ کے بعد ' جلال آباد واپس ھوگئی
ھے کثیر مال غنیمت امیر کے سپاھیوں کے ھاتھہ لگا ھے اور
خاندان مذکور کو اپنی جان بچا کر پہاڑی قلعوں میں جو لمغان
میں ھے جا چھپا ھے ... برادر میر داد خاں نے یہ بھی بیان
کیا کہ چند انگریزی اخبارات ھندوستان کے شایع شدہ امیر
کے سامنے پڑھے گئے جن میں گورنمنٹ کی بدنظمی پر تنقید
کی گئی تھی کہ وہ امیر کو خواہ مخواہ روپیہ دیتی ھے
حالانکہ وہ دو طرفہ تعلقات رکھتے ھیں - امیر نے یہ سن کر
کہا کہ جب گورنمنٹ پر کوئی مشکل آپڑتی ھے تو وہ لوگ لاکھوں
پونڈ صرف کر دیتے ھیں اور اب جب کہ ایرانی روسیوں کی
تحریک پر افغانستان پر چڑھائی کی تیاریاں کر رھے ھیں اور
محض گورنمنٹ ھذہ کو دق کرنے کی نیت رکھتے ھیں تو گورنر
جنرل نے عقلمندی اور دور اندیشی سے کام لے کر امیر کے عہد
و پیماں پر غور کیا ھے کہ وہ قائم رکھنے کے قابل ھے ... اور معتبر
خبر ملی ھے کہ سلطان جان نے کمانڈر انچیف افواج ایران
متعینہ ھرات سے گرشک پر فوج کشی کرنے کی درخواست کی
ھے اور کہا ھے کہ اھل گرشک نے اس شرط پر مدد دینی منظور
کی ھے کہ تین سال تک کا خراج ماف کر دیا جاے " —

صادق الاخبار | جلد ۲ نمبر ۱۱ مورخہ ۱۹ مارچ سنہ ۱۸۵۷ ع کی اشاعت
میں یہ اخبار لکھتا ھے :—

" اعلان شاہ ایران "

" اعلان شاہ ایران کی کئی کاپیاں گلیوں اور سڑکوں کے نکڑ پر چسپاں ھیں' میرے ایک دوست نے اس اعلان کی بعینہ ایک نقل کرلی ھے جو جامع مسجد کی پشت پر چسپاں ھے اس اعلان کو متعدد آدمیوں نے دیکھا ھے' مختصراً اس کا ماحصل یہ ھے کہ جولوگ مذھب حق کا دعوے کرتے ھیں ان کا فرض ھے کہ عیسائیوں کو مدد نہ دیں اور حق و راست پر ھونے کی وجہ سے مسلمانوں کی ترقی میں اپنی تمام طاقت صرف کردیں اور وہ وقت قریب آرھا ھے کہ جب کہ ما بدولت (شاہ ایران) تخت ھند پر متمکن ھوں گے اور رعایا کو اتنا ھی خوش حال بنا دیں گے جتنا کہ انگریزوں نے مفلوک الحال کرکے ذریعہ معاش سے محروم کردیا ھے' ھم کسی کے مذھب میں دخل نہیں دیا کرتے ھیں اور نہ وھاں دیں گے —

" یہ ھے اس اعلان کی رویداد' ایک شخص محمد صادق نامی جس کے ذریعہ سے یہ اعلان کیا گیا کہتا ھے کہ ۱۶ تاریخ تک ۹۰۰ ایرانی سپاھی مع چند معزز افسران کے ھندوستان میں داخل ھوچکے ھیں اور خاص دھلی میں ۵۰۰ سپاھی تبدیل لباس میں مختلف صورتوں میں موجود ھیں' وہ اپنی نسبت کہتا ھے کہ ۱۴ مارچ کو میں دھلی پہونچا' جہاں اعلان چسپاں کردے گئے ھیں"

اخبار مذکور کا حاشیہ اس اعلان اور محمد صادق کے بیان پر عجیب لیکن معنی خیز ھے' شروع میں یہ کہہ کر کہ " لوگ کہتے

ہیں یہ اعلان چند بے فکروں کا گھڑا ہوا ہے " صاحب صادق الاخبار اس طرح رقمطراز ہے :—

" ہندوستانی تو صرف اسی وقت خوش ہوں گے کہ اگر شاہ ایران عباس شاہ صفی کی طرح ہمارے خاص بادشاہ کو سلطنت دیدے اور تعجب بھی نہیں جو وہ ایسا کریں کیونکہ خود تیمور نے ایرانیوں کو سلطنت بخشی تھی اور نظر غائر تالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی احسان کے بدلے عباس شاہ صفی نے ہمارے ہمایوں کو مدد دی تھی " —

اگلی اشاعت مورخہ ۲۳ مارچ سنہ ۱۸۵۷ میں یہی اخبار محمد صادق کو جعلساز بتاتا ہے اور لکھتا ہے کہ اگر گورنمنٹ کے ہاتھ لگ جائے تو ایک دو تلے کا جوتہ سرکہ میں تر کیا ہوا اس کی تانت پر پڑے گا " - مگر صادق الاخبار کا یہ فرمانا اور سرکہ میں جوتا تر کرنے کا نسخہ تجویز کرنا اس مشورہ کے مقابلہ میں جو انہوں نے شاہ ایران کو حضرت بہادر شاہ کے ہاتھوں میں ہندوستان کی سلطنت بخشنے کے بارے میں دیا ہے کوئی وقعت نہیں رکھتا - 'غدر' کو ابھی قریباً تین مہینے ہیں اور دہلی میں یہ اشغلے اٹھائے جا رہے ہیں - پھر اگر ابست انڈیا کمپنی کے اہالیان بست و کشاد کو یہ شک ہوا کہ بہادر شاہ کمپنی کے خلاف ایران کے ساتھ سازش کر رہے تھے تو ذرا بھی تعجب کی بات نہیں - پہلے سنہ ۱۸۴۲ع میں دہلی کا رزیڈنٹ بادشاہ سے شکایت کر چکا تھا کہ وہ امیر دوست محمد خاں سے براہ راست خط کتابت کرتے ہیں جو نہیں ہونا چاہئے اب غدر سے دو تین مہینے پہلے یہ ایران کا قضیہ اٹھایا گیا - چنانچہ ایک شاہزادہ بنارس میں گرفتار بھی کیا گیا جس پر یہ الزام تھا کہ بادشاہ کا

مراسلہ لے کر ایران جا رہا تھا - اشتہار مذکور خواہ کسی کا طبعزاد ہو اخبار کی پہلی اشاعت کا نوٹ یقیناً نا مناسب اور فتنہ انگیز ہے —

' دہلی گزٹ ' پہلے انگریزی میں نکلتا تھا پھر اردو میں بھی ہوگیا کابل کے متعلق اس کے حوالے سے اردو اخبار کا اقتباس جو سب سے پہلے پیش ہوا ہے وہ بھی سادگی سے خالی ہے - شکایت ہوئی ہے کہ اس ابتدائی زمانے میں ان انگریزی اخباروں کی تنقید جو یورپین ہی نکالتے تھے اور معاملات خارجیہ میں جارحانہ نکتہ چینی پریس کے ان قوانین کا باعث ہوئی جو سرکار وقت کو اس زمانے میں نافذ کرنے پڑے —

فوائد الناظرین | جلد چہارم - نمبر ۲ - مورخہ ۲۲ جنوری سنہ ۱۸۴۹ ع سے یہ اقتباس لیے جاتے ہیں —

" خبر ملتان "

" ۱۱ تاریخ تک کے خطوط صاحب دہلی گزٹ پاس آئے ان سے کوئی بات تازہ نہ معلوم ہوئی فوج سرکاری شہر ملتان کا قبضہ اور محاصرہ قلعہ کا کئے پڑی ہوی ہے شب و روز توپخانہ آتش بار جاری رہتا ہے اور صاحبان حرب و پیکار تجویز واسطے قبضہ کرلینے قلعہ کے کر رہے ہیں " —

" خبر خاص دہلی "

" گیارھویں تاریخ جنوری سنہ ۱۸۴۹ ع کو شاہزادہ دارا بخت بہادر ولیعہد سلطنت ہند نے اس جہان ناپایدار سے طرف عالم بقا کے نقارۂ کوچ بجایا اور چراغ دہلی میں دفن کیے گئے -

۵ فروری سنہ ۱۸۴۹ ع کی اشاعت میں یہ اخبار پچھلے سال یعنی ۱۸۴۸ ع کے واقعات دینا ہر مہینے کے عنوان کے تحت بہ قید تاریخ دیتا

ہے جن میں سے چند واقعات یہاں نقل کیے جاتے ہیں جو دلچسپی سے خالی نہیں : —

"مارچ"

" پانچویں تاریخ کو بابو بھولا ناتھہ اور گوپال چندر شہر لندن سے بعد حصول علم طب کے ہندوستان میں داخل ہوئے" -

" ۱۸ تاریخ تمام ولایت فرنگ میں شورش واسطے ریاست جمہوری کے اتھی اور چند شاہان اس دیار کے اپنی اپنی سلطنت کو استعفا دے کر بھاگ گئے" —

"مئی"

" ۲۵ تاریخ کو جنرل ونچورا صاحب کو جو کہ مہاراجہ لاہور کا نوکر تھا حکم ہوا کہ یہاں سے ولایت کو چلا جائے" —

"اکتوبر"

" ۹ تاریخ کو دنیا کے باشندوں اور طالب علموں نے سرکشی کی اور وہاں کا شہنشاہ معہ اپنے خاندان کے فراری ہوا" —

اسی اشاعت میں فرا سو صاحب کی ایک اردو غزل بھی درج ہے جس کا مطلع ہے —

جو معرکہ الفت میں تری ہم سے نہ ہوگا
ہے ہم کو یقیں وہ کبھی عالم سے نہ ہوگا

یہ بھی اعلان کیا گیا ہے کہ پنڈت دھرم نارائن جنھوں نے 'قران السعدین' نکالا تھا 'مالوہ اخبار' نکالنے والے ہیں جس میں ایک طرف اردو اور ایک طرف ناگری ہوا کرے گی —

" ۲ اپریل کے اخبار میں قلعہ معلی کی خبر لکھتے ہیں کہ "حضور

والا نے 'زبدۃ الاخبار آگرہ اور 'اردو اخبار' دھلی کو ملاحظہ
کیا اور اس میں جو شرایط درباب اضافہ کی تھیں ان کو پسند
فرمایا اور اصلی شرایط کو اپنے 'سراج الاخبار' میں چھپوا دیا "-

یہ شرایط بادشاہ کے مالی معاملات کی اصلاح کی تجویزیں تھیں -

۹ جولائی کی اشاعت دھلی سے ایک اور اخبار مسمول 'ضیاء الاخبار'
کے جاری ھونے کا اعلان کرتی ھے - جس کے مہتمم شیخ محمد ضیاء الدین دھلوی تھے -

۳ ستمبر کے اخبار میں یہ مندرجات اھم ھیں: —

ا - شبیہ و حالات ولیم شیکسپیر -

۲ - پنج آھنگ یعنی مجموعہ نثر غالب کا اشتہار - یہ کتاب کلیم
غلام نجف خاں نے اپنی نگرانی میں قلعہ کے مطابع سلطانی میں چھپوائی تھی -
۳۹۳ صفحے تھے اور قیمت چار روپیہ مقرر تھی —

ایک اور بات نوٹ کے قابل یہ ھے کہ فواید الناظرین کی اس جلد
(سنہ ۱۸۴۹ ع) میں اردو - فارسی اور انگریزی کے تیئیس اخباروں کے
حوالے موقع بہ موقع آے ھیں: —

[1]تعلیم الخلایق - [2]آفتاب عالمتاب مدراس - [3]دھلی گزٹ - [4]مجمع الاخبار
[5]مالوہ اخبار اندور - [6]الحقایق - [7]نزھت الاخبار - [8]زبدۃ الاخبار آگرہ - [9]قران
السعدین دھلی - [10]اردو اخبار - [11]نزھت الارواح - [12]انگلش مین - [13]دھلی اخبار -
[14]ضیاء الاخبار دھلی - [15]لٹریری گزٹ - [16]پیپل جرنل - [17]خیر خواہ ھند - [18]اخبار ھرکارہ -
[19]جام جمشید - [20]اعظم الاخبار [21]فواید الشایقین - اور - [22]سید الاخبار --

کوہ نور

اب تاریخی ترتیب کی رو سے کوہ نور ھمارے سامنے آتا ھے - اس
کا ضروری تذکرہ آگے ھوچکا ھے — ۲۱ ستمبر سنہ ۱۸۵۷ ع کو
کوہ نور کی معمولی اشاعت کا دن نہ تھا اس لئے اس تاریخ کو اس کا

ایک " پرچہ زاید " شائع ہوا جس پر ضمیمہ نمبر ۳۹ درج ہے اور علوان جلی ہے: "مژدۂ فتح دھلی " - یہ ایک نہایت اہم تاریخی مقالہ ہے جس سے طویل اقتباس بیجا نہ ہوگا - یہ اصل پرچہ زاید ملنجملہ دوسرے اخباروں کی اہم اشاعتوں کے میں ساتھہ لیتا آیا ہوں جو بعد میں ملاحظہ کرائی جائیں گی اب وہ اقتباس ملاحظہ ہو: —

" ...... صاحب ایجوٹنٹ جنرل فوج ظفر موج مقام دھلی نے کل کی تاریخ ۹ بجے صبح کے بذریعہ تار برتی اول مرتبہ تو یہ تحریر فرمایا کہ مورچہ برجی پر دلیران انگریزی نے کل شام کو حملہ کرکے ۹ ضرب توپ اور ایک توپ بم بلا کسی نقصان کے اپنے قبضہ میں کرلیں اور آج صبح کو لاھوری دروازہ قبضہ میں آگیا - اجمیری دروازہ اور مورچال بیرونی سے اب گولہ نہیں چلتا مفسدین ان جملہ مقامات کو چھوڑ کر بھاگ گئے اور سپاہ گان سرکاری قبضہ کرنے کے واسطے چلے جاتے ھیں ...... اور مفسدین نے آج صبح کو اپنے کمپ کا میگزین بھی اُڑا دیا آمد و رفت ہماری آج چاندنی چوک تک جاری ہو جاے گی ...... اور شاہ دھلی اور اس کے خاندان کا کچھہ پتہ نہیں —

" پھر ۱۰ بجے صبح کے صاحب موصوف نے یہ خبر بھیجی کہ اجمیری دروازہ اور دیگر مورچال پر قبضہ سرکار کا ہوگیا... ... اور لال محل [لال قلعہ] میں داخل ہونے کی تیاری ہے- پھر دوپہر کے وقت صاحب موصوف نے یہ مژدہ دیا کہ لال محل جامع مسجد و اجمیری دروازہ پر سرکار کا تسلط ہوگیا - بعد

اُس کے دو بجے دن کے یہ خبر آئی کہ سلیم گڈہ و پل پر
سرکار کا قبضہ ہوگیا تھوڑے عرصہ میں دروازہ ترکمان تک کل
شہر دھلی و دیگر مور چال پر تسلط کامل ہو جائے گا —

"پھر ۵ بجے شام کے یہ خوش خبری آئی کہ معرکہ دھلی کا
تمام ہوا تمام شہر دھلی اور محل بادشاھی اور سلیم گڈہ
اور پل وغیرہ پر شجاعان سرکار کا بالکل تسلط ہوگیا ...... سنا
جاتا ھے کہ شاہ دھلی معہ عیال و اطفال ایک گانو میں جو
شہر سے قطب صاحب کی سمت چار میل کے فاصلہ پر واقع ھے
چلے گئے ھیں" —

"مطبع کوہ نور لاھور محلہ یکی دروازہ حویلی منشی ھرسکھہ رائے
پروپرایٹر میں باھتمام منشی نول کشور منیجر و غلام محمد پرنٹر
و علی بخش پبلشر کے چھپا" —

اس سے یہ واضح ہوا کہ منشی نول کشور جنھوں نے بعد میں لکھنو میں اپنا نامی گرامی مطبع اور اودہ اخبار جاری کیا سنہ ۱۸۵۷ میں یہاں لاھور میں مطبع کوہ نور کے منیجر تھے - کوہ نور کی ابتدائی جلدیں میرے قبضے میں نہ آ سکیں - سنا کہ منشی محبوب عالم صاحب مرحوم کے ھاں کچھہ پرانی جلدیں ھیں ان کے کتب خانہ کی آتش زدگی کا حادثہ ہوچکا تھا اور وہ کوہ نور کی سنہ ۱۸۵۱ ع کی جلد میرے معزز دوست رائے بہادر پنڈت شیو نراین صاحب کو مستعار دے چکے مگر مجھہ کو ان سے یہ استفادہ میسر نہ آیا - رائے صاحب موصوف نے اس جلد سے مستفید ہو کر ایک مہتم بالشان لکچر لاھور کی پنجاب ھسٹاریکل سوسائٹی میں "کوہ نور آف سنہ ۱۸۵۱ ع" کے عنوان سے دیا جو اس کے جرنل جلد ۴ نمبر ۱ - سنہ ۱۹۱۶ع

میں طبع ہوا ہے - (اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوہ نور کی جلد سنہ ۱۸۵۱ع میں مندرجہ ذیل اخباروں کے نام حوالہ کی طور پر آے ہیں: —

کلکتہ
۱ - اخبار ہرکارہ
۲ - مراۃ الاخبار
۳ - مراۃ الخیال
۴ - انجمن آرا

بمبئی - ۵ - مجمع الاخبار

دہلی
۶ - اُردو اخبار
۷ - قران السعدین
۸ - عمدۃ الاخبار
۹ - دہلی گزٹ

آگرہ -
۱۰ - اخبار الحقایق
۱۱ - زبدۃ الاخبار

میرٹھہ - ۱۲ - جام جہاں نما

بنارس -
۱۳ - باغ و بہار
۱۴ - بنارس گزٹ

بریلی - ۱۵ - عمدۃ الاخبار

سیال کوٹ - ۱۶ - ریاض الاخبار

لاہور - ۱۷ - دریاے نور

شملہ - ۱۸ - شملہ اخبار -

۱۲ - جنوری سنہ ۱۸۵۸ ع کا کوہ نور غدر کے بعد شاہ دہلی کے معاملہ پر بہت روشنی ڈالتا ہے - وہ لکھتا ہے: —

"اب ہم انتخاب ایک چٹھی کا جو دہلی سے ہمارے پاس پہنچی ہے اور اس میں مفصل حال شاہ دہلی کا کسی صاحب نے بہ چشم خود دیکھہ کر لکھا ہے درج ذیل کرتے ہیں ہم کو راقم چٹھی کی تحریر پر اعتماد کامل ہے- صاحب چٹھی لکھتے ہیں کہ چند دن گزرے کہ میں ہمراہ چند دوستوں کے شاہ دہلی اور ان کی بیگم صاحبہ کی ملاقات کو گیا تھا - شاہزادہ نے دیکھتے ہی مجھہ کو پہچان لیا اور اپنی والدہ کے پاس اطلاع کرنے کو گیا اور تھوڑی دیر کے بعد پیغام لایا کہ بیگم صاحبہ میرے دیکھنے کی مشتاق ہے- میں نے اپنے دوستوں اور ہمراہیوں سے اجازت اندر جانے کی لی اور ان سے میں نے کہہ دیا کہ بیگم صاحبہ مجھہ کو آگے ہی سے جانتی ہے اس واسطے مجھہ کو بلایا ہے - پہلے کمرہ میں بادشاہ سلامت سوتے تھے - پہلے کمرہ سے گزر کر دوسرے میں جہاں بیگم صاحبہ ایک کھڑکی کے متصل جس پر پردہ پڑا تھا پلنگ پر پروں کا تکیہ رکھے ہوے بیٹھی تھی چوں اس کمرہ میں ادھر ادھر گروہ کثیر عورات حرم کا موجود تھا میں نے بیگم صاحبہ کو نہیں پہچانا پر انہوں نے دیکھتے ہی مجھہ کو بلا لیا اور اپنے پاس بٹھلایا" —

اوپر کی تحریر ترجمہ ہے جو کوہ نور نے لاہور کے انگریزی اخبار پنجاب کرانیکل مطبوعہ ۲ - جنوری سنہ ۱۸۵۸ سے کیا- جو کوایف اس تحریر سے معلوم ہوے وہ کچھہ عجیب ہیں- یہ بیگم صاحبہ ملکہ زمانی زینت محل ہی ہوسکتی ہیں کیونکہ وہی بادشاہ کی خدمت میں رنگون میں آخر دم تک رہیں. ملاقات کرنے والے کون صاحب ہیں اس کا پتا نہیں چلتا - یہ ملاقات اس

طرح کی ٹھہرتی ہے جس طرح ایک یورپین جنٹلمین ایک یورپین خاتون سے کرتا ہے - اس پر زیادہ وقت دینا فضول ہے —

معلوم ہوتا ہے کہ منشی نول کشور غدر کے خاتمہ کے بعد کوہ نور اور لاہور سے چلے گئے کیونکہ اشاعت مذکورہ کے اختتام پر پنڈت سورج بھان کا نام منیجر کی جگہ درج ہے اور یہ نام آیندہ مدت تک اسی حیثیت میں چلتا رہا —

۱۹ جنوری سنہ ۱۸۵۸ع کا کوہ نور امرتسر کی یہ خبر لکھتا ہے :-

" ایک دوست کی تحریر سے معلوم ہوا کہ بحصول اجازت حکام واسطے خرید نیلام اسباب لوٹ کے چند دولت مند امرتسر سے دھلی گئے ہیں "-

۲۶ جنوری سنہ ۱۸۵۸ع کا اخبار مظہر ہے :-

" دھلی - خط مورخہ ۱۷ جنوری سے مفہوم ہوا کہ مسٹر سی تی لباس صاحب نے دھلی میں پہنچ کر چارج عہدہ جج کا لے لیا دوکانداروں وغیرہ کے نام پروانہ جاری کئے جاتے ہیں کہ وے شہر میں آکر سکونت اختیار کریں جس شخص کو شہر میں رہنے کی اجازت ملے گی بعوض کچھہ روپیہ کے ایک ٹکٹ ملے گا اور اگر کسی شخص کے پاس سے چار دن کے بعد ٹکٹ نہ نکلے گا تو وہ شہر سے خارج کیا جاے گا "-

اسی اشاعت میں یہ بھی خبر درج ہے :-

" اخبار لاہور کرانیکل مطبوعہ ۲۳ جنوری سنہ ۱۸۵۸ع سے دریافت ہوا کہ شاہ دھلی بہ نسبت سابق صحت رکھتے ہیں اور منگل گذشتہ یعنی ۱۹ تاریخ کو ان کی تحقیقات شروع ہوگئی ہوگی "-

(۲۳ فروری سنه ۵۸ کی اشاعت سے ایک خط اور ایک غزل نقل کی جاتی ہے جو دلچسپی سے خالی نہیں - خط فارسی میں ہے اور غزل اردو کی - جو اس زمانے کی شاعری کا عمدہ نمونہ ہے - لکھتے ہیں :-

" جناب مخدوم و مکرم قدردان والا شان جناب منشی صاحب دام اقبالہم بعد از جبیں سائی بزمین ارادت و ناصیہ فرسائی بلوح افادت مشہود ضمیر نوازش تخمیر آں کہ امروز حسب عادت قلم بر داشتہ یادہ درائی نمودہ ام و بتقریب میلہ چراغاں اکثر احبا از نواح قدم پر چشم خواہند نہاد اگر مہربانی کردہ آں خزف ریزہ چند را از اندراج اخبار پر بہار رشک در شاہوار فرمایند بعید از بندہ نوازی نخواہد بود - زیادہ تا زندگی بندگی) -

" نور احمد چشتی لاہوری عفی عنہ "-

" غزل "

وہ جو پہلو سے اٹھے درد دل ایسا اٹھا
ضبط کی تاب نہ باقی رہی چلا اٹھا
حالت عشق مری دیکھہ کے وہ ہنستا تھا
کیوں رے ہاں اب تو بتا شور یہ کیسا اٹھا
صاحبو میکشی کا دور کرو جلد شروع
ماہ نو دیکھا جو ابرو سے اشارہ اٹھا
مُوسا لاغر تھا میں اور لوگ مجھے ہنستے تھے
لن ترانی ہوئی موقوف جو پردا اٹھا
جس گھڑی یار کے کوچے سے نکالا مجکو

راہ میں ضعف سے سو بار میں بیٹھا اٹھا
اس کی الفت سے بھلا فایدہ کیا نکلا ہے
نام بد نام ہوا مفت میں پیسا اٹھا
عشق کے رمز و کنایہ کی سمجھہ میں یارو
مجنوں مشہور تھا پر 'چشتی' بھی ویسا اٹھا "

۹ مارچ سنہ ۱۸۵۸ع کی اشاعت میں دھلی کے پھر آباد ہونے کی خبر اس طرح دی گئی ہے :-

" کارسپانڈنٹ دھلی نے خط مورخہ یکم مارچ میں یہ لکھا کہ شہر دھلی میں اھل ھنود بستے جاتے ھیں اور خال خال مسلمان بھی آباد ھوے ھیں جن کی نسبت احکام خاص ھوے ھیں - چاندنی چوک اور دریبہ میں کچھہ رونق ھوگئی ہے شہر میں تھانجات بھی بجز کوتوالی ابھی قایم نہیں ھوے بلکہ تمام شہر میں ابھی چوکیدار بھی مقرر نہیں ھوے مگر تھانجات بیرونی قایم ھوگئے ھیں باغ شاھی واقعہ چاندنی چوک کی تیاری بنام نہاد باغ کمپنی ھوتی ہے ... بادشاہ کی نسبت ابھی حکم اخیر نہیں ھوا مقدمہ زیر تجویز ہے شہر کے اندر آمد و رفت ساکنان دھلی کی بلا حصول پاس حاکم کے نہیں ھوتی ... کہتے ھیں شہر کے اندر باون سڑکیں نکلیں گی اور فصیل شہر منہدم ھوتی :-

اس سال خطوط علم اور ذکر علم وھنر ان عنوانوں پر مہینوں مضامین نکلتے رہے —

۱۳ اپریل ۵۸ع کا اخبار یہ خبر دیتا ہے لکھنؤ میں یہ اشتہار جاری ھوا

ہے کہ جولوگ باہر چلے گئے ہیں تین دن کے اندر واپس آکر اپنے گھروں میں آباد ہو جائیں اور دکانیں کھول لیں ورنہ باغی تصور کئے جائیں گے اور ان کے گھر اور دکانیں لوٹ لی جائیں گی —

ہمائے بہا | چشمۂ فیض لاہور سے نکلتا تھا - یہ پندرہ روزہ تھا - مندرجات کے اعتبار سے اس کو رسالہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا 'فوائد الناظرین' کی طرح اس میں علم و ہنر سے متعلق ہی مضامین اور ترجمے ہوتے تھے - ان کے سوا سرکاری سرکلرں اور حکموں کے اعلان وغیرہ - نمونہ ملاحظہ ہو —

" کیفیت مقناطیس "

" ہزار شکر و احسان خالق ہے کہ جلے اپنی قدرت کاملہ سے اس زمین کو نعمائے گوناگوں سے ہم لوگوں کی پرورش و آسایش کے واسطے مرتب کیا یہ زمین اندر باہر سے بے انتہا نعموں سے معمور ہے جتنا ہم غور کریں اتنا ہی کرشمہ نظر آتا ہے دیکھئے اس مٹی کو جسے ایک ادنیٰ ترین سمجھتے ہیں کیا کیا جوہر ملے ہوے ہیں ہر ایک ذرہ سے اسی نور کا ظہور ہے چشم بینا چاہئے ورنہ جاہل کی نظر میں جوہر و کنکر ایک برابر ہے "-

(اشاعت ۲۸ فروری سنہ ۱۸۵۸ع) پھر مقناطیس کی کہانی شروع ہوتی ہے - اسی اشاعت میں ڈاک بجلی یعنی تیلگراف - سیر کرۂ زمین - وسعت عالم - سمندر میں لوہے اور پتھر کا ترنا - 'باکو کا آتش فشاں پہاڑ وغیرہ مضامین ہیں - (مژدہ فتح راحت کدہ بہ تفصیل تمام" جو اسی اشاعت کو رونق دے رہا ہے زبان کے لحاظ سے دلچسپ ہے - فرماتے ہیں :-

" واضح ہو کہ فاضل محمد خاں نامی جاگیردار ریاست بھوپال

نے راہ بغاوت اختیار کیا تھا اور بہ تلبیس ابلیس خبیث
باتفاق اور اخوان الشیاطین کے قلعہ راحت گڈہ کو ملجا و
ماوا بنایا تھا - ۲۵ تاریخ ماہ حال کو فوج ہندوستان قلبی
زیر حکم میجر جنرل سر ہیوروز صاحب بہادر کے راحت گڈہ پر
پہنچی کنارۂ جو پر جو محاذی قلعہ مذکور واقع ہے کچھہ مفسد
نظر آے فوج سرکاری نے تاخت کی باقی پیٹھہ دکھا کر قلعہ
میں گھس گئے افسران فوج انگریزی تدابیر محاصرہ میں مصروف
ہوے اور اتواپ قلعہ شکن نصب کر کر قلعہ پر گولہ اندازی
شروع کی ۲۸ ویں تاریخ کو دیوار توڑ ڈالی اور حملہ کی
تیاری ہوئی مفسد خوف جان سے سیاہی شب میں فرار کر گئے
بہت سے ماخوذ بھی ہوے - فاضل محمد خاں موجد فساد اور
کامدار خاں پنڈارہ بھی گرفتارین سے تھے دروازہ قلعہ پر براہ
پھانسی رہ سپر فنا ہوے کار بد کردہ را جزا ایں است ") -

اس کے ساتھہ اردو اخباروں کا پہلا دور ختم ہوتا ہے - اس دور کے خصوصیات حسب ذیل قرار دیے جاسکتے ہیں :-

۱ - سنہ ۱۸۵۷ ع کے ہنگامہ سے قبل سیاسی اور امور خارجیہ میں اردو پریس نسبتاً بہت دلچسپی لیتا تھا لیکن اس شورش کے بعد اس کا لب و لہجہ بہت نرم اور مصلحت وقت کے تابع ہوگیا —

۲ - فوایدالناظرین ابتدا سے مگر دوسرے اخبار سنہ ۱۸۵۸ سے مغربی علوم و فنون کی اشاعت میں سر گرم ہوگئے —

۳ - اردو کی غزلیں کبھی کبھی ہر اخبار میں شایع ہوا کرتیں اور شعرا اخبار میں اپنے کلام کی اشاعت پر ناز کرتے —

۴ - اب تک اردو اخباروں میں اشتہاروں کا وجود نہ تھا - اخبار یا مطبع والے جو کتاب نکالتے اسی کا اشتہار چھپتا - جیسے کہ نور کی جنتری-

۵ - اس عہد کی زبان اگرچہ باغ و بہار کی زبان نہ تھی لیکن قدامت کے نقش سے معرا نہ تھی - فارسی انشا کا تتبع حاوی تھا مثلاً صفت اور مضاف کو موصوف اور مضاف الیہ سے پہلے لانا - یہ جوڑ کبھی دونوں فارسی ہوتے اور کبھی ایک فارسی اور ایک اردو یعنی ہندی - یہی مسلوک واؤ عطف کے ساتھہ ہوتا - علم معانی کی کتابیں جو اس زمانے کے بہت پہلے سے متداول نہیں ان انشاپردازوں کے ذہن پر حاوی نہ تھیں - ایسی ترکیبیں اکثر دیکھنے میں آئیں مثلاً : راقم چٹھی - صاحب چٹھی - انتخاب ایک چٹھی کا - اجازت اندر جانے کی لی - بیگم صاحبہ بیٹھی تھی - چوں (بجاے چونکہ) - بہ حصول اجازت حکام واسطے خرید نیلام اسباب لوٹ کے - چارج عہدۂ جج کا تھا - وے (وہ کی جمع) - بہ نسبت سابق صحت رکھتے ہیں - کارسپانڈنٹ (بجاے نامہ نگار) - بلا حصول پاس حاکم کے - جوہر و کنکر - وغیرہ وغیرہ —

۶ - املا کی بابت یہ باتیں نوٹ کے قابل ہیں :-

(۱) فقروں اور جملوں کو کسی قسم کے وقفوں کے نشانات سے جدا نہیں کرتے تھے - عبارت کو پیراگرافوں میں ضرور تقسیم کر دیتے تھے —

(۲) الف مضموم کے بعد واو لکھنے کا رواج عام تھا جو بعد میں مدت تک جاری رہا —

(۳) 'چھوڑ کر' اور 'چڑہ آے' جیسے الفاظ میں وہ 'ڑ' کی جگہ 'ڈ' لکھتے تھے --

(۴) 'مجھکو' بغیر ہاے ہوز کے 'مجکو' لکھتے اور مستر میں 'ٹ' کی
جگہ 'ت' استعمال کرتے —
(۵) انگریزی املا کی صحت اس قدر مد نظر تھی کہ سپٹمبر اور ڈسمبر ہی
لکھتے - اب کی طرح ستمبر اور دسمبر نہیں -
(۶) بمبئی میں 'م' کی جگہ 'ن' لکھتے جیسے ہم اب تک 'سلمہا للہ'
میں لکھتے ہیں —
(۷) 'جس' پر 'کبھہ کر' وغیرہ ملا کر لکھتے 'یہی سلوک فارسی کے
لواحق و روابط سے ہوتا —
(۸) 'میں نے' کو صرف ایک 'نون' کے ساتھہ ملا کر لکھہ دیتے —
(۹) الف ممدودہ پر علامت مد ضرور ہوا کرتی لیکن ہاے ہوز کو اگر
کبھی دوچشمی شکل دیتے تو اس مقام پر جہاں وہ مخلوط التلفظ
نہ ہوتی - یاے معروف و مجہول کے امتیاز کا تو ذکر ہی کیا —

املا کے بارے میں زیادہ کہنا بے سود ہے کیونکہ صوبہ آگرہ اور
پنجاب دونوں صوبوں میں املا کے قاعدے بہت بعد میں مدون ہوے -
لاہور کے گورنمنٹ بک ڈپو کے ابتدائی زمانے کی کتابوں میں املا کا طریق
خاص مدت تک وہی رہا جو قدیم سے چلا آرہا تھا - انشا میں آج کل
کی طرح عربیت حاوی نہ تھی بلکہ فارسی کی آمیزش زیادہ تھی لیکن
ایسی کہ اس کو گلستاں بوستاں پڑھا ہوا اچھی طرح سمجھہ سکتا تھا -
مدعا نگاری اس زمانے کی صحافت کی بہر حال تعریف کے قابل ہے -
وہ لوگ اپنا مطلب خوبی سے ادا کر سکتے تھے —

سنہ ۱۸۶۰ ع سے سنہ ۱۸۶۹ ع تک

اب ہم اس زمانے میں پہنچتے ہیں جو اردو صحافت کی نقرئی

جوبلی کا زمانہ ہے یعنی اس کی عمر کم و بیش پچیس برس کی ہو چکی ہے - اب سنہ ۱۸۵۸ کی افرانفری اور بے اطمینانی دور ہو چکی ہے - انگریزی حکومت ملکہ وکٹوریہ کے زیر نگیں مستقل اور بر قرار ہو چکی ہے - اب حاکم و محکوم میں وہ مغایرانہ انداز اور معاندانہ ادا نہیں رهی جو سنہ ۵۷ سے پہلے تھی —

کوہ نور

۳ جنوری سنہ ۱۸۹۰ ع کے پرچہ میں ایک قطعہ تاریخ کا عنوان نہایت دلچسپ ہے لکھتے ہیں :-

" قطعات تاریخ شوالہ و سرائے و تالاب تعمیر کردہ لالہ رتن چند 'ریش دراز' واقعہ بیرون شاہ عالم دروازہ شہر لاہور " —

یہ چیزیں اب بھی موجود ہیں اور ان کے موجودہ قابض دیوان کشن کشور صاحب 'ڈاڑھیوالا' لکھے جاتے ہیں جس طرح ان کے مورث اعلی دیوان کرم چند مہاراجہ رنجیت سنگھہ کے دربار سے 'ڈاڑھیوالا' کے لقب سے ممتاز تھے - لیکن کوہ نور کے صاحب تحریر نے اس کا فارسی میں ترجمہ کر دیا —

یہی اشاعت صفحہ ۱۴ پر خبر دیتی ہے :-

" کمر شل گزٹ الہ آباد سے دریافت ہوا کہ دفتر صدر دیوانی آگرہ کی نسبت حکم ہوا ہے کہ ۱۵ جنوری سنہ ۶۰ کو الہ آباد میں جاری ہو مدت ہوئی تین سپاهی رجمنٹ ۵۳ شاهی کے بیچ علت نکالنے چار ہزار روپیہ کے خزانہ الہ آباد سے گرفتار ہوئے تھے ان کا مقدمہ سوپریم کورٹ کلکتہ میں پیش تھا اب حکم آیا ہے کہ ایک سپاهی ۶ برس اور دو سپاهی چار چار برس کو قید کئے جائیں " —

۱۰ جنوری کا اخبار خبر دیتا ہے :-

"تیاری جناب نواب لفٹنٹ گورنر بہادر کے استقبال جناب نواب معلی القاب امیر کبیر گورنر جنرل کے واسطے ہو رہی ہے بیاس تک تشریف لے جانے کی خبر ہے 'شعلہ مار' باغ کی آراستگی خوب ہو رہی ہے" —

۲۱ جنوری کا پرچہ ایک عجیب خبر دیتا ہے :-

"اودھ اخبار سے معلوم ہوا کہ صاحب والا شان چیف کمشنر اودھ کو علاقہ اودھ میں رواج زبان انگریزی کا عموماً بہت جلد منظور ہے' اور باجراء حکم محکم تحصیلداران و سرشتہ داران کو مجبور کیا ہے کہ در صورت نہ دینے امتحان زبان انگریزی کے شروع سنہ ۱۸۶۱ سے وے لوگ برخاست ہو جائیں گے .. ہم یہ بھی سنتے ہیں کہ عنقریب یہ حکم پنجاب بھی میں بھی نافذ ہونے والا ہے اور غالب ہے کہ یہاں نیچے کے عہدہ داروں کو تاکید سیکھنے تحریر زبان اردو کی حروف انگریزی میں ہوگی اور عرایض مستغیثان بھی اسی تحریر میں داخل ہوا کریں گی" —

۲۵ فروری سنہ ۶۰ کے پرچے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مہینے میں کرانچی سے سکندریہ تک بحری تار برقی کا اجرا ہوا —

۱۳ مارچ کا اخبار مخبر ہے کہ :-

"دھلی ایک دوست کی تحریر سے معلوم ہوا کہ تیاری سڑک آهنی کی دھلی سے آگرہ کو بڑی دھوم دھام سے ہو رہی ہے - اگلے سال گاڑی چل نکلے گی کہتے ہیں کہ اس کے کارخانہ کے مکانات کی عمارت دریاے جمن سے اس طرف شہر کے اندر

تھری ہے اور سنا ہے کہ دریبہ کلاں واقعہ چاندنی چوک کی عمارات قدیم مسمار کی جاویںگی اور وہاں عمارات کارخانہ ریلوے تیار ہوں گی چنانچہ پیمود بھی ہوگئی ہے اور حکم انہدام مکانات مذکوریں کا سنایا گیا ہے مگر لوگوں نے عرضی اپنی بہ حضور جناب گورنر جنرل صاحب بہادر ارسال کی ہے'' —

معلوم ہوتا ہے کہ لاہور میں پہلا سرکاری مدرسہ اس مہینے (مارچ سنہ ۶۰) میں جاری ہوا :-

۷ اپریل کا پرچہ ایک عجیب منظر پیش کرتا ہے - صفحہ ۲۸۴ میں درج ہے :-

''تتمہ تقریر مسٹر جیمس ولسن مشیر مالی گورنمنٹ ہند درخصوص تقرر ٹکس ہاے جدید در انجمن قانونی منعقدہ ۱۸ فروری سنہ ۶۰ روزشنبہ اکنوں پوشیدہ نماند کہ ایں ہمہ اسباب و وجوہ اختلاف حساب ہارا کہ بمعرض تبیاں درآوردم غرض من ازاں چنیں نمی باشد کہ ہیچگونہ معذرتے درخصوص آں نوع طریقہ ترقیم ... ''

اصل اخبار کے دیکھنے سے یہی پایا جاتا ہے کہ اصل تقریر فارسی ہی میں ہوئی تھی - اگر سنہ ۱۸۶۰ ع میں گورنمنٹ انڈیا کا ایک کابینہ کا وزیر فارسی زبان سے رجوع لاتا ہے تو اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں - کابینہ یعنی کیبنیٹ کے منسٹروں کا نرالا پن اب بھی وہی ہے جو ساٹھہ ستر برس پہلے تھا چنانچہ ۶ ستمبر سنہ ۱۹۳۴ کو روائٹر لندن سے تار دیتا ہے کہ رائٹ آنریبل مسٹر والٹرالیٹ منسٹر ایگریکلچر نے ایبرڈین کی برٹش ایسوسی ایشن میں ریلیٹوٹی یعنی نظریہ

اضافیہ پر نظم میں تقریر کی - فلسفہ اور سائنس کے مسئلوں پر نظم میں بحث کرنا ایسے ھی بڑے آدمیوں کا کام ھے جس طرح کہ مالی امور پر فارسی میں تقریر کرنا —

یہ پرچہ آگے چل کر صفحہ ۲/۸ پر خبر دیتا ھے :-

" بمبئی میں لڑکیوں کی تعلیم بھی بہت ترقی پر ھے - خاص قوم پارسیوں میں لڑکیوں کے چار مکتب ھیں - اور قریب چار سو لڑکیوں کے ان میں تعلیم پاتی ھیں .. سوائے پارسیوں کے دو مرھٹوں کے اور دو گجراتیوں کے اسکول اور ھیں اور ان میں ۳۵۱ لڑکیاں پڑھتی ھیں " —

سوشل اصلاح کے حامیوں کے لئے یہ خبر دلچسپ ثابت ھوگی :-

" معلوم ھوا کہ شادی بیوگان ھنود کا پونا میں بڑا چرچا پھیل رھا ھے اور بہت لوگ اس بات کے رواج دینے پر مستعد ھیں برھمنوں کے کئی افضل خاندانوں میں کئی بیوہ عورتوں کی شادی کی گفتگو ھو رھی ھے اور تین سو برھمنوں اور پنڈتوں کے قریب اس رائے پر متفق ھیں اور کہتے ھیں کہ پنروا‌ہ مناسب اور دھرم شاستر کے موافق ھے یہ رواج کئی برس سے جاری ھو گیا ھے " —

ایک اور خبر یہ ھے کہ :-

" ۲۵ اپریل کو شام کے وقت جناب مہاراجہ صاحب بہادر والے پٹیالہ لاھور سے بہ سبیل ڈاک سیج گاڑی لالہ کدارناتھہ معہ چند اکابر ریاست پٹیالہ کو تشریف لے گئے " —

۵ مئی سنہ ۶۰ ع کی اشاعت میں دھلی کی یہ خوش خبری درج ھے :-

" سنتے ہیں کہ جناب نائب السلطنت امیر کبیر نواب گورنر جنرل بہادر نے براہ الطاف خسروانہ ارشاد کیا ہے کہ جامع مسجد دہلی مسلمانان دہلی کو واپس مل جاے " —

یہی اشاعت مدرسہ سرکاری لاہور کی بابت چند دلچسپ امور کا ذکر کرتی ہے - اس مدرسہ کے کھلنے کا ذکر پہلے آچکا ہے - لکھا ہے :-

مسٹر میکڈی صاحب بریلی سے طلب ہوکر مدرس مقرر ہوے ... ایک مدرس فارسی بھی مقرر ہوگا - ایک پنڈت شاستری بھی مقرر ہوگا - درجہ اول میں فرزندان راجگان و رئیسان و سرداران کمرہ علاحدہ میں پڑھاے جاتے ہیں - درجہ دوم میں اکثر فرزندان عہدیداران سرکاری و مہاجنان وغیرہ عزت داران کمرہ جداگانہ میں تعلیم پاتے ہیں - درجہ سیوم میں عام بھلے مانسوں کے لڑکے درس پاتے ہیں - طلبا درجہ اول کی فیس تین روپے ماہوار سے ایک روپیہ تک باقیوں سے ۸ آنے حق التعلیم - مکان تعلیم حویلی راجہ دھیان سنگھہ صاحب سر گباسی تجویز ہوئی ہے " —

کہتے ہیں انسانوں کی طرح مکانوں کی بھی قسمت ہوتی ہے - یہ حویلی راجہ دھیان سنگھہ کی ضرور ایسی ساعت میں بنی ہوگی کہ اکثر و بیشتر تعلیمی اور ادبی کاموں کے لئے استعمال میں آیا کرے - یہ پنجاب کا پہلا سرکاری سکول اس مکان میں قایم ہوا - اور لاہور کا گورنمنٹ کالج بھی اسی مکان میں شروع ہوا - اخبار عام کا دفتر اردو مطبع بھی برسوں یہاں رہا - ڈاکٹر اینی بسنٹ جب تھیو سو فیکل میں شامل ہوکر پہلے پہل لاہور آئیں تو ان کے لکچر اسی مکان میں ہوے - سوامی ویکانند کی فلسفیانہ آواز بھی اسی مکان میں گونجی اور اب دیال سنگھہ هائی سکول ابتدا سے

اسی کے زیر سایہ چل رہا ہے - اب اس ابتدائی مدرسہ کا حال سنیے درجہ اول میں جس کا ذکر آگے آیا انتیس طلبا داخل ہوے - درجہ دویم میں ۲۱ مئی سنہ ۶۰ کو اتھارہ سے سینتالیس ہوگئے - درجہ سوم میں صرف چودہ لڑکے پڑھتے تھے - لڑکوں سے داخلہ کے وقت 'زر شگون' لیا جاتا تھا - چنانچہ اول دن یعنی ۱۲ مارچ کو تین سو تیس روپیہ شگون کی مد میں رئیسوں کے شعبہ میں وصول ہوا - لیکن بعد میں اس 'زر شگون' کی رقم معین ہوگئی - یعنی صنف اول کے لئے چار روپے سے سات روپے تک صنف دوم کے لئے دو روپے سے چار روپے تک —

اٹک کے کنارے پل بنانے کے لئے سخت دقت پیش کرتے تھے اس لئے ابتدا میں یہ تجویز قرار پائی تھی کہ اٹک کا پل زمین دوز بنایا جاے' یعنی اس کے نیچے سرنگ نکالی جاے - ۱۱ جنوری سنہ ۱۸۶۲ کا کوہ نور اس کی بابت یہ لکھتا ہے :—

"تیاری پل زمین دوز اٹک اب بدستور دونوں جانب میں جاری ہے - سابق جو پانی آگیا تھا اب سب خشک ہوگیا ہے - ایک صاحب لکھتے ہیں کہ کل طول اس پل کا اس پار سے اُس پار تک پندرہ سو فٹ ہے جس میں سے ۳۸۰ فٹ ایک جانب سے اور ۲۹۸ فٹ دوسری جانب سے کھد چکا ہے :—

۱۸ جنوری سنہ ۱۸۶۲ ع کا اخبار لاہور میں پہلے پہل آنریری میجسٹریتوں کی خبر دیتا ہے جو کئی وجوہ سے نہایت دلچسپ ہے ملاحظہ ہو :—

"سوموار کے دن ۱۳ جنوری کو خاص کوتوالی شہر لاہور میں حسب منظوری جناب نواب لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب دام اقبالہ ایک جلسہ شایان تفویض اختیارات آنریری مجسٹریٹ ہوا" -

" هدایت آنریری مجسٹریٹ لاهور —

" ا جلاس کوتوالی میں هو - آپس کے مشورہ سے باریاں باندہ لیں گے"

" دفعہ ۵ - ان کے پاس ایک منشی مشاهرہ دار تیس روپے کا بمنظوری صاحب کمشنر بہادر مقرر کیا جاے گا "—

دفعہ ۶ کسی طرح مثل فارسی و اردو میں مرتب نہ کی جاے گی کل تحقیقات زبانی هو گی - مستغیث خود حاضر هو کے زبانی استغاثہ کریں گے - عرضی دینے کی کچھہ ضرورت نہیں هے "-

" دفعہ ۷ - تعمیل زبانی احکام آنریری مجسٹریٹوں کی ذمہ سپرنٹنڈنٹ پولیس شہر کے هے - اور ایک سپاهی خواندہ پولیس کا آنریری مجسٹریٹوں کے پاس واسطے تحریر نام گواهان ... حاضر رهے گا —

اختیارات پچاس روپیہ جرمانہ - تین ماہ قید یہ عدالت بھی خاصی نو شیروانی هو گی - بیکنسفیلڈ نے ایک ناول میں کاغذ قلم دوات کو بہت دلکا هے - اس نے تو صرف ایک دلی خواهش کا اظہار کیا تھا - یہاں عملاً ع - کاغذ بدرید ند و قلم بشکستند - کا مضمون هے —

اسی اشاعت میں " جناب معلے القاب نواب لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب " معہ " جناب دیوس صاحب سکرٹکری اعظم لاهور " کی " بہ سبیل سیج گاڑی کلکتہ کی روانگی کی خبر درج هے اور لکھا هے یقین هے کہ عرصہ ایک مہینے تک واپس آجائیں گے - اس سے اگلی اشاعت میں درج هے " خبر معتبر هے کہ ۲۳ یا ۲۴ ماهحال تک نواب لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب رونق افروز کلکتہ هو جائیں گے " - صاحب موصوف ۳۰ جنوری کو کلکتہ سے واپس روانہ هوکر ۹ کو لاهور پہنچے گویا اس زمانے میں لاهور سے کلکتہ

کا سفر دس یا گیارہ دن میں طے ہوتا تھا - اس سے عام لوگوں کی مدت سفر کا اندازہ ہوسکتا ہے - ان کو ضرور لفٹنٹ گورنر سے زیادہ ہی مدت سفر میں گزرتی ہوگی - اب یہ زمانہ ہے کہ پبلک ریلوں کی سست رفتاری کی شکایت کرتی ہے اور اگر کوئی ٹرین دس پانچ منٹ لیٹ ہو جاے تو مسافروں کو نا گوار گزرتا ہے --

۸ فروری کے اخبار میں ایک نامہ نگار ڈیرہ اسمعیل خاں سے فارسی میں ایک خبر لکھتا ہے - یہی اخبار معتبر ہے :-

" نیلام پشمینہ جو لندن میں ہر ششماہی کو ہوتا ہے اب کی دفعہ ۹ تاریخ دسمبر سے ۱۲ تاریخ ماہ مذکور تک ہوا اشتہارات نیلام تجاران شال امرتسر کے پاس آ گئے ہیں - معلوم ہوتا ہے کہ اب کے نیلام میں مال پشمینہ تحفہ و اعلی کشمیری و پنجابی برابر قیمت کو فروخت ہوا تجاروں کو نفع ہوا نہ نقصان اور مال پشمینہ جلال پوری و لدھیانہ و نور پوری وغیرہ جس میں اون کرمانی دروتی مستعمل ہوتی ہے نہایت ناپسند ہوا اور قیمت بھی کم وصول ہوئی ... ہم شالبافوں کو بہ تاکید تمام آگاہ کرتے ہیں کہ اگر وے اس کھوٹ سے باز نہ آویں گے اور پشمینہ اصیل میں خراب اون ملا دیں گے تو پشمینہ کی بکری ممالک یورپ میں ہرگز نہ ہوا کرے گی " -

" لاہور میں حکام کی مہربانی سے سب طرح خیریت ہے " - یہ لکھہ کر پھر باغ شعلہ مار کا ذکر آتا ہے --

لاہور میں ابھی تک ریل تو نہیں آئی لیکن ۱۲ جنوری سنہ ۱۸۶۲ کو اس کا کچھہ سامان لاہور میں آتا ہے - اس کے استقبال کی کیفیت

کوہ نور اس طرح لکھتا ھے —

" ۱۲ تاریخ کو سامان ریل بڑے تجمل اور شان سے یہاں پہنچ گیا جملہ صاحبان عالیشان اور مہم صاحبان اور رئیسان لاھور اس کے لانے کے واسطے تین کوس کے فاصلہ پر تشریف لے گئے تھے ہزار ھا باشندگان شہر کا ھجوم تھا - سپاہ گورہ و پولس کی چاروں طرف ریل کی حفاظت تھی - کئی سو بیل بامداد پانچ ھاتھیوں کے اوس کو نہایت آھستگی سے کھینچتے لاتے تھے قریب شام سب سامان بیرون دروازہ دھلی متصل کارخانہ ریلوے آکر ٹھہرا ۔ اب ھر روز وھاں میلہ لگا رھتا ھے - اسی دن رات کو صاحبان عالیشان نے بتقریب ورود ریل جلسہ عیش و طرب کا ترتیب فرماکر باھم شغل اکل و شرب فرمایا - خبر ھے ۳ مارچ کو لاھور سے امرتسر تک ریلوی جاری ھو جاوے گی "-

(یہی اخبار ھندوستان میں " آھنی سڑکوں " کی کیفیت یوں لکھتا ھے

" آخر سنہ ۱۸۶۱ع میں منجملہ کل ۲۹۳۳ میل کے جو کہ تمام ھندوستان میں زیر تیاری ھیں ۱۳۶۰ میل پر ریل جاری ھو گئی مشرقی ریل [ایسٹ انڈین ریلوے سے مراد ھے] چند روز میں چار سو میل تا مقام منگھیر رواں ھوگی اور دریاے سون پر عالیشان پل جون تک تیار ھو جاوے گا ایک سڑک آھنی دھلی سے آگرہ تک بنے گی اور اس کی پیمایش ھوچکی ھے مہتمم فرینڈ اف انڈیا کو امید ھے کہ سنہ ۱۸۶۳ کے موسم برسات تک کلکتہ سے تا دھلی برابر سلسلہ آمد و رفت کا بسواری ریل جاری ھوگا - مدراس میں ناگپور کی لین بھی اختتام کو پہنچی لیکن

بالفعل جاری نہیں ہے اور کلکتہ سے جانب جنوب و شرق والی
ریل ۲۹ میل مقام متلا تک تمام ہو چکی ہے صرف ایک پل
باقی ہے وہ بھی چند ہفتوں میں کھل جاے گی اور ہوڑا میں
کارخانہ تجارت کی ترقی پکڑنے سے گورنمنٹ کی تجویز یہ ہے کہ
ایک پل بنا دیا جاوے [ہگلی پر] کہ وہاں سے مال کی آمد و رفت
کلکتہ میں ہونے لگے اس پل کا صرف پندرہ لاکھہ روپیہ ہوگا
اور بطرز عجیب ہیگا " —

آخر بہ قول کوہ نور مورخہ ۸ مارچ سنہ ۱۸۶۲ ع "یکم تاریخ مارچ
سنیچر کے دن لاہور سے امرتسر تک ریل بڑی دھوم دھام سے جاری ہوئی
یہ وہ دن مبارک تھا کہ تواریخ پنجاب میں ہمیشہ کے لئے یادگار رہے
گا " - قطعہ تاریخ اجراء ریل از لاہور تا امرتسر من تصنیف دیوان امر
ناتھہ صاحب رئیس لاہور" بھی لطف سے خالی نہیں - فرمایا ہے :-

ریل گردید رواں از لاہور سوے امرتسر و دل ہا شد شاد
مغز نسر و دز دودش ہمہ خوں گلخنش آتش جان شداد
بروش تیز چو عقل صانع بدوش تیز چو فکر استاد
صرف گردید بسے آہن و سنگ رہ متیں گشت چو سطح فولاد
شہ انگلینڈ طلسمے عجبے کرد در مملکت خویش ایجاد

نقش بر بال پری بست چنیں
می پرد تخت سلیماں برباد
سنہ ۱۸۶۲ ع

(" لاہور سے امرتسر تک درجۂ اول کی گاڑی کا کرایہ تین روپے' اور
درجۂ دویم کا دو روپے' اور درجۂ سوم کا ۴ آنے ہوگا - ایک گھنٹہ

چالیس منٹ میں یہ ۳۲ میل کا فاصلہ طے ہوگا'') —

اسی اخبار سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ۳۱ دسمبر سنہ ۱۸۶۰ ع کو خزانجات سرکاری ممالک ہند میں ۱۷ کروڑ ۷ لاکھہ ۳۸ ہزار ایک سو چودہ روپیہ موجود تھا بمقابلہ ۳۱ دسمبر سنہ ۱۸۵۹ ع کے جب کہ یہ میزان ۱۴ کروڑ ۷۳ لاکھہ ۵۵ ہزار چار سو سینتیس تھی —

بریلی کے ایک نئے مطبع 'جلوہ ظہور' کا اشتہار جو ۲۶ اپریل سنہ ۱۸۶۲ ع کے کوہ نور میں مالک مطبع مذکور نے جاری کیا قابل دید ہے - لکھتے ہیں :-

"راے جہاں آرا ے صاحبان دانش اور دانش پسندان ہمت بلند پر مخفی نرہے کہ خالق کائنات اور آفرینندہ موجودات نے انتظام سلسلہ جہان و جہانیاں کا ساتھہ علم اور عقل کے وابستہ فرمایا ہے ..." —

۳ مئی سنہ ۱۸۶۲ کے اخبار میں لوکل اس طرح لکھتے ہیں :-

"لاہور میں سب طرح خیریت ہے ہر چند مئی شروع ہوگیا چندان گرمی نہیں ہے بلکہ رات کو کبھی کبھی ایسی سردی پڑتی ہے کہ رضائی کی حاجت ہوتی ہے" —

یہاں موسم کا اب بھی یہی حال ہے جو اب سے بہتر برس پہلے تھا -

پہلے قانون ایسا تھا کہ جس مقدمہ میں کوئی یوروپین ایک فریق ہو وہ صرف کلکتہ ہی میں سماعت ہوتا تھا - خود یوروپین لوگوں کو اس میں بڑی زحمت ہوتی تھی ذرا ذرا سے معاملے کے لئے ہندوستان بھر کے کونے کونے سے کلکتہ جانا پڑتا تھا - اس لئے انہیں نے واویلا کرکے اس قانون کو ترمیم کرایا - ابھی یہ ترمیم نہیں ہوئی تھی کہ ۵ جولائی سنہ ۱۸۶۲ کے کوہ نور نے یہ خبر شایع کی :-

" پھانسی- اسی اخبار [دھلی گزٹ] میں لکھا دیکھا کہ کلکتہ میں
۲۳ تاریخ جون کو صبح کیوقت مسٹر ' رڈ ' نام ایک صاحب
پھانسی دئے گئے جنھوں نے راولپنڈی میں ایک ھندوستانی کو
بندوق سے ھلاک کیا تھا اور مقدمہ ان کا حسب آئین سرکار
تفویض سوپریم کورٹ کلکتہ ھوا تھا - قریب تین ھزار صاحبان
و پانسو رئیسان کلکتہ نے جناب لارڈ الجن صاحب بہادر گورنر
جنرل کی خدمت والا میں التجا کی تھی کہ ازراہ ترحم
رڈ صاحب ممدوح کی نسبت عوض سزا قصاص حکم حبس دوام
بعبور دریاء شور ھو جاے لیکن جناب معظم الیہ نے اس
کو نا منظور کیا " —

لاھور کے لارنس گارڈن کی تاریخ جسے کوہ نور " تاریخ یادگار باغ
سر جان لارنس صاحب بہادر لفٹننٹ گورنر سابق پنجاب " کہتا ھے جو
" محمد مردانعلی خاں صاحب المتخلص بہ رعنا کی تصنیف سے ھے قابل
ملاحظہ ھے - لکھتے ھیں :—

لفٹننٹ پنج آب تھے سر جان لارنس تھے نیکنام بسکہ وہ صاحب دل و دماغ
باغ جہاں میں نام رھے تا کہ تابہ حشر لاھور میں یہ اونکا بنا یادگار باغ
' رعنا نے ' نام باغ سے ڈیوڑھے لئے عدد روشن سن مسیح ھوا صورت چراغ

۱۳ ستمبر سنہ ۱۸۶۲ کے اخبار سے پایا جاتا ھے کہ لنکا شایر (جسے کوہ نور
لین ' کشائر ' لکھتا ھے) پر اس سال کوئی مصیبت آئی تھی کہ وھاں کے
باشندوں کی امداد کے لئے ھندوستان میں جگہ جگہ چندے ھوے چنانچہ
دھلی میں چار سو اکیانوے اور امبالہ میں پیک الن سوداگر کی کوشش سے
"محتاجان لین کشایر" کی امداد کے لئے ایک ھزار تین سو سولہ روپیہ چندہ ھوا -

اسی اخبار سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ خطوط وغیرہ پر ٹکٹ اسٹامپ نصف آنہ لگانے کا دستور سنہ ۱۸۵۴ میں جاری ہوا تھا - ۱۱ اکتوبر کی اشاعت دھلی میں تعلیم نسوان کی ترقی پر اطمینان کی روشنی ڈالتی ہے - جزیرۂ سراندیپ میں "آمد سرکار" کی توقیر کا ذکر کرتے ہوے اسی سلسلے میں لکھتے ہیں :-

"یہ خوبی حسن انتظام سرکار کی ہے ورنہ ہندوستانی ریاستوں میں اگر اس قدر بچت ہوا کرے تو یہ ریاستیں مالا مال ہوجائیں اور عمدہ طریق پر روپیہ صرف ہونے کے واسطے سرمایۂ کثیر جمع ہو مگر یہ بات نہ اہلکار ریاستوں کے چاہتے ہیں اور نہ خود رئیس پرواہ کرتے ہیں اور رعایا بھی چنداں خوش نہیں رہتی اکثر جگہ لوگ تنگ ہوکر انگریزی عملداری کی تمنا رکھتے ہیں اور اپنی سرکار کے شاکی ہیں" -

(یکم نومبر سنہ ۱۸۶۲ع کا اخبار راوی ہے کہ :-

"لاہور کرانیکل سے معلوم ہوا کہ لاہور میں جو یادگار سرجان لارنس صاحب بہادر لفٹنٹ گورنر اول پنجاب کے واسطہ ایک مکان 'جان لارنس ہال' زر چندہ سے تعمیر ہو رہا ہے اس کی امداد کے واسطہ راجہ صاحب بہادر فریدکوٹ نے پانسو روپیہ عطا فرمایا ہے "-)

"لین کشایر" کے "محتاجین" کی امداد کے لئے ہندوستان میں جگہہ جگہہ سے چندوں کی خبریں اس مہینے میں چھپتی رہیں :-

۲۹ نومبر کا اخبار یہ لوکل خبر دیتا ہے :-

" فرش کنکر دھلی دروازہ سے کوتوالی تک تیار ہوگیا ہے اب

وہاں سے ہیرا منڈی تک شروع ہوا ہے پھر بھاٹی دروازہ تک جاے گا شہر کے گردا گرد نہر بھی خوب سرگرمی سے جاری ہے"۔

" عماہ اسکول مشن کو اب خوب رونق ہے قریب ایک سو طالب علموں کے تعلیم پاتے ہیں اور کمال خوشی کی بات ہے کہ ابتدائی مئی سنہ حال سے ۲۵ ماہوار کی امداد کا حکم اس سکول کے واسطے لفٹنٹ گورنر نے بھی منظور فرمایا ہے - ۲۱ نومبر کو دو گاڑی ریل ملتان سے لاہور میں پہنچ گئی "-

۶ دسمبر سنہ ۱۸۶۲ کو یہ خبر دیتا ہے :-

" شاہ دہلی - اخبار لاہور کرانیکل میں از روے تحریر معتبر دیکھا کہ ۷ تاریخ ماہ گذشتہ کو رنگون ملک برہما میں مغلوں کا آخر بادشاہ ' ابو ظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ بادشاہ غازی ' اس دار ناپایدار سے رحلت کرگیا اب اس خبر میں کچھہ شک نہیں"۔

(ان دو برسوں یعنی سنہ ۱۸۶۰ع اور سنہ ۱۸۶۲ ع کی کوہ نور کی جلدوں میں حسب ذیل معاصرین کے حوالہ آے ہیں :-

۱ لاہور کرانیکل - ۲ دہلی گزٹ - ۳ انگلشمین - ۴ کمرشل گزٹ الہ آباد - ۵ فینکس - ۶ ہرکارہ - ۷ لکھنؤ ہرلڈ - ۸ اخبار اودہ گزٹ - ۹ اخبار بمبئی گزٹ - ۱۰ اخبار سندھن - ۱۱ نورالابصار آگرہ - ۱۲ مفید خلایق - ۱۳ بمبئی ٹایمس - ۱۴ مجمع البحرین لدھیانہ - ۱۵ اودہ اخبار - ۱۶ شعلہ طور - ۱۷ فرینڈ اف اینڈیا - ۱۸ اخبار انجمن ہند لکھنو - ۱۹ دہلی جرنل - ۲۰ پونا ابزرور) -

کشف الاخبار اس اخبار کے نام کا تتمہ تھا " کاشف الاسرار "- بمبئی سے باہتمام منشی امانعلی لکھنوی نکلتا تھا - ایک عجیب بات جو اب

تک اور کسی اخبار میں نہیں دیکھی وہ اس میں یہ تھی کہ اس کا اشتہار نظم میں اول صفحہ پر ہوتا - سارا صفحہ اسی سے پر ہوتا تھا - سنیے ١٦ مئی سنہ ١٨٦١ع کی جلد سے :-

" کرچکا پہلے جب بحکم خبر   حمد خالق و نعت پیغمبر
تب بہت دل مرا بحال ہوا   مدح اخبار کا خیال ہوا
نام اخبار اب کروں اظہار   کشف الاخبار کاشف الاسرار
... ...
ہے یہ امید اہل دولت سے   دستگیری کریں عنایت سے
... ...

شرح قیمت ملاحظہ ہو :-

سوا سکہ یہ ماہوار جو لے   وہ سوا تیرہ سال پیشگی دے
... ...
بدہ کو اخبار چھاپ لیتا ہوں   پنجشنبہ کو بانٹ دیتا ہوں

چند مہینوں کے بعد ان بیالیس شعروں کی جگہہ صرف چار مصرع رہ گئے - خبر اقلیم چین ملاحظہ ہو جو اشاعت مذکورہ سے نقل کی جاتی ہے - عبارت آرائی فسانۂ عجائب کو مات کرتی ہے :-

" مخبروں کا اظہار ہے کو ایف تازہ آشکار ہے کہ بالفعل دیار چین سے آگبوت آیا اس طرح کی خبر لایا کہ اب اُدھر کا ملکی کاروبار بسہولیت و آرام تمام جاری ہے ایام فساد کا گزرگیا چین و امنیت کی باری ہے - فغفور چین اپنی دارالسلطنت کی طرف مراجعت فرما ہوا ......"-

(ایک اور خبر یہ ہے :-

" خیر - صاحب انگلشمین ظاہر کرتے ہیں حال آمدنی پیش سے ہر ایک کو ماہر کرتے ہیں کہ شہر کلکتہ کے محکمہ سلطانی شیشن کورٹ میں جو کارپرداز قاعدۂ دین محمدی کے واقف کار اور مذہب ہنود کے پنڈت شاستر داں ملازم سرکار ہیں ان کو موقوف کریں گے ' —

۱۳ اپریل سنہ ۱۸۶۲ ع کا پرچہ نئے وایسرائے کے تقرر کی خبر اس طرح لکھتا ہے : —

" خبر تشریف آوری گورنر جنرل جدید منشیاں شیریں بیان فرخندہ تحریر و دبیران فال زباں ہمایوں تقریر اس خبر بشاشت اثر دلپذیر کو یوں تسطیر کرتے ہیں کہ ملک ہندوستان گلشن نشاں کے نئے گورنر جنرل " —

آج کل کے اخباروں کے اڈیٹروں اور پڑھنے والوں کو ان پراتم بزرگوں کی فرصتوں پر ضرور رشک آتا ہوگا —

اخبار عالم | یہ اخبار میرٹھ سے نکلتا تھا - منشی وجاہت علی خاں اس کے مہتمم تھے اس زمانے میں مہتمم اڈیٹر کو کہا کرتے تھے اور اکثر وہی مالک بھی ہوا کرتا تھا - اس اخبار کی اشاعت مورخہ ۵ جنوری سنہ ۱۸۶۵ ع پر جلد ۵ نمبر ۱۰ درج ہے - یہ اخبار ہفتہ وار تھا اسی اشاعت میں میرٹھ کی لوکل خبریں نظم میں درج ہیں - فرماتے ہیں : —

" سردی اب کی برس ہے اتنی شدید کانپتا نکلے ہر سحر خورشید "

۱۹ جنوری سنہ ۱۸۶۵ کا اخبار کار خیر کی ایک خبر اس طرح سناتا ہے : —

"کار خیر - اخبار انڈین ڈیلی نیوز میں لکھا ہے کہ مسٹر پریم چند اور رائی چند روسائی بمبئی نے سرکار گورنمنٹ کو اس بات سے خبردار کیا ہے کہ ہم چھہ لاکھہ روپیہ سرکار گورنمنٹ کو بندوبست کرنے پانی سکناء سورت کے واسطے کہ ان کو بہت تکلیف ہے دیتے ہیں - عبارت کا الجھاؤ اور ضعف تالیف طبیعت کو بد مزا کرنے والا ہے" —

اگلی اشاعت میں دو کالم کا ایک مضمون "تعلیم عورات" پر ہے - جو اس طرح شروع ہوتا ہے :—

" ازروی شرع شریف و دھرم شاستر کے پڑھنا لکھنا عورتوں کا جایز ہے بلکہ مذہب اسلام میں جیسا پڑھنا لکھنا مردوں پر فرض ہے اسی قدر عورتوں کو ہے" -

اکمل الاخبار | یہ اپنے وقت کے نہایت ثقہ اخباروں میں سے تھا - دھلی سے نکلتا تھا مشہور و معروف حکیم محمود خاں اس کے مالک تھے - یکم جنوری سنہ ۱۸۷۰ ع جلد ۳ نمبر ۱ سے یہ دو اقتباس لیے جاتے ہیں جو جدید قانون ریلوے سے تعلق رکھتے ہیں - پایا جاتا ہے کہ زنانہ درجے میں مرد کے سفر کرنے کی سزا ایک سو روپیہ جرمانہ تھی - اور

"اگر کوئی افسر ریلوے جب کہ اپنی کام پر نشہ میں مخمور ہوجائے تو وہ ایک سال تک قید ہوسکتا ہے اور اس پر جرمانہ بھی ہوسکتا ہے" -

اسی اشاعت میں درج ہے :—

"قوانین جدید در باب اجرت خبر تار برقی"

" نیا طریقہ جو خبر تار برقی کے بھیجنے کے لیے مقرر ہوا ہے

ناظرین اخبار کے ملاحظہ کے لیے ذیل میں درج کیا جاتا ہے -

اگر سو میل سے زیادہ فاصلہ پر نہ ہو - آٹھہ آنے - اگر سو میل سے فاصلہ زیادہ ہو اور ۲۰۰ میل سے کم ہو - ایک روپیہ "

... ...

اسی طرح اگر ۱۰۰۰ میل سے فاصلہ زیادہ ہو مگر ۲۰۰۰ سے کم - پانچ روپیہ ماسوائے اس کے آٹھہ آنے فی پیغام بطور رسوم بابت رجسٹری کتاب لیا جاوے گا اور محنتانہ چپراسی نہ لیا جاوے گا "

پایا جاتا ہے کہ ہندوستانیوں کا جوتا بھی مدت تک ایک اہم سیاسی مسئلے کی طور پر رہ چکا ہے - ۸ جنوری سنہ ۱۸۶۸ ع کا اکمل الاخبار لکھتا ہے :-

" عرصہ چند روز کا گذرا کہ نواب گورنر جنرل بہادر کشور ہند نے ایک حکم معرفت گورنمنٹ ماتحت کے صاحبان جج ہائی کورٹ اضلاع ممالک بنگال اور ممالک مغربی کے پاس درباب دریافت رائے اس امر کے بھیجا تھا کہ جن ہندوستانیوں نے انگریزی وضع اور لباس کا پہننا اختیار کرلیا ہے جب وہ کچہری میں آویں اور اس جگہ فرش ہو یا نہ ہو ان کا جوتا اوتارنا مناسب ہے یا نہیں - بجواب اس کے صاحبان ہائی کورٹ نے اپنی رائے مختلف لکھی ہے اب یہ امر ہائی کورٹ مدراس سے دریافت کیا گیا ہے -

۲۸ مئی سنہ ۱۸۶۸ ع کی اشاعت میں مرزا غالب کی تصویر کا اعلان ہے - یہ تصویر مرزا کی آخری تصویر ہوگی کیونکہ سنہ ۱۸۶۹ ع میں تو ان کا انتقال ہوگیا :-

" شبیہہ مبارک جناب معلی القاب نجم الدولہ دبیرالملک

اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ غالب مدظلہ العالی - ناظرین والا تمکین اور نیز شاگرداں ارادت آئیں حضرت ممدوح الصدر کو مژدہ ہو کہ دریلولا حضرت ممدوح کی تصویریں فوتوگراف کی ترکیب سے ایک شخص نے تیار کروای ہیں - پس جس صاحب کو شبیہ مبارک لینی منظور ہو وہ دو روپیہ کے تکٹ بلف عنایت نامہ پیتہ لالہ بہاری لال کے نام اکمل المطابع دھلی میں بھیجدیں بصیغہ بیرنگ ان کی خدمت میں مرسل ہوگی " -

۲۹ جولائی سنہ ۱۸۶۸ کا اخبار ایک واقعی دلچسپ مضمون پیش کرتا ہے - لکھا ہے :—

" غلط فہمی حاکم و محکوم کو عملداری انگریزی کے نا مطبوع کرنے میں بڑا دخل ہے - حکام اوایل عمر سے عموماً ولایت میں تعلیم پاتے ہیں - وہاں کی رسم وراہ و قواعد و ضوابط و عادات اور طریقوں سے واقف ہوتے ہیں اور انہیں کو اچھا جانتے ہیں - ہندوستانیوں کی عادات اور اُون کے عقاید سے اُون کو بخوبی علم نہیں ہوتا اُون کی ساری کارروائی انہیں اصول اور خیالات پر مبنی ہوتی ہے جو اونھوں نے اوایل عمر سے اپنے وطن میں کسب کئے ہوتے ہیں ... اور وہ اس امر کے خواہاں ہوتے ہیں کہ ہندوستانی بھی اونہیں اصول پر چلیں .... " —

۵ اگست سنہ ۶۸ کے اخبار میں مفتی صدرالدین خاں آزردہ کے انتقال کے دو قطعہ تاریخ درج ہیں ایک میر مہدی 'مجروح' کا طبعزاد اور دوسرا سید امراو مرزا 'انور' کا - مگر وفات کی خبر لوکل کالم میں درج نہیں جو اسی ہفتہ میں واقع ہوئی تھی —

۱۹ اگست سنه ۱۸۶۸ کا اخبار اردو کے مشہور محسن ماسٹر پیارے لال هیڈ ماسٹر نارمل سکول دهلی کی لاهور کے سرکاری بک ڈپو میں تبدیلی کی خبر مشتهر کرتا هے اور صاحب موصوف کے حسن لیاقت کا اعتراف کرتا هے —

۱۸ نومبر سنه ۱۸۶۸ع کا اخبار خبر دیتا هے که :-

"قبل ازیں جناب وایسرائے گورنر جنرل بهادر کی مهربانی سے جو یه قرار پایا تها که نو شخص نیٹو یعنی هندوستانی طالب علم سرکاری خرچ سے تحصیل علم کے لئے ولایت بهیجے جاویں گے بموجب اس قرار داد کے گورنمنٹ بنگاله کی طرف سے دو شخص کا بهیجا جانا ٹهرا هے اور اس میں جناب لفٹنٹ گورنر بنگاله نے یه ٹهرایا هے ..."

۲۰ جنوری سنه ۱۸۶۹ کی اشاعت میں 'سرکاری اخبار' کے عنوان کے تحت لکها هے :—

"اس اخبار کے اهتمام میں جناب ڈایرکٹر صاحب بهادر پنجاب کی توجه خاص هوئی هے اور صاحب ممدوح نے جناب ماسٹر پیارے لال صاحب اور مولوی محمد حسین صاحب کے اهتمام سے جاری کیا هے خاص اسی کام کے واسطے ماسٹر صاحب موصوف کو بترقی مدارج دلی سے لاهور بلایا هے ماسٹر صاحب کی لیاقت عامی اظهر من الشمس هے مولوی صاحب کی بهی شهرت فارسی و اردو میں ابین من الامس هے ..."

یه اخبار غالباً 'اتالیق پنجاب' هے - مگر وه رساله تها —

۱۷ فروری سنه ۱۸۶۹ کا اکمل الاخبار مرزا غالب کی رحلت کی

خبر شایع کرتا ھے یہ ایک مراسلہ میر مہدی مجروح کا لکھا ہوا ھے -
اس سے واضح ھوتا ھے کہ مرزا غالب کا انتقال " ۱۵ فروری سنہ ۱۸۶۹ ع
مطابق ۲ ذیقعد سنہ ۱۲۸۵ ھ روز دو شنبہ کو دو پہر ڈھلے " ھوا -
میر مجروح کے قطعہ تاریخ کے ساتھہ یہ ماتم اور رنج و غم کا مقالہ ختم ھوتا ھے -

کل مرقد استاد پہ افراط الم میں ھاتف نے جو بیٹھے ہوے دیکھا مجھے غمناک
بولا ھے اگر فکر میں تاریخ کی مجروح کہدے نہ یہی گنج معانی ھے تہ خاک

اس کے بعد مہینوں تک مرزا کے شاگردوں اور مداحوں کے قطعات تاریخ نکلتے رھے جن میں منشی ھرگوپال 'تفتہ' مرزا قربان علی بیگ 'سالک' سجاد مرزا سجاد - یوسف علی خاں عزیز - ماسٹر وزیر سنگھہ - مولوی شمس الدین شمس - منشی جواھر سنگھہ جوھر - نواب امین الدین احمد - خواجہ حالی منشی بہاری لال مشتاق - نساخ - مولوی امو جان 'ولی' نواب مصطفی خاں شیفتہ وغیر ھم قابل ذکر ھیں - میر مہدی مجروح کا ترکیب بند مرثیہ غالب بھی اسی سلسلے میں شایع ھوا ھے - اخبار نے نوٹ کیا کہ مادہ تاریخ میں اکثر شاعروں کو 'آہ غالب بمرد' میں توارد ھوا —

۲۸ جولائی سنہ ۱۸۶۹ ع کے اخبار میں انکم ٹیکس پر ایک مضمون ھے - لکھتے ھیں :—

" ۳۱ مئی کے اجلاس میں کلکتہ کی برٹش انڈین اسوسی ایشن نے انکم ٹیکس کی نسبت یا اس کے ایکسال سے زیادہ عرصہ تک جاری رھنے کی نسبت اھل فرنگ کی مانند گرفت کی ھے پس ھم بھی بایں لحاظ انگریزوں کی مثل ھیں کہ جو محصول اپنے ذمہ ھم خود تجویز نہ کریں اس کو ھم اپنے ذمہ

قایم رکھنا پسند نہیں کرتے —"

۲۰ اکتوبر سنہ ۱۸۶۹ ع کے اخبار میں فضیلت ہندوستان" کے عنوان سے ایک مضمون میں جو عبارت آرائی کی گئی ہے اس کا نمونہ لطف سے خالی نہیں- یہ مضمون اس طرح شروع ہوتا ہے :-

"مور خاں صداقت نگار وراویان واقف اسرار نے سمند مشکیں خامہ کو میدان بیان میں جولاں دیا ہے حال عظمت ہندوستان جنت نشان کا اس عنوان سے بیان کیا ہے ... .."

۱۵ دسمبر سنہ ۶۹ کا اخبار ایست انڈیا ریلوے سے متعلق یہ خبر دیتا ہے کہ اس کمپنی کا "ایجنسی بورڈ" اس قسم کی گاڑیاں بنوا رہا ہے جن میں بیچ میں گلی ہوگی جس کے ایک طرف زنانہ کمرے اور دوسری طرف ان مردوں کے مردانہ کمرے ہوں گے جن کی عورتیں زنانہ کمرے میں سفر کر رہی ہوں- اخبار اس نئے انتظام کو نہایت پسند کرتا ہے —

تبصرہ

عام کیفیت اس قرن کے اواخر میں سنہ ۵۷-۵۸ کی افراتفری کے باقیات اور ملکی پریس کی پریشانی دور ہونے لگی- اور اخبار ملکی معاملوں میں دبی زبان سے رائے زنی کرنے لگے- وایسرائے اب امیر کبیر وغیرہ وغیرہ سے صرف جناب وایسرائے بہادر رہ گئے انگریزوں کے لئے صاحبان عالیشان مقرر ہوگیا —

انشا اور اسلوب انشا میں کوئی ترقی نہیں- اسلوب وہی فارسی کی بھدی نقل رہا- بھونڈی قدامت پرستی کی مثالیں بھی کم نہیں- قلعہ دہلی کے سراج الاخبار کی طرح جو خوش دامن چھوڑ کر

مادر زوجہ لکھا کرتا تھا کوہ نور نے 'ڈاڑھی والہ' کو القط کر کے جو ایک لقب تھا 'ریش دراز' اس کا ترجمہ گھڑ کر فارسی کی ٹانگ توڑی - اعلام کو بھی ان لوگوں نے نہ چھوڑا چنانچہ 'شالامار' کو شعلہ مار بنادیا - اور کیمبل پور کو فارسیت کے بحران میں 'کامل پور' کردیا - ایسی ترکیبیں اکثر آتی ہیں جو مخالفت قیاس لغوی کی بھدی مثالیں ہیں - مثلاً :- سپاہی بیچ نکالنے چار ہزار روپیہ کے خزانہ الہ آباد سے گرفتار ہوے تھے - رواج زبان انگریزی کا - (بجاے انگریزی زبان کا رواج) - عرصہ ایک مہینے تک - یہ الفاظ کا مجموعہ مہمل ہے عرصہ یک ماہ تک لکھتے یا ایک مہینے کے عرصے تک تحصیل داراں و سرشتہ داراں کو بیہود ہوگئی - دریاے جمنا کے بدلے دریاے جمن لفٹننٹ گورنر سابق - چین و املیت - کمپنی کی جمع 'کمپنیات گھڑی گئی - فارسیت چھوڑتے تو ایسی بولیاں بولنے لگتے - گورنمنٹ بنگالہ نے یہ ٹھرایا ہے —

املا — املا نے کچھہ بہتر صورت اختیار کی کم سے کم اکمل الاخبار چھوٹے ڈیش کو وقفہ کی طور پر استعمال کرنے لگا - گاڑی میں اب ڑ - ڈ کے ساتھہ باری باری سے سوار ہونے لگی - 'کو نہیں' کو کوائی نہیں لکھا گیا - ماہ کی ہاءھوز حال کے ساتھہ ملا کر لکھتے - پہنچ کو پہونچ لکھتے - ط کے ساتھہ سین - ب مل کر سب طرح لکھتے - اُس ان میں الف کے بعد واؤ آنا ہی تھا - منشیانہ اغلاط مثل سہولیت وغیرہ اور واقعہ بجاے واقع بھی موجود ہے -

سنہ ۱۸۷۰ ع سے سنہ ۱۸۷۹ ع تک

اخبار انجمن پنجاب: — یہ اخبار ۱۴ اپریل سنہ ۱۸۷۱ ع کی اشاعت میں ایک عنوان دیتا ہے - یعنی معلومات جدید مقام

تختہ بائی واقع سرحد پنجاب میں- اس کے نیچے یہ تحریر ہے —

" ہمیشہ برلب فوارہ ایں سخن جاریست

" کہ اوج منصب دنیاے دوں نگونساریست

" سچ ہے کہ زندگی نقش برآب ہے اور دنیا خواب و خیال

کیا کیا عجائبات پروردگار عالم نے اس صفحہ عالم پر پیدا

کیے ہیں جو اُوس کی قدرت کاملہ کا نمونہ ہیں اور اس خاک

کے پتلے یعنی انسان کو کیسی طاقت بخشی ہے کہ وہ بھی دنیا

میں کیسے کیسے کام کرتا ہے اور کیسی کیسی نشانیاں اور

یادگاریں اپنی عقل و ادراک کی چھوڑ جاتا ہے ... "

اُن بتوں وغیرہ کی دستی تصویریں بھی دی ہیں جو نہایت عمدہ اور صاف ہیں- اسی اشاعت میں اودہ کے چیف کمشنر کی بیماری کی خبر ان الفاظ میں لکھی گئی ہے :-

" صاحب پانیر لکھتے ہیں کہ دشمنان جنرل بیرو صاحب

بہادر چیف کمشنر اودہ کی طبع مبارک جادۂ اعتدال سے

سخت منحرف ہوگئی ہے " —

۱۹ جولائی سنه ۱۸۷۲ کا انجمن پنجاب میں " گارسن دی تاسی صاحب کی تصویر دے کر لکھا ہے :-

" صاحب موصوف عربی و فارسی و ہندوستانی میں ملکہ

کامل رکھتے ہیں اور پیرس میں پروفیسر زبانہاے مشرقی ہیں-

انجمن پنجاب کے ممبر اور اُوس کے دلی معاون اور مددگار ہیں"

" ضمیمہ اخبار انجمن پنجاب بابت اپریل سنه ۱۸۷۷ ع " میں انجمن پنجاب کے ایک جلسہ کی روداد درج اس کی قرار داد (۲) دلچسپی

سے خالی نہیں اس وقت تک اہل ہنود میں سمندر کے سفر اور یورپ میں جاکر کچھ مدت رہنے کے متعلق چھوت چھات اور پرہیز و اجتناب کے بہت سے وسوسے تھے - وہ تجویز یہ ہے :—

" (۶) صاحب پریسیڈنٹ بہادر کی تحریک پر تجویز ہوئی کہ ایک درخواست واسطے امداد چندہ راجگان و مہاراجگان و رؤساء پنجاب کی خدمت میں بھیجی جائے کہ لنڈن میں ایک انڈین انسٹیٹیوٹ بنایا جاویگا جس میں مذہبی رعایت اہل ہنود کی ہر ایک امر میں رکھی جاویگی اور ایسی تجویزیں کی جاوینگی جن سے مسافت [مطلب سفر سے ہے] جہاز میں بھی سہولت مذہبی اہل ہنود کو حاصل ہو" —

اسی سال میں لاہور کی بادشاہی مسجد کی مرمت کی تجویز ہوئی جو خستہ حالت میں تھی - اس کام کے لئے گورنمنٹ نے پانچ ہزار روپیہ اس شرط کے ساتھ مرحمت فرمانا منظور کیا کہ اُوس کا دو چند اس ملک کے لوگوں سے بطریق چندہ جمع کیا جائے - چندہ دینے والوں کی فہرست میں یہ نام بھی درج ہیں راجہ ہربنس سنگھ (ان کے چندے سے بڑھکر کسی شخص واحد کا چندہ اس فہرست میں نہیں) - پنڈت موتی لعل - پنڈت بدری ناتھ - منشی ہر سکھ رائے مالک کوہ نور - لالہ نہال چند وغیرہ - اس زمانے کے ملی علم برداروں کو اس واقعہ سے سبق لینا چاہئے —

۱۸ اگست ۱۸۷۱ کا اخبار انجمن پنجاب راوی ہے :—

"ریاست جیند میں ایک انگریز کا قید ہونا - پبلک اوپینین سے خبر ہے کہ مہاراجہ صاحب بہادر جیند نے مسٹر ڈیوس نامی

ایک انگریز کو جو اون کی ریاست میں با جا سکھا نے پر ملازم تھا معہ اوس کی جورو بچوں کے مقید کر لیا ہے - وجہ مقید کرنے کی یہ بیان کی گئی ہیں کہ ایک پلٹن کے گورہ نے ڈیوس صاحب کو لکھا تھا کہ میں اپنی جنگی نوکری سے دست بردار ہونا اور ریاست جیند میں ملازمی کرنا چاہتا ہوں آپ مجھے مشورہ دیں کہ کس طرح عمل کروں ڈیوس صاحب نے جواب میں لکھا کہ آپ انگریزی نوکری چھوڑ کر بڑے پچھتائینگے ریاستوں کا کچھ حال نہیں ہے اور نیٹو بے ایمان ہوتے ہیں - یہ چٹھی پکڑی گئی''

کوہ نور

کوہ نور اپنے ضمیمہ مطبوعہ ۱۶ مئی سنہ ۱۸۷۴ع میں ایک نہایت اہم اور تاریخی جلسہ کی روداد شایع کرتا ہے - انجمن پنجاب کا یہ جلسہ ۹ اپریل سنہ ۷۴ کو انجمن کے مکان سکشا سبھا واقع لاہور میں ہوا - چیف کورٹ کے چیف جج مسٹر بولنواء (Boulnoise) اسکے صدر تھے - مسٹر تھارنٹن سکریٹری پنجاب گورنمنٹ - کرنل مکلا گن سکریٹری پنجاب گورنمنٹ - مسٹر ینگ کمشنر لاہور - مسٹر ھالرایڈ ڈایرکٹر سرشتہ تعلیم - مسٹر نسبت ڈپٹی کمشنر لاہور - نواب عبدالمجید خاں - راجہ ہربنس سنگھ فقیر سید قمرالدین وغیرہ وغیرہ اور بہت سے علماء فضلا اصحاب شریک جلسہ تھے - اس جلسہ کی غرض تھی اردو نظم کی اصلاح کی تجاویز سوچنا - اس جلسہ میں ذکر کے قابل دوباتیں ہیں ایک مولوی محمد حسین آزاد کی تقریر شاعری کی اصلاح سے متعلق اور دوسری انہیں کی ایک نظم مسمول ''بہ شب قدر'' - یہ مثنوی اردو شاعری کی سب سے پہلی نظم نئے طرز کی ہے - یہ دونوں چیزیں آزاد مرحوم کے کلیات میں موجود ہیں - اس دن سے دنیا میں اردو کی باضابطہ نئی یا نیچرل شاعری

کی بنیاد پڑی - اسی جلسہ میں یہ بھی قرار پایا کہ ہر مہینے جلسہ ہوا کرے جس میں شاعر مقررہ موضوع پر نظمیں پڑھا کریں —

ضمیمہ اخبار انجمن پنجاب بابت جون سنہ ۱۸۷۴ ع کی تاریخی حیثیت ہمارے اردو ادب کی تاریخ میں نہایت اعلیٰ ہے کیونکہ اس میں ادارۂ انجمن پنجاب کے اس مشاعرہ یا مناظمہ کی مفصل روداد درج ہے جو ۳۰ جون سنہ ۱۸۷۴ ع کو انجمن مذکور کی سرپرستی میں ہوا تھا - مقررہ موضوع "زمستان" تھا - شاہ انور حسین "ہما" - مرزا اشرف بیگ خاں 'اشرف' مولوی علاء الدین 'محمد' کاشمیری - مولوی الہی بخش 'رفیق' - مولوی محمد حسین 'آزاد' - مولوی محمد مقرب علی 'زاہر' - مولوی امو جان 'ولی' - مولوی قادر بخش اور مولوی عطاءاللہ نے مقررہ موضوع پر نظمیں پڑھیں - اس مناظمہ پر میرا ایک مفصل لکچر ہے (جو میرے مجموعہ نثر میں داخل اور زیر طبع ہے) - اس لئے یہاں زیادہ کہنا طول کلام ہے - اگلے مناظمہ کے لئے 'امید' موضوع مقرر ہوا —

۱۳ اگست سنہ ۷۵ ع کا اخبار شہزادگان جاپان کی نسبت ایک خبر درج کرتا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جاپان اپنی حیرت انگیز ترقی پر کس طرح فایز ہوا - لکھا ہے: -

"شہزادہ 'خیوا کا' عموی شہنشاہ جاپان اور فناتفا کا اجوتنٹ شہنشاہ موصوف سپاہ پرشیا میں داخل ہوگئے اور اونہیں برلن کی رجمنٹ پیدل میں لفٹنٹ کا عہدہ ملا - 'تفاکا' نے لفٹنٹی کا امتحان دیا اور خیوا کا ایک اعلیٰ افسر کے ماتحت کام سیکھ رہا ہے - اس سے معلوم ہوا کہ گورنمنٹ

پرشیا کو اسبات کا تعصب نہیں کہ اُنکی سپاہ میں غیر ملک کے لوگ جنگی عہدوں پر ممتاز نہ ہوں "—

اخبار مذکور اس خبر کی توجیہ یوں کرتا ہے :—

"لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ عہدے اونہوں نے غیر ملک والوں کو اپنے ھی ملک میں دئے ھیں جہاں غیر ملک والوں کی بغاوت کا اندیشہ نہیں - گورنمنٹ انگریزی ملک ھندوستان میں ایسا کرنا نہیں چاھتی کیونکہ یہ غیر ملک ہے اُنکا اپنا ملک نہیں" —

۱۰ ستمبر سنه ۷۵ ع کا اخبار پبلک اُپی نین سے ایک مضمون اخذ اور ترجمہ کرتا ہے جس کا عنوان ہے انگریزی راج - اس مضمون کا ذیل کا اقتباس اوس زمانے کے پبلک کے سیاسی خیالات پر روشنی ڈالتا ہے - لکھا ہے :—

"انگریز دیسی لوگوں کو مراتب اعلی شاید اسوجہ سے نہیں دیتے کہ مبادا وہ سرکار سے سرکش ہو جاویں لیکن یاد رکھنا چاھئے کہ جبتک حق تلفی رفع ہوتی رھیگی اور انصاف ہوتا رہے گا تب تک ھندوستان میں سرکشی کا ویسا ھی کم خطرہ ہے جیسا کہ سکاٹ لینڈ میں - ہم پوچھتے ھیں کہ کیا اندیشۂ بغاوت اس بات سے کم ہوجاویگا اگر باشندگان کے اسلحہ اوتار لئے جاوینگے اور اونکے ساتھ سلوک بد کیا جاویگا ؟ ...

اگر یہی صورت رھی تو ھندوستان کے لئے ایک زمانہ وہ ہوگا کہ اوس کی جنگی حرارت بالکل سرد ہو جاویگی اور یہاں کے لوگ اپنے ملک کے بچاؤ کے لئے اپنا کلی حصر دوسرے ملک والوں پر رکھینگے - کیا یہ بات حکمرانوں کے فائدے کی

ہے کہ محکوم اس طرح ضعیف کر دئے جائیں؟ ... یہ بزدلی
کی مصلحت ہندوستانیوں کو جنگی علاقوں سے محروم کرنے
کی اون کی ساری خوشی کو خاک میں ملادیتی ہے ... " —

۱۷ ستمبر سنہ ۷۵ کے اخبار میں مضامین علمی کی سرخی کے نیچے ایک لمبا مضمون ہے جس کا عنوان ہے " مجموعہ ہیولے - قانون کشش و حرکت کا بیان " —

۱۵ اکتوبر سنہ ۷۵ کا اخبار مخبر ہے کہ :--

" سر رچرڈ ٹمپل صاحب بہادر لفٹننٹ گورنر بنگال نے ایک تجویز اسباب میں پیش کی تھی کہ دیسی معزز لوگوں کی زندگی کا بیمہ کرنے کے لئے ایک صیغہ گورنمنٹ کی جانب قایم کیا جاوے " —

۸ اکتوبر سنہ ۷۵ کا اخبار 'منقولات کی مد میں ایک مضمون دیتا ہے جس کا عنوان ہے 'اردوے معلا —

۱۰ دسمبر سنہ ۷۵ کے پرچے میں مضمون " دربیان فواید صبر مولفہ امیر الامرا نواب محمد اسمعیل خاں صاحب بہادر فیروز جنگ والے ریاست جاورہ " درج کیا گیا ہے - اس سے ظاہر ہوگا کہ اس وقت اردو پریس کی کیا قدر و منزلت تھی —

۱۲ جنوری سنہ ۱۸۷۷ ع کے اخبار میں " دربار قیصری میں انجمن پنجاب اور یونیورسٹی کی قدر افزائی " کے عنوان سے افتتاحیہ درج ہے - اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دہلی میں دربار قیصری کے موقع پر انجمن پنجاب کے ایک معزز ڈپیوٹیشن نے وایسرائے لارڈ لٹن کی خدمت میں ایک ایڈرس پیش کیا - اس کے جواب میں بقول اخبار انجمن پنجاب " حضور معزی

الیه نے یه بشارت جانفزا اهالیان ڈیپوٹیشن کو دی که پنجاب یونیورسٹی کالج کو منصب کامل یونیورسٹی کا عطا کیا جاوے گا" - مطلب یه که یه منصب اس موقع پر عطا هو گیا - اسی اشاعت میں قیصری دربار دهلی کی بڑی تقریبوں اور عطاے خطابات وغیرہ کا ذکر ہے —

اسی پرچے سے یه خبر آج کل کے تعلیمی اداروں کے لئے دلچسپ ثابت هوگی - لکھا هے :—

"امتحان فرست آرٹس میں کالجہاے پنجاب نے نمایاں کامیابی اختیار کی" —

آپ یه معلوم کرنے کو بیتاب هوں گے که یه "نمایاں کامیابی" کیا تھی سنئے صوبۂ پنجاب میں اس وقت دو کالج تھے ایک لاهور کا گورنمنٹ کالج جہاں سے آٹھه طلبا اس امتحان میں پاس هوے - دوسرا دهلی کالج جہاں سے چار پاس هوے - یه بارہ کی میزان کل اس وقت نمایاں کامیابی سمجھی جاتی تھی —

یہی پرچه ایک خبر "نظام دکن کی فیاضی" کی سناتا هے که :-
"نظام دکن نے جاتے وقت پونا میں قیام کیا تھا [دهلی جاتے وقت] ایک مندر کی تعمیر کے واسطے ڈیڑھ هزار روپیه مرحمت فرمایا یه امر بے تعصبی پر دال هے" - لاهور کی شاهی مسجد کی مرمت سے متعلق چندے کی فہرست آپ دیکھه چکے هیں یه خبر اس کا کتنا موزوں متقابل هے -

هندوستانیوں کا 'جوتا' بھی معلوم هوتا هے گزشته زمانه میں ایک وقیع اور اهم سیاسی اور قومی مسئله تھا - اس سے پہلے دور میں اس کا ذکر آیا هے اب نو فروری سنه ۷۷ کے پرچے میں اخبار انجمن پنجاب "پھر وهی جوتا" کے عنوان کے نیچے ایک واقعه کا ذکر کرکے ایک لمبا

اور کرارا مضمون پیش کرتا ہے - واقعہ یہ ہے کہ یکم جنوری سنہ ۷۷ کو دہلی میں وایسرائے نے دربار قیصری کیا تھا - اسی سلسلے میں جگہ جگہ لوکل افسروں نے دربار یا جلسے کئے - چنانچہ مرادآباد میں بھی ایسا ہوا جب میر ظہور حسین وکیل ہائی کورٹ دربار میں جانے لگے تو اُن سے کہا گیا کہ جوتا اُتار کر جائیں - انہوں نے دریافت کیا کہ یہ کس کا حکم ہے - کئی مرحلے طے کرنے کے بعد انہیں معلوم ہوا کہ یہ حکم " صاحب اسسٹنٹ کلکٹر بہادر " کا ہے - چنانچہ میر صاحب نے ان سے دو بدو ہو کر کہا کہ " اگر ایسا حکم ہے تو ہم دربار میں شریک نہ ہوں گے - صاحب نے کہا کہ اچھا ہم آپ کو اجازت دیتے ہیں پس میر صاحب جوتا پہن کر دربار میں شریک ہوے " —

اس پر اخبار کا نوٹ ہے کہ :- " اس موقع پر اگر میر صاحب کو یہ خیال ہوتا کہ کون حجت کرے کہیں ہم کو دربار میں شریک ہونے سے ممانعت نہ ہوجاے تو ہرگز اس وقت یہ مرحلہ طے نہ ہوتا اور ذلت کے ساتھہ میر صاحب کو جوتا اتارنا پڑتا - حال کے ایک واقعہ سے شبہہ ہوتا ہے کہ یا تو ہندوستان کا جوتا ابھی تک نوک پان سے درست ہے یا یہ کہ تاریخ اپنے تئیں دہراتی ہے - کیونکہ ابھی ۱۹ اکتوبر سنہ ۱۹۳۴ ع کا تار جو ' منماد ' سے آیا خبر دیتا ہے کہ ماسٹر تارا سنگھہ کو جب کرپان کی علت میں عدالت میں پیش کیا گیا تو پولس نے زبردستی ان کے جوتے اُتار ڈالے - (تریبیون ۲۱ اکتوبر سنہ ۱۹۳۴)

۲۳ فروری سنہ ۷۷ کا اخبار انگلشمین کے حوالے سے آریہ سماج کے قایم ہونے کی خبر دیتا ہے - لکھتا ہے :-

" کل صاحبان ہنود کے لئے آریہ سماج کے قایم ہونے کی خبر نہایت

فرحت انگیز ہوگی - اس کی اصلی غرض یہ ہے کہ علم شریف بید کو اس کی اصلی حالت پر لانے کی کوشش کرے - اور اس مطلب کے حصول کے لئے مراتب مندرجہ ذیل عمل میں لائے اول ایک سماج ہر ایک احاطہ میں قایم ہوگی اور اوس کے ماتحت بڑے بڑے شہروں میں کمیٹیاں قایم ہوں گی - دوم مدارس اس غرض سے کھولے جائیں گے کہ مردوں اور عورتوں کو بید کی تعلیم دی جاوے - سوم کتابیں چھاپی جاویں گی چہارم رسالجات اس غرض سے - پنجم فاضل پنڈت ملک کے مختلف مقامات میں اس غرض سے بھیجے جاویں گے کہ لوگوں میں شاستر کا اچھی طرح سے وعظ کریں " —

اس پر اخبار انجمن پنجاب کا ہمدردانہ اور معرفانہ نوٹ ہے —

یہی اشاعت قدیم دہلی کالج کے ٹوٹنے کی خبر اس طرح دیتی ہے : —

" دہلی کالج کی موقوفی آخر گورنمنٹ نے منظور کرلی اور سرکاری کارروائی اس باب میں پنجاب گورنمنٹ گزٹ میں چھاپی گئی " —

۲ اپریل سنہ ۷۷ کے اخبار سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک رسالہ ' ہندو باندھو ' تین سال سے پنڈت شونراین اگنی ہوتری ڈرائنگ ماسٹر لاہور گورنمنٹ سکول نے اہل ہنود کے لیے جاری کیا تھا - اخبار اس کی افادت کے اعلان کے ساتھہ اس کی اعانت کے لیے اپیل کرتا ہے —

۱۳ اپریل سنہ ۷۷ کا اخبار " انڈین انسٹی چیوٹ بغرض تعلیم روسازادگان ہندوستان در یونی ورسٹی ہائے انگلینڈ و تعلیم دیگر علوم مفیدہ یعنی تعلیم سول سروس و انجینیری و زراعت وغیرہ وغیرہ " کی خبر دیتا

ہے - تعلیم سروس مفیدہ تو تھی اور اب بھی ہے لیکن اسے علوم میں شامل کرنا لکھنے والے کی ایجاد بندہ ہے - یہ تحریک ڈاکٹر لائٹز کی تھی جو چلی ہی نہیں —

۱۱ مئی سنہ ۷۷ کا اخبار "پنجاب یونیورسٹی" کا عنوان دے کر "رپورٹ بابتہ از سر نو مرتب ہونے علم مشرقی کالج اور سکول کے" درج کرتا ہے - عربی کے استادوں کی ذیل میں پہلا نام مولوی فیض الحسن کا ہے اور اخیر نام مولوی محمد حسین کا ہے - ان کے نام کے آگے "مولوی شیعہ" لکھا ہوا ہے - اس اعتقادی اعلان کی نہ معلوم کیا ضرورت لاحق ہوی -

۱۸ مئی سنہ ۷۷ کا اخبار - اب روس اور روم کی خونریز جنگ چھڑ گئی - یہ اخبار 'مدراس میل کے حوالے مخالفین کی باقاعدہ فوج اور متعلقین کی یہ تعداد لکھتا ہے :- روسی فوج علاوہ سپاہ واقع پولینڈ و بالٹک و گارڈز ایک لاکھ اور ترکی کی فوج چار لاکھ تیس ہزار شمار کرتا ہے - یہ اشاعت قریباً سب کی سب اس جنگ کے مضامین کی نذر ہے - سول ملیٹری گزٹ کے ایک مضمون یا نوٹ کا ترجمہ اس طرح شروع ہوتا ہے :—

"بحالیکہ روسی ترکی واقع ایشیا کو اپنے ملک میں شامل کرنا چاہتے ہیں لندن کے وزرائے کنسرویٹو کی یہ رائے ہے کہ مغایرت اختیار کی جاوے - اس صورت سے ہم نہیں سمجھ سکتے کہ انگریزی حقوق کس طرح محفوظ رہ سکتے ہیں کیا جماعت وزرائے انگلینڈ میں نہ کوئی سپاہی رہ گیا ہے نہ کوئی مدبر کہ بتاوے روس جو اس ملک کو فتح کرنا چاہتا ہے تو اوس کی نیت انگلینڈ کی نسبت کیا ہے" —

۴ مئی سنہ ۷۷ کا اخبار لاهور میں سوامی دیانند سرستی کے ورود کی خبر ان الفاظ میں مشتهر کرتا هے :—

"لاهور میں ویدوں کے ایک مشهور عالم و فاضل سوامی دیانند سرستی صاحب تشریف لائے هیں اور ویدوں پر لکچر دیتے هیں ان کے علم و فضل اور وسعت معلومات کا یہ حال هے کہ ایک دریا هے کہ امڈا چلا آتا هے ... ... پنڈت صاحب باغ دیوان رتن چند مرحوم میں مقیم تھے- اب خان بہادر ڈاکٹر رحیم خاں صاحب نے کہ بڑے علم دوست هیں اپنی کوٹھی اون کو فروکش هونے کے لیے دی هے —

جنگ روم و روس کے معاملہ میں ایشیا تک ترکی اور سب سے بڑھ کر افغانستان نہایت مشکل قضیہ تھا معلوم هوتا هے قسطنطنیہ کے اخبار دارالخلافۃ استنبول اور کراچی کے مفرح القلوب نے اس قضیہ کو اور پیچیدہ کر دیا - یہ دونوں اخبار فارسی زبان کے تھے جس کا ذکر آگے آچکا هے - اخبار انجمن پنجاب مورخہ ۸ جون سنہ ۷۷ کا افتتاحیہ "امیر کابل - گورنمنٹ انگلشیہ اور روس" کے عنوان سے اس قضیہ پر طویل اور مفصل بحث کرتا هے —

اسی تاریخ یعنی ۸ جون سنہ ۷۷ کا لوکل تاریخی اهمیت رکھتا هے - لکھا هے کہ " یکشنبہ گزشتہ کو هال انجمن پنجاب میں بابو سریندر ناتھ صاحب بزجی سابق متعلق سول سروس هندو ممبر برٹش انڈین ایسوسی ایشن کلکتہ نے ایک نہایت پر تاثیر و فصیح لکچر زبان انگریزی میں قومی اتفاق پر دیا- اس لکچر کے سننے کے لیے ایک گروہ کثیر تعلیم یافتہ نوجوانان پنجاب و دیگر معززین شہر کا جمع تھا - لکچر در حقیقت نہایت

زور و شور کی تھی" —

اس کے اگلے دن یعنی ۴ جون سنہ ۷۷ ع کو مقام سکشا سبھا میں ایک عظیم الشان جلسہ ہوا جس کو اہل پنجاب کا پہلا سیاسی مجمع کہنا چاہئے - رائے بہادر مول سنگھ صاحب وئیس و آنریری میجسٹریٹ لاہور اس جلسہ کے صدر تھے - محب وطن سردار دیال سنگھ مجیٹھیہ نے اول تجویز یہ پیش کی :—

"برٹش انڈین ایسوسی ایشن کلکتہ نے سول سروس کے معاملہ میں جو کارروائی کی ہے اوس کو اس جلسہ کے ممبر بے کم و کاست منظور کرتے ھیں اور افسوس کرتے ھیں کہ انڈین سول سروس کے امتحان میں شریک ہونے کے لئے جو قواعد امیدواروں کی عمر سے متعلق تھے حال میں اون میں تغیر و تبدل کیا گیا - اس جلسہ کے ممبروں کی یہ رائے ہے کہ جو اشخاص سول سروس کے امتحان میں شریک ھوں ان کی عمر زیادہ سے زیادہ بائیس سال کی قرار پائے اور انیس سال کی حد جو اب مقرر کی گئی ہے وہ منسوخ ھو جائے" —

خان بہادر محمد برکت علی خاں اور خان بہادر ڈاکٹر رحیم خاں نے اس تجویز کی تائید کی دوسری تجویز اس جلسے نے یہ منظور کی :—

"اس غرض سے کہ ھندوستانی امید واروں کا سول سروس میں داخل ھونا آسان ھوجائے اس جلسہ کے ممبروں کی یہ رائے ہے کہ کل عہدوں میں سے کسیقدر عہدوں کے لئے جنکی تعداد معین ھوجائے امیدواروں کا امتحان ھرسال ھندوستان کے کسی ایک یا ایک سے زیادہ وسطی مقاموں میں ھوا کرے"—

اس تجویز کے محرک ڈاکٹر سورج مل اور تائید کرنے والے ماسٹر پیارے لال اور سید نادر علی شاہ سیفی تھے - اسی جلسے میں ایک میموریل بھی منظور اور اختیار کیا گیا جو پارلیمنٹ میں پیش کرنے کی غرض سے تھا - اس میموریل پر پبلک کے دستخط کرانے کے لئے ایک کمیٹی مقرر ہوئی جس میں سردار دیال سنگھ مجیٹھیہ اور منشی ہرسکھ رائے کے علاوہ سرکاری عہدے دار بھی شامل تھے —

۲۴ اگست سنہ ۷۷ ع کے اخبار میں ایک صاحب جہلم سے علی گڑہ کے مشہور رسالہ تہذیب الاخلاق کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :--

"جس قدر دل سوزیاں عرق ریزیاں اسکے راقموں سے اپنی قوم کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لئے ظہور میں آئیں وہ سارا جہاں جانتا ہے - سید احمد خاں صاحب نجم الہند کو جنھوں نے اپنی جان مال عمر اسی قومی بھلائی اور اسلام کی سچی خیر خواہی میں صرف کی ہے اگر حجت اسلام کہا جاوے تو بجا ہے" —

۱۲ اکتوبر سنہ ۷۷ ع کا لوکل ان اشعار سے شروع ہوتا ہے :—

شکر ہے لاہور میں بھی ابر باراں ہو گیا
آجکل پنجاب بارش سے گلستاں ہو گیا

بلبلیں فرحت سے گاتی ہیں یہ مصرع بے بدل
غنچہ پژمردہ تھا اے لو آج خنداں ہو گیا

ایسی بارش ہوگئی جو کھیتیوں کو ہے مفید
زندگی کا اے غریبو اب تو ساماں ہو گیا

۲ نوبر سنہ ۷۷ ع کے اخبار میں ایک لمبی مراسلت درج ہے جس کا علوان ہے " فاحشہ عورتوں کے متفرق جگہ شہر میں رہنے سے بہت

بڑے نقصان ھیں'' - پایا جاتا ھے کہ یہ تحریک زمانۂ حال کی، نہیں بلکہ پرانی ھے —

۲۴ نومبر سنہ ۷۱ ع کا اخبار ھند کے مطالبات پر ایک اھم مضمون پیش کرتا ھے جو نظام الدولہ نواب حاجی محمد مردان علی خاں بہادر کا لکھا ھوا اور دربار دھلی کی نسبت تھا - اخبار کا اڈیٹر ان مراعات و مطالبات کو بہ حیثیت مجموعی پسند کرتا ھے - مضمون طویل ھے صرف مطالبات ملاحظہ ھوں :--

" سرکار کمپنی تاجر تھی مگر اب دور شاھنشاھی ھے اسلئے برتاؤ بھی شہنشاھی چاھئے - یہ دربار کھیل تماشے کے واسطے نہیں ھے - روساء کی رضامندی پر نصف ھند بلکہ کل ھند کی رضامندی منحصر ھے " ان الفاظ کے ساتھ نواب صاحب مطالبات کی یہ فہرست پیش کرتے ھیں :—

(۱) جیپور کو نصف سانبھر - واپس ملے —

(۲) مارواڑ کو نصف سانبھر - علاقہ تالاب عمر کوٹ مگھرامبر واڑہ واپس ملے —

(۳) گوالیار کو قلعہ گوالیار —

(۴) اودے پور کو علاقہ گنگا پور وغیرہ سوائے نیمچ کے —

(۵) نظام دکن کو برار واپس ملنا چاھئے —

اس مضمون کے یہ الفاظ بھی قابل غور ھیں : —

" بعہد سابق دیسی ارکان کے کام اور انتظام کا یہ نتیجہ تھا کہ سرحدیں مستحکم تھیں رعایا خوش حال تھی اور صرف تیس کروڑ آمدنی ملک میں تھی - دس لاکھہ فوج تھی اور اس پر شاھی خزانہ اور کارخانہ معمور رھتے تھے - عجب ھے کہ اب

ترپن کروڑ [آمدنی میں] صرف دو لاکھہ ساتھہ ہزار فوج
اور سرکار پر باوجود اجرائے نوٹ کے از حد قرض - ع - ببیں
تفاوت رہ از کُجاست تابہ کُجا - سالانہ بجٹ خوب بنتا ہے
مگر جب بچت نہیں تو محض لفافہ ہے - بارگ ماسٹری اور
کمسریٹ اور مہم وغیرہ میں کروڑوں پر پانی پھر جاتا ہے
جس کا حال سنکر حیرت ہوتی ہے - سرکار ایسی لٹھہ لٹ
ہے کہ پنڈارہ کی لوٹ بھی اس صیغہ نے مات کردی " —

۱۳ جون سنہ ۱۸۷۹ ع کی اشاعت میں ایک نہایت مفید اور دلچسپ
مضمون ہے جس کا عنوان ہے " ہند میں سب کچھہ ہے لیکن صنعت
و حرفت نہیں " - ابتدا میں یہ شعر درج ہیں اور آگے چلکر موقع
بہ موقع اسی زمیں کے اشعار نثر میں ملے ہوئے ہیں - ان اشعار کی
ایک خاصی نظم بن جاتی ہے ملاحظہ ہو -

دل ساکنان ہند سے کیونکر خفا نہ ہو
افسوس یاں تو صنعت و حرفت ذرا نہ ہو
ہر شخص کو وہاں کے یہی دھن ہے رات دن
ممکن ہے کوئی بات نئی ڈھونڈھتا نہ ہو
طاقت ہے یورپیلوں کی شے ہو نہیں لطیف
ممکن ہے ہند کی کوئی شے بدنما نہ ہو
تشبیہ ان کی دیتا ہوں اس جانور سے میں
آنکھیں تو کھل رہی ہوں ولے دیکھتا نہ ہو
اعضا ترے درست ہوں پھر لوموی بنے
اے بے حجاب تجھہ کو ذرا بھی حیا نہ ہو

گر یہ ہی حالتیں دل وحشی تری رہیں
کیا جانے کیا ہو دیکھیئے کیا جانے کیا نہ ہو
مشکل وہ کونسی ہے جو آساں نہ ہو کبھی
افسوس دل سے چاہو اگر تم تو کیا نہ ہو
بلبل بھی نالہ سنتے ہی بیدار ہو گئی
اے بے خبر خبر تجھے مطلق ذرا نہ ہو

تجدید شاعری کا یہ دل کش ثمر آپ نے ملاحظہ کیا۔ اسی کے لئے آزاد مرحوم برسوں سے تردد کر رہے تھے —

۲۰ جون سنہ ۷۹ کا پرچہ "انڈین ٹریبیون" سے ماخوذ ایک خبر درج کرتا ہے جس میں ایک اہل فرنگ کے ہاتھہ سے ایک ہندوستانی مارا گیا تھا اور چیف کورٹ سے ملزم بری ہوگیا۔ یہ خبر اس عنوان کے تحت درج کی گئی ہے :-

"ہماری جان گئی آپ کی ادا ٹھہری"

سر شتہ تعلیم پنجاب کے ڈائرکٹر کرنل ہالرایڈ اور پنجاب یونیورسٹی کے رجسٹرار ڈاکٹر لائیٹنر کی کبھی نہ بنی۔ اور دو مضبوط پارٹیاں قایم ہوگئیں ایک سررشتہ تعلیم اور بک ڈپو کی اور دوسری پنجاب یونیورسٹی کی۔ جب آزاد نے جو سررشتہ تعلیم سے متعلق تھے نئی شاعری کی بنیاد ڈالی اور مقررہ موضوع کے ساتھہ مناظمہ کا ڈھنگ نکالا تو یونیورسٹی کی پارٹی نے پرانی چال کا طرحی مشاعرہ شروع کردیا۔ مگر اس سے مناظمہ کو کوئی نقصان نہ پہنچا ۲۰ جون سنہ ۷۹ کا اخبار انجمن پنجاب ایک "اشتہار انجمن مشاعرہ بیت العلوم پنجاب لاہور" شایع کرتا ہے۔ اس کے مشاعرے رسالہ کی شکل میں چھپا بھی کرتے تھے اور لوگوں کی غزلیں

اردو فارسی - عربی - سنسکرت - هندی - پنجابی اور پشتو میں هوا کرتی تهیں یعنی جن جن زبانوں کے امتحان یونیورسٹی کی اورینٹل فیکلٹی کے تحت هوا کرتے تھے —

۲۷ جون سنہ ۷۹ کے اخبار میں صنعت و حرفت کا پھر تذکرہ آتا هے جس میں بہت سے همعصروں کو خطاب کر کے اس بارے میں اتحاد عمل کی دعوت دی گئی هے —

۱۱ جولائی سنہ ۷۹ کا اخبار پیسے کے پوسٹ کارڈ کا خیر مقدم اس قطعہ کے ساتھہ کرتا هے —

هے لفافہ بھی اور زر محصول اور فضولی کو تھام دیتا هے
خط بھی هے اور نامہ بر بھی هے یہ ٹکٹ پانچ کام دیتا هے

اکمل الاخبار دهلی

۱۳ اپریل سنہ ۷۰ کا اکمل الاخبار یہ خبر دیتا هے " گورنمنٹ انڈیا کا مجوزہ بل متعلق یو - سی - ایس دوس اف کا ملز میں دوسری دفعہ سماعت هوا - اس کے پاس هونے پر لایق اشخاص بغیر امتحان کے سول سروس میں لیے جائیں گے " -

۲۰ اپریل سنہ ۷۰ کا اخبار " سالانہ حساب سلطنت هند " پر بحث کرتے هوے لکھتا هے :-

" بے شک جو لوگ گورنمنٹ کے خیر خواہ اور رعایا کے طالب فلاح هیں وہ هرگز اس بجٹ کو پسند نہیں کریں گے کیونکہ ایسا نظام کس کام کا کہ بے جنگ و جدال کے سال میں بھی خزانہ شاهی پر اختلال اور پے در پے انکم ٹکسی دیتے دیتے رعایا شکستہ بال کا برا حال هے - جب سال گزشتہ کا بجٹ نکلا تھا اس وقت تمام لوگ اس سبب سے ناخوش هوے

تھی کہ باوجودیکہ سرکار دولت مدار کی طرف سے ولسن
صاحب نے بڑے شد و مد کے ساتھہ اقرار کیا تھا کہ پانچ برس
کے بعد یہ انکم ٹکس نہیں لیا جاے گا پھر سر رچرڈ تمپل صاحب
نے ایک روپیہ انکم ٹکس مقرر کیا اوس کے بعد اوسی سال کے
اندر اس کو دونا کیا گیا لیکن اس کے ساتھہ بھی لوگوں نے
طوعاً و کرھاً اس کو مان لیا اور رو پیٹ کر چھہ مہینے
ایک روپیہ کے حساب سے جملہ ڈیڑہ روپیہ کے ادا کیا اور یہ
سمجھا کہ اب کوئی لڑائی بھڑائی جدال قتال نہیں ہے
سو آئندہ سال جیسا کہ جناب گورنر جنرل وایسراے بہادر
نے وعدہ فرمایا ہے اور انکم ٹکس دینا نہیں پڑے گا - سو جناب
سر رچرڈ تمپل صاحب بہادر مشیر مال کے حسن تدبیر کے
سبب یہ ہوا کہ ایک روپیہ کے بدلے تین روپیہ دو آنہ سیکڑہ
دینا پڑا - سر رچرڈ تمپل صاحب بہادر نے اپنے حساب کتاب اور
منصوبے کو ایسا چھپا رکھا کہ گویا اس کے فاش ہونے میں
بالکل نظام بگڑ جاوے گا حالانکہ اگر اس قدر نہ چھپاتے اور
خرچ کی تفصیل شرح و بسط کے ساتھہ لوگوں کو سنا دیتے تو
غالب تھا کہ لوگ اتنے برہم نہ ہوتے اور اس ٹکس کے ادا
کرنے کو اتنا ناگوار نہ سمجھتے ... "—

اگلی اشاعت یعنی ۲۰ اپریل کے اخبار میں ایک بڑے مزے کا واقعہ
درج ہے جسے لطیفہ کہا گیا ہے - سنئے :—

کلکتہ کے ایک اخبار میں لکھا ہے کہ کل کے دن ایک عجیب
اور دلچسپ ماجرا یہاں کونسل میں واقع ہوا - تفصیل اس

اجمال کی یہ ہے کہ جس وقت لیجس لیٹف کونسل کے ممبر انکم ٹکس اور اور معاملات کی بابت باہم مباحثہ کر رہے تھے ڈاکخانہ کے ایک چپراسی نے ایک پارسل جناب سر رچرڈ تمپل صاحب بہادر کے حوالہ کیا اس وقت صاحب ممدوح نے جانا کہ اس میں نقشے اور حکم نامہ واپسی ہونگے مگر جب کھول کر دیکھا تو اس میں ایک خالی ڈبیا دیا سلائی کی نکلی - اس وقت صاحب موصوف بہت محجوب ہوئے اور چونکہ اس وقت کوئی موقع اس کے چھپانے کا نہ تھا لہذا صاحب ممدوح نے اس کو اور ممبران کو دکھایا اور یہ لطیفہ نسبت اور ممبروں کے جناب مستطاب معلے القاب لارڈ میو صاحب بہادر کو از حد پسند آیا " —

اس واقعہ پر اکمل الاخبار کا حاشیہ ملاحظہ ہو :—

" اکمل الاخبار - کسی ظریف نے عین موقع پر دیا سلائی کی ڈبیا یا تو بایں مراد بھیجی ہوگی کہ صاحب آپ کے محکمہ میں اندھیرا ہے روشنی کیجے یا کسی جلے بھنے نے انکم ٹکس سے جلکر یہ ایما کیا ہوگا کہ بجٹ کے کاغذات کو جو ہر سال غربا کے گلے پر چھری پھیرتے ہیں اور اس فکر میں ہیں کہ تسمہ لگا نہ رکھیں آگ لگائیے - مگر افسوس ہے کہ وہاں وہی ظلمت رہی اور سر رچرڈ تمپل صاحب بہادر کے عرق خجالت سے دیاسلائیاں سیل گئیں"۔

۲۵ مئی سنہ ۷۰ کے اخبار میں سید جمشید علی مہتمم مطبع آفتاب ہند مراد آباد اپنے نکلنے والے اخبار جام جمشید کا اشتہار ساقی نامہ سے شروع کرتے ہیں - فرماتے ہیں :—

" پلا ساقیا ساغر جم مجھے کہ علم و ہنر کا ھے ماتم مجھے "

یہی اشاعت لندن کے ہیلموور سکوائیر کے ایک جلسہ کا ذکر کرتی ھے جو عورتوں نے اپنے حقوق اور مطالبات پر زور دینے کی غرض سے کیا تھا بقول اکمل الاخبار بی بی - پی - آئی تیلر صاحبہ اس جلسے کی صدر نشیں تھیں " تقریر بی بی صاحبہ " یعنی صدر جلسہ اس جملہ سے شروع ہوئی :—

" اے حاضرین جلسہ یہ بڑے اندھیر کی بات ھے کہ مرد عورتوں کے دشمن ان کی نسبت یہ الزام لگاتے ھیں کہ مظلوم مستورات اوس حق آزادی کے قابل نہیں جو مردوں کو حاصل ھے " -

اس جلسہ میں اکثر فاضل اور معزز مرد بھی موجود تھے - بعض مردوں نے بھی تقریریں کیں - بعض نے جواب دئے - جان سٹوارٹ مل بھی اس جلسے میں تھے انہوں نے کہا بہ قول اخبار " بی بی زیب انجمن صاحبہ کی اس تقریر کو سن کر مردوں کی جانب سے جواب دیا " :—

" اے میم صاحبہ - عورتوں کی نسبت بعض فاضلوں کی یہ راے ھے کہ عورتیں سلطنت کے کاروبار میں اگر دخل پا جائیں گی تو حکومت میں مذہبی تعصب کو فروغ ہوجائیگا اس لئے کہ عورتوں کے دلوں پر مردوں کی نسبت پادری صاحبوں کی نصیحت اور مذہبی ہدایت کا زیادہ اثر ہوتا ھے اور پادری صاحب بڑی محنت اور کوشش سے زیادہ تر عورتوں کے دلوں پر اپنا تصرف کرتے ھیں جس سے ممکن ھے کہ عورتیں دوسرے مذہب والوں کو بھی تعصب کی نظر سے دیکھنے سکیں اور نتیجہ اس کا یہ نکلے کہ انجام کار سلطنت میں خلل واقع ہو " —

جان مل نے یہی بات اپنی کتاب سبجکشن اف ومن میں بھی لکھی ھے -

یا سفریجٹ تحریک بیسویں صدی کے دوسرے قرن کے اوایل میں شروع ہوئی تھی وہ زوردل پر تھی کہ جنگ عظیم کے بادلوں نے دنیا کی فضا کو گھیر لیا - جنگ کے بعد آپ نے دیکھا کہ اس قسم کی کسی تحریک کی ضرورت ھی باقی نہ رھی - غرض کہ حال کی تاریخ میں عورتوں کے سیاسی حقوق کے مطالبہ سے متعلق یہ پہلی باضابطہ کوشش تھی - " بی بی صاحبہ " وغیرہ الفاظ جو اکمل الاخبار کے اڈیٹر نے استعمال کئے ان سے پایا جاتا ھے کہ اسے عورتوں کے معاملہ میں بہت ھی جھجک اور شرم عارض حال تھی -

۲۲ جون سنہ ۷۰ کا اخبار آگرہ کی خبر لکھتا ھے کہ ۱۴ جون کو " کمشنران آراستگی شہر (اس سے مطلب ھے میونسپل کمشنر) غیر ملازم صاحبان انگریز اور ایک انبوہ رئیسان و ساکنان ھندوستانی کا انکم ٹکس کی بابت دلایل پیش کرنے کے لئے مجتمع ھوا " —

ریل اور گھوڑے کا مقابلہ

اب سے چونسٹھہ برس پہلے آپ کی ریلوں کی رفتار کیا تھی اور یہ کہ سادات بارہ جو شہنشاہ اورنگ زیب کے بعد برسوں بادشاہ گر رھے انگریزی عہد میں بادشاہ گری تو نہ کرسکے لیکن ان کے راج کے بڑے معجزے یعنی ریلوے انجن کو شکست دئے بغیر نہ رھے - اس کی کیفیت ۲۰ جولائی کے اخبار میں اس طرح درج ھے :-

" سادات بارہ میں سے ایک صاحب کے پاس عجیب گھوڑا حرحرتگ ھے چنانچہ ایک صاحب جلیل القدر ملازم ریل سے یہ شرط ٹھہری کہ اسٹیشن کھتولی سے اسٹیشن مظفر نگر تک جو چودہ میل کا فاصلہ ھے گھوڑا ھمراہ ریل دوڑایا جاوے اور گھوڑا پیچھے رھا تو مالک اسپ ھزار روپیہ دیوے - اگر گھوڑا

بڑھ گیا تو هزار روپیه صاحب ملازم ریل سے لیا جاوے اس شلمه کو گھوڑا همراه ریل کے دوڑا - ریل سے گھوڑا $\frac{1}{3}$ میل آگے تھا - صاحب ملازم ریل نے شرط هار کر هزار روپیه میر صاحب کی نذر کئے میر صاحب نے ازروے دریا دلی وه روپیه صاحب کو پھیر دیا " —

۲۷ جولائی سنه ۷۰ کا اخبار فرانس اور پرشیا کی جنگ کے باعث کے متعلق بحث کرتا ہے - لکھا ھے :-

" شاه فرانس نے شاه پروشیا سے یه درخواست کی تھی که پروشیا کے شاهزاده هوهن زولرن کو تخت سلطنت هسپانیه پر بیٹھنے سے باز رکھا جاوے ورنه تمام ملکی معاملات باهمی همارے تمھارے قطع هو جائیں گے - اب بذریعه تار برقی معلوم هوا که پروشیا والوں نے درخواست مذکور شاه فرانس کی قبول کرلی مگر شاه فرانس کے جوباد نخوت نے زور کیا یه جی میں سمائی که اب پروشیا والوں سے یه درخواست کیجئے که شاه پروشیا یه ضمانت دے که آئنده کبھی هسپانیه میں شاهزاده پروشیا کے بادشاه هونے کی درخواست نه کی جاوے گی - واضح هو که یه اخیر درخواست شاه فرانس کی طرف سے ایسی هوئی که طبقۂ یورپ کی چھوٹی چھوٹی قوم کو بھی غضبناک کردے - جب یه پیغام شاه فرانس کا قاصد لے کر پروشیا میں گیا شاه پروشیا اوس وقت ایک ایڈ جو ٹینٹ (افسر فوج) کے همراه باغ میں سیر کر رھا تھا قاصد پیغام سنا کر جواب کا ملتجی هوا بادشاه پروشیا نے پیٹھه پھیر کر جواب دیا که اس کا کچھه جواب نہیں - جب قاصد بضد هوا ایڈجوٹینٹ نے اوس کو جھڑک کر نکال باهر کیا - اتنی بات

کے ہوتے ہی شاہ فرانس کا مدعا حاصل ہوا - مدتوں کا رخنہ
جو شاہ پروشیا کی طرف سے اوس کے دل میں تھا اب نکل آیا
یعنی اسیوقت پیرس دارالسلطنت فرانس کو بذریعہ تار برقی
خبر گئی وہاں اس خبر کے پہنچتے ہی لڑائی کی تیاریاں
شروع ہوگئیں - اودھر شاہ پروشیا بھی غافل نہیں تھا ... " -

اس لمبی عبارت کے نقل کرنے سے میرا یہ منشا ہے کہ چونکہ اس میں وہ واقعات تفصیل کے ساتھہ معاصرانہ حیثیت سے بیان کئے گئے ہیں جو فرانس اور پرشیا کی جنگ سے عین ماقبل پیش آے اور تاریخی طریق پر ایک بڑی لڑائی کا فوری سبب قرار دیے جاسکتے ہیں حالانکہ قریب کے زمانے کے مورخ ہم کو یہ بتاتے ہیں کہ 'فرینکو پرشین وار' کا اصلی سبب ابھی تک نا معلوم ہے - میں نہیں جانتا اصلی اور کیا ہوتا ہے اور کسے کہتے ہیں - کل کو کوئی یہ کہدے گا کہ اس جنگ عظیم جرمن کا اصلی سبب نا معلوم ہے - چنانچہ لارڈ ایکٹن نے عہد حاضر کی تواریخ کے پروفیسر کی حیثیت سے جو لکچر ۱۱ جون سنہ ۱۸۹۵ ع کو کیمبرج یونورسٹی میں دیا اس کا ایک حصہ اس کا ثبوت ہے - انہوں نے کہا :-

" Even of a thing so memorable as the War of 1870, the true cause is still obscure; much that we believed has been scattered to the winds in the last six months, and further revelations by important witnesses are about to appear."

ان کا ظہور آج تک نہ ہونا تھا نہ ہوا - بات یہ ہے کہ پالسی کے ساتھہ تواریخی علت اور سبب بھی بدلتے رہتے ہیں --

انکم ٹیکس معلوم ہوتا ہے پبلک کو بہت ہی ناپسند تھا - ۳ اگست

کے اخبار کا یہ لطیفہ بھی خوب دلچسپ ہے :-

" پایونیر الہ آباد ناقل ہے کہ ممالک مغربی و شمالی [صوبہ متحدہ آگرہ] میں یہ مشہور ہے کہ یہ نیا ٹکس بسبب تشریف آوری ڈیوک آف ایڈنبرا کے لگا ہے اور دعا کرتے ہیں کہ ملکہ معظمہ کو خدا اپنے لڑکوں سے اتنی محبت دے کہ آیندہ اپنے بچوں کو ہندوستان میں نہ بھیجیں " —

یہی اشاعت ایک اور عجیب و غریب ٹیکس کی خبر دیتی ہے جو الہ آباد کی میونسپل کمیٹی نے ہندوؤں کے مردوں پر لگا یا تھا - یعنی جتنی لاشیں گنگا اور جمنا کے کنارے پر جلائی جاتیں ان کے لئے فی لاش ڈھائی روپیہ لیا جاتا تھا - اس کے خلاف بہت زور سے صداے احتجاج بلند کی گئی —

۱۰ اگست سنہ ۷۰ کا اخبار آج کل کے سیاس اور بجٹ کے مبصروں کے لئے سرمۂ بصیرت کا حکم رکھتا ہے - نیم جوشی اور گوکھلے مرحوم نے اگر یہ تحریر دیکھی ہوتی تو ضرور تسلیم کرتے کہ بجٹ اور ہوم چارجز پر بیسیوں برس پیشتر غریب اردو اخباروں کی نظر تھی - یہ تحریر اخبار مذکور کے صفحہ ۲۵۰ پر ہے ۔ عنوان ہی آج کل کے اہالی صحافت کو چونکانے والا ہے - ملاحظہ ہو :—

" ہندوستان کی کمائی انگلستان نے کھائی "

تحریر کیا ہے اعداد و شمار کی طویل فہرست ہے جسے چھوڑ دیا جاتا ہے - یہ جملہ ملاحظہ کے قابل ہے :-

" منجملہ ان اخراجات کے ایک یہ ہے کہ جناب ڈیوک آف ایڈنبرا نے ہندوستان کے روسا کو ہدیہ دینے کے لئے جن جھزوں

کو مول لیا تھا اور اون کی خدمت میں حاضر ہونے کے لئے
جتنے عہدے دار سب لندن سے کلکتہ آے تھے اون کے جہاز کے
کرایے میں مبلغ ایک لاکھہ آتھہ سواسی روپیہ خرچ ہوا تھا"۔

انکم تیکس لوگوں کو تو ناپسند تھا ہی ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے قواعد ضرور ناواجب طور پر سخت اور غیر معقول ہوں گے۔ کیونکہ اخبار یہ خبر دیتا ہے کہ :—

"۲۸ جولائی کو لندن سے تار برقی پر یہ خبر آئی کہ ۲۷ تاریخ
کو چند ممبران پارلیمنت اور وہ صاحب لوگ جو ہندوستان سے
کچھہ تعلق رکھتے ہیں جمع ہوے۔ مستر چارلس تریولین صاحب
پریسیڈنت نے گورنمنت ہند کی دو باتوں پر اعتراض کیا اور
کہا کہ اول تو فوج زیادہ ہے دویم رفاہ عام کے کاموں میں
بیجا صرف کیا۔ اس مجمع نے متفق اللفظ تکس کے قواعد کی
مذمت کی اور یہ درخواست کی کہ ایک منتخب کمیتی
واسطے تحقیقات انتظام خصوصاً فنانشل ڈیپارتمنت کے مقرر ہو"۔

۵ اکتوبر سنہ ۷۰ کا اخبار مخبر ہے کہ :-

"پتھان کوت سے معلوم ہوا کہ وہاں ایک انگریز ڈاکو ہو گیا
ہے معہ چند ہندوستانی رفیقوں کے مسلح ہوکر ڈلہوزی کے رستہ
میں مسافرین کو مارتا ہے۔ اب تک یہ نہیں ثابت ہوا کہ
کسی انگریز پر بھی کوئی حملہ کیا یا نہیں"۔

۱۲ اکتوبر سنہ ۷۰ کے اخبار میں ایک پروگرام درج ہوا ہے جس سے پایا جاتا ہے کہ سندھ پنجاب دہلی ریلوے کمپنی نے ستلج پر جو پل بنایا تھا مکمل ہوگیا اور اس کے کھولنے کا شگون ۱۵ اکتوبر کو مہاراجہ

افتتاحی رسم

پتھالہ کریں گے - اس تقریب میں دھلی سے بھی چند رئیس بلائے گئے تھے -

اس مدت میں کوئی پرچہ فرانس اور پرشیا کی جنگ کی خبروں سے خالی نہیں نکلا - چنانچہ ۱۶ نومبر سنہ ۷۰ کا اخبار غباروں کی لڑائی کی خبر دیتا ھے - لکھا ھے :-

" فرانسیسیوں کی چالاکی میں شک نہیں جب غنیم نے انہیں زمین پر چین نہ دیا تو غباروں میں بیٹھ کر آسمان کی طرف اڑنے لگے مگر پرشیا والے ان کو پورے استاد ملے آسمان پر بھی ان کا جا تعاقب کیا ... " -

یکم مارچ سنہ ۱۸۷۱ کا اخبار 'برھمو سماج' کے ضابطہ پر ایک طویل مضمون درج کرتا ھے - ۱۹ اپریل سنہ ۱۸۷۱ کا پرچہ لکھتا ھے :-

" بہ بیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا - صاحب پایونیر لکھتے ھیں کہ سر سالار جنگ مدار المہام حیدرآباد اور ھمارے سر رچرڈ ٹمپل کے انتظام میں کس قدر تضاد ھے - ایک یہ ھیں کہ نئے نئے ٹیکس رعایا پر لگاتے ھیں ایک وہ ھیں کہ پہلے محصولوں کو موقوف کرتے جاتے ھیں - ھمارے تینوں احاطے ٹیکس کے ظلم سے نالاں ھیں اور قلمرو نظام اس بار گراں سے سبکدوش - اگرچہ حیدرآباد میں بھی میونسپلٹی ھے مگر وھاں مکانوں اور پیشوں پر ٹیکس نہیں بلکہ ایک محصول دو لاکھ پچاس ھزار روپیہ سال کا جو عرصہ سے پیشہ وروں پر جاری تھا گورنمنٹ نظام نے تین سال تک یک قلم موقوف کردیا " -

معلوم یہ ھوتا ھے کہ انکم ٹیکس باقاعدہ ایجی ٹیشن کے علاوہ مزاح کا بھی نشانہ بنا - چنانچہ ۱۰ مئی سنہ ۷۱ کا اخبار ایک مضمون درج کرتا

ہے جس کا عنوان ہے '' ناک پر تیکس ''- لکھا ہے یکم اپریل کو گورنر جنرل نے بہ اجلاس کونسل یہ ایکٹ پاس کیا کہ جو لوگ کسی قسم کا تیکس نہیں دیتے ان سے بھی تیکس لیا جاے گا اس ایکٹ کا نام ' ناک پر تیکس '' ہوگا - جو لوگ نکتے یا چپٹی ناک والے ہوں گے وہ اس تیکس سے مستثنی رہیں گے - مگر جو تیکس سے بچنے کے لئے اپنی ناک کتا لیں گے یا بگاڑ دیں گے وہ بموجب دفعہ ۱۰۲ تعزیرات ہند سزا پائیں گے '' - بڑے مزے کا اپریل فول ہے -

۲۰ ستمبر سنہ ۷۱ کا اخبار مسٹر فور سایتھ کمشنر جالندھر کی مفصل راے کا ترجمہ چھاپتا ہے جو انھوں نے اخبار ایشیاٹک مطبوعہ ۱۳ جون سنہ ۷۱ میں چھپوائی تھی اس کا لب لباب یہ ہے کہ '' ہندوستانیوں کو حکومت ہند میں بہرہ کافی دینا چاہئے '' -

پھر جوتی کا جھگڑا

۱۱ اکتوبر سنہ ۷۱ کا اخبار راوی ہے کہ :-

" ایک سخت اور تند مزاج قایم مقام ڈپٹی کمشنر ملک اودھ نے بعض معزز اشخاص سے بہت سختی کے ساتھہ گفتگو فرمائی کہ اگر تم انگریزی جوتا پہن کر ہمارے فرش پر آؤ گے تو ہم ہرگز نہ آنے دیں گے - اونھوں نے گورنر جنرل کے آرڈر کا حوالہ دیا مگر صاحب نے نہ مانا ''-

۲۵ اکتوبر سنہ ۷۱ کا اخبار گورنمنٹ کے اس نئے حکم کی مخالفت کرتا ہے جس کی رو سے سرکاری ملازم پچپن سال کی عمر کو پہنچ کر ملازمت سے سبکدوش کر دئے جائیں گے - اس طویل افتتاحیہ میں سے صرف ایک جملہ نقل کیا جاتا ہے :—

'' شیخ شیراز کے مصرع - قدیمان خودرا بیفزاے قدر - پر کیا

خوب عمل ہوا علاوہ اس کے سرکار کو تنخواہ زاید محض بے سود
دینی پڑے گی یعنی جو لوگ برخاست ہوں گے انہیں نصف تنخواہ
بطور پنشن ملے گی اور ان کی جگہہ پر جو مامور ہوں گے ان کو
پوری تنخواہ دینی پڑے گی " —

ظاہر یہ ہوتا ہے کہ سنہ ۱۸۷۱ ع میں لاہور سے ایک اخبار عربی
زبان میں نکلتا تھا - اس پر ۲۰ دسمبر سنہ ۷۱ کے اخبار میں معرفانہ تبصرہ
ہے - یہ پتا نہ چلا یہ جدت کس دماغ سے پیدا ہوئی —

۵ جنوری سنہ ۱۸۷۰ کے اکمل الاخبار میں ایک " انگریزی خواں کی
فریاد " اس طرح شروع ہوتی ہے : —

" بھلا سرکار سے کوئی یہ تو پوچھے کہ اتنے ہندوستانیوں کو انگریزی
پڑھا کر کیا کرے گی - ان کو کہاں تک روزگار دے گی - جانے دو
ہم آپ ہی دیکھیں کہ اتنے ہندوستانی انگریزی پڑھ کر کیا
کریں گے - یہ بی - اے - ایم - اے یا کچھہ اور کیونکر جئیں گے -
آپ ہی فرمائیے ہمارے لیے وجہ معاش کی کیسی قلت ہے -
ہم قوالی سیکھہ نہیں سکتے جس سے شیکسپیر کی طرح نام اور
معاش دونوں پیدا کرلیں ... کمر باندہ پورٹ ملتو ہاتھہ میں
لیے ہم استریلیا بکریاں چرانے نہیں جا سکتے - کمانڈر انچیف
کبھی ہونے سے رہے - جہازی فوج میں ہمیں کون پوچھتا ہے -
فوج میں ہم گھسنے نہیں پاتے - دنیا میں جو معزز وسیلے معاش
کے ہیں ان میں ہمارا دخل نہیں اب بتائیے رہا کیا - آپ
کہیں گے سول کے عہدے - بجا - لیکن آپ نے دیکھا بھی کتنے
ہندوستانی انگریزی خواں عہدوں پر ہیں - اتنے ہیں کہ انہیں

انگلیوں پر گن لیجئے - ولایت جانے کی ایک پخ لگی ہے ...
مطبعوں میں اتنی گنجایش نہیں کہ مضمون نویسی یا نامہ نگاری
سے بسر اوقات کریں - کسی پیشے کی طرف (لہار - بڑھئی کے)
اگر رغبت کرتے ہیں تو گھر کی خواجہ زادگی جاتی ہے -
تجارت کے لیے سردست اتنا اثاثہ کہاں - بہت ہوئے بہت ہوئے
کسی دفتر میں کلرک ہوگئے لیکن وہاں بھی نقل نویس ہی رہے -
پولس میں بہت بڑھے تو تھانہ دار - کچہری میں بہت دوڑے
تو سرشتہ دار - مال میں جا گھسے تو تحصیلدار - محکمہ افیون
و نمک میں جا پھنسے تو داروغہ ہوگئے اور عمر بھر رہے - ریل
پر بنگالی گھسنے نہیں دیتے - بنک گھروں اور بڑے بڑے سوداگروں
کے کارخانہ میں پارسی بھرے ہوئے ہیں - متعہد عہدوں کا نام
لیں یہ ہماری مجال نہیں - غیر متعہد عہدے یہ ہندوستان زا
صاحب لوگ نہیں چھوڑتے - رہے دو چار ہندوستانی جو
معزز عہدوں پر ہیں ان کا ذکر نہیں - عام سے کلام ہے -
فرمائیے یہ تھوڑی مصیبت ہے جیئیں تو کیونکر جیئیں - شکایت
نہ کریں تو کیا کریں " —

یہ تحریر اقتصادی پہلو سے اور آج کل کی تعلیم یافتہ بےروزگاری
کے لحاظ سے اتنی وقیع سمجھی گئی کہ یہاں بجنسہ نقل کردی گئی -
زیست کی یہ کشمکش جسے آپ آج رو رہے ہیں اب سے ساٹھ پینسٹھ برس
پہلے شروع ہوگئی تھی - ملک کے صاحبان بست و کشاد کا فرض تھا کہ میکالے
کی فصاحت و بلاغت سے مسحور نہ ہوکر جبھی سوچتے کہ اس حالت کا انجام
کیا ہوگا - ابھی تھوڑی دیر ہوئی آپ کو بتایا گیا تھا کہ اس وقت تمام

صوبۂ پنجاب سے یعنی پنجاب خاص - سرحدی صوبے - دهلی اور پنجاب کی ریاستوں سے کل بارہ نوجوان ایف - اے میں پاس هوئے تھے - آج صرف پنجاب اور پنجاب یونیورسٹی هی کی تعلیمی پیداوار پر نظر ڈالیے - زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں صورت حال سب پر ظاہر ہے —

هندوستان کی صدائے احتجاج انکم ٹیکس کو آخر لے هی مری - یہی اخبار انگلشمین کے حوالے سے راوی ہے کہ " بے شبہ انکم ٹیکس موقوف هوگیا کیونکہ سنہ ۱۸۷۳ - ۷۴ کے تخمینوں میں کہیں انکم ٹیکس کا ذکر نہیں " --

ظاہر یہ هوتا ہے کہ اسی سال یعنی سنہ ۱۸۷۳ ع سے پنجاب گورنمنٹ گزٹ اردو میں چھپنا شروع هوا —

لارنس گزٹ میرٹھ

۵ جنوری سنہ ۱۸۷۲ کا لارنس گزٹ خبر دیتا ہے کہ کلکتہ یونیورسٹی کے انٹرنس کے امتحان میں جو مختلف مقاموں اور صوبوں میں هوا کل سات سو چھبیس امیدوار کامیاب هوئے —

۱۶ فروری سنہ ۷۲ کا اخبار ارل میو گورنر جنرل کے قتل کی خبر اس شعر سے شروع کرتا ہے :—

رقم کس طرح هو یہ حال تباہ
قلم کے نکلتے هیں آنسو سیاہ

قانون داں حضرات یہ خبر نہایت دلچسپی سے سنیں گے جو ۱۳ فروری سنہ ۱۸۷۴ کے لارنس گزٹ میں چھپی ہے :—

" لارنس گزٹ کے ایک کارسپانڈنٹ صاحب جہلم سے رقم فرماتے هیں کہ چرخی دادری کے تھانہ دار نے چار ڈاین عورتوں کو جو بچوں کا کلیجہ نکال لیتی هیں بذریعہ چالان ریاست جہلم میں بھیجا ہے - یہ مقدمہ روبرو مہاراجہ صاحب بہادر کے پیش

ہوگا اگرچہ یہ بات بعید از قیاس ہے مگر ہم نے سنا ہے کہ جادو
کے زور سے ڈاین عورتوں کو یہ رتبہ حاصل ہوجاتا ہے کہ جس
کا چاہیں کلیجہ نکال لیں یعنی بدن سے غایب کردیں " —

لارنس گزٹ کے کارسپانڈنٹ صاحب یا اس کے اڈیٹر صاحب ڈاین اور جادو کی نسبت چاہے کچھ رائے رکھتے ہوں سنہ ۱۸۷۴ع میں ملک میں مجموعہ تعزیرات ہند رایج تھا اور اُس وقت یورپ کے ملکوں میں بھی جادو گری مہمل چیز قرار پاکر قوانین متعلقہ سے خارج ہوچکی تھی - یہ کس طرح معلوم ہو کہ مہارجہ صاحب جیند نے اس مقدمہ میں کیا فیصلہ دیا - یہ کچھ ہی ہو ہمیں یہ دیکھکر بہت تعجب ہوتا ہے کہ ڈاین چڑیل - پچھلپائی وغیرہ صفات عورت کی ذات سے گزشتہ زمانے میں کیوں منسوب کی گئیں - مرد بھی اُس زمانے میں جادو گری کرتے تھے وہ بچوں کا کلیجہ کیوں نہیں نکالتے تھے اس کا جواب یہی سمجھہ میں آتا ہے کہ انہیں بیچاری عورتوں کا کلیجہ جلانے سے فرصت نہیں ملتی تھی —

کھدر اور لنکا شایر - دیسی ملیں اور مانچسٹر مختصر یہ کہ سودیشی اور بدیشی کا جھگڑا آج کا نہیں معلوم ہوتا - کم سے کم سنہ ۱۸۷۰ع تک تو اس کا پتا چلتا ہے - اگرچہ وہ معاملہ خفیف تھا یعنی جنیئو کے تاگے کا جھگڑا تھا کہ وہ ولایتی سوت کا چل پڑا تھا - لارنس گزٹ مورخہ ۲۴ اپریل سنہ ۷۴ ع راوی ہے کہ :—

"نوساری کی پارسی عورتوں میں دفعتاً شہرت ہوئی کہ بمبئی
سے کل کا کتا ہوا سوت آیا ہے جس سے پاک ڈورا جنیئو کا
پارسیوں کے لئے تیار ہوگا - یہ سنتے ہی تمام پارسی عورتیں غضبناک
ہوکر اول برجورجی نوروزجی سردار قوم پارسی کے پاس جاکر
فریادی ہوئیں کہ سوت جو کل سے تیار ہوکر آیا ہے اس سے ہماری

سوداگری کو نقصان پہنچیگا" —

لکھا ھے کہ جب سردار مذکور اور پارسی دستور سے حسب منشا جواب نہ ملا تو وہ عورتیں زنانہ سکول میں گھس آئیں جہاں انہوں نے استادوں اور شاگردوں کو ڈرایا - انجام کار رفع نزاع کی نظر سے وہ سوت جو آدھا پونڈ تھا ان بہادر عورتوں کے حوالہ کردیا گیا جسے انہوں نے وھیں تار تار کردیا اور سکول سے اپنی لڑکیوں کو جن کی تعداد تیس تھی اٹھا کر لے گئیں —

۲۲ مئی ۱۸۷۷ ع کے لارنس گزٹ میں ھے :—

"افسروں کالج کلکتہ یونیورسٹی نے ۱۱ مئی سنہ ۱۸۷۷ ع کو اس امر کا فیصلہ کیا ھے کہ جس طرح مرد طالب علم امتحان یونیورسٹی کلکتہ کا دیتے ھیں اسی طرح عورات طلبہ بھی پردہ سے معرفت عورتوں کے امتحان یونیورسٹی کلکتہ دیا کریں" —

اسی اخبار سے معلوم ھوا کہ ڈاک کا کالکا سے تانگہ میں سملہ جانا اسی سال سے شروع ھوا —

نورالانوار - کانپور

۱۰ جنوری سنہ ۱۸۷۴ ع کی اشاعت اخبار کیا خاصا گلدستہ ھے - چوتھائی صفحہ اپنے اخبار کے منظوم اشتہار سے بھرا ھے - باقی مندرجات نظم و نثر یک مصرعی سرخی سے مزین ھیں -

۸ اگست سنہ ۷۴ ع کو یہ اخبار آبدوز کشتیوں کی نسبت یہ خبر دیتا ھے :—

"جرمنی کے میر بحری نے کئی کشتیاں پانی کے اندر چلنے والی واسطے تباہ کرنے جہاز دشمنوں کے بہ صنعت جدید ایجاد کی ھیں ... ..."

عام لوگوں کا خیال ھے کہ ایسی کشتیاں فرانس کی ایجاد ھیں -

جنگ جرمن میں ان کا زبردست استعمال جرمنی کی طرف سے ہوا
ایک مراسلت کا عنوان ہے - " نامۂ احباب کے ہیں یہ مضامین لطیف "

اخبار سین تیفک سوسائٹی - علی گڑہ | انگریزی میں اس کا نام علی گڑہ انستی تیوت گزت لکھا ہے - یہ ہفتہ وار تھا - بعد میں ہفتہ میں دو بار ہو گیا تھا -
پہلے چند صفحے پہلو بہ پہلو اردو اور انگریزی میں ہوتے پھر صرف اردو -
کل اخبار تائپ میں چھپتا - صفحوں کا شمار انگریزی کے مطابق بائیں
طرف سے ہوتا - ۱۷ مارچ سنہ ۱۸۷۹ ع کی اشاعت پر جلد ۱۱ نمبر ۱۹ درج
ہے - سالانہ قیمت اٹھارہ روپیہ اور ڈاک کا محصول ڈیڑہ روپیہ تھا —

مذکورہ بالا اشاعت میں ہندوستانی جوتے کے معاملہ پر اردو اور انگریزی میں
ایک لمبا مضمون ہے - لارڈ نارتھ بروک کے استعفے پر رائے زنی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

" ہم لارڈ نارتھ بروک صاحب بہادر کے عہد حکومت کی
نسبت عموماً نہایت تعظیم و تکریم کے ساتھ کوئی بات کہنا
چاہتے ہیں اور گو بہ نظر ظاہر بڑودہ کے مقدمہ میں صاحب
ممدوح سے غالباً غلطی ہوئی اور ہمارے نزدیک بھی اس میں
خلاف دور اندیشی طریقہ اختیار کیا کیا گیا جیسا کہ قحط کے
معاملہ میں غلطی ہوی تھی اور اس میں چند امور خلاف دور
اندیشی اختیار کئے تھے مگر ان دونوں صورتوں میں صاحب
ممدوح کا اصل منشا نہایت عمدہ اور عالی تھا " —

یہ سر سید احمد خاں مرحوم کے قلم کی عشوہ گری ہے - اس کو کہتے ہیں
مدبرانہ طرز تحریر - جو کہنا تھا وہ کہہ گئے اور اپنا دامن بھی بچا گئے —

۲۳ دسمبر سنہ ۱۸۷۵ ع میں " تہذیب اور بد تہذیبی " کے عنوان کے نیچے
ایک مضمون اس طرح شروع ہوتا ہے :—

" جس طرح کل ھندوستانیوں کا سپید رنگ ھو جانا اور ھر ایک ھندوستانی کا کوٹ پتلون پہن لینا اور ھندوستانی عورتوں کو انگریزی لباس زیب بدن کر کے بے پردہ گلی در گلی پھرنا دشوار ھے اسی طرح ھندوستانیوں کی تہذیب اور شایستگی کا صاحبان یورپ کے دل نشین ھو جانا بھی محال ھے - ھندوستانی کتنے ھی علوم و فنون میں کمال حاصل کریں اور کتنے ھی دیانت دار اور خوش کردار ھو جائیں مگر وہ انگریزوں کے نزدیک بے ایمان اور غیر مہذب ھی رھینگے اور انگریز چاھے جتنی بد افعالیاں کریں مگر وہ شریف کے شریف ھی ھیں ...... " -

۱۰ مارچ سنہ ۱۸۷۶ ع کی اشاعت میں ایک مضمون ھے جس کا عنوان ھے :-
" انگریزی اخبار نویس ھندوستانی اخباروں کے ساتھہ کیا کرتے ھیں " —

۲۲ دسمبر سنہ ۱۸۷۶ ع کا اخبار راوی ھے :-

"اخبارات ڈیلی تیلیگراف میں ایک دلچسپ تجویز پیش ھوئی ھے وہ یہ ھے کہ اکثر دیسی سرداروں کو خطاب ڈیوک کا دیا جاوے ... ... ھوس اف لارڈ سے بھی استدعا کی گئی ھے کہ ان ھندوستانی لارڈوں کو وہ اپنی جماعت میں داخل کر لیں" —

۳۱ مارچ سنہ ۱۸۷۶ ع کے اخبار میں ایک طویل اور مدلل مضمون اس موضوع پر ھے کہ :- " بیوہ عورتوں کا نکاح ثانی نہ کرنے میں کیا فساد ھے ؟ "-

اسی اخبار میں ایک اور مضمون ھے جس کا عنوان ھے :- " بعض سرکاری انتظاموں سے رعایا کیوں متنفر ھے " - اس مضمون کے سلسلے میں لکھتے ھیں :-
" اب یہاں تک تو ھم نے سرکاری تدابیر سے فائدہ حاصل نہ کرنے کے اُن اسباب کو بیان کیا جو خاص رعایا کی طرف سے پیدا ھوتے ھیں - اب ھم اُن اسباب کو

بیان کرتے ھیں جو خاص انتظام ھی کے متعلق پیدا ھوتے ھیں- منجملہ ان
کے ایک ان ملازموں کی کج اخلاقی اور ظلم اور زیادتی- اور اگر ھم
سچ سچ کھیں تو بعض اوقات ان کی بد معاشی اس بات کی باعث
ھے کہ ھندوستانی ان کی صورت دیکھنے اور ان کے پاس جانے
سے اپنا مرنا بہتر جانتے ھیں ....'' —

(۵ - مئی سنہ ۱۸۷۶ کے اخبار میں مختلف واقعات کی ذیل میں
ایک نوٹ انگریزی اور اُردو دونوں زبانوں میں آتا ھے - انگریزی میں
آیا ھے " Impressions or sentiments " اُردو میں ان کے معنوں کو " خیالی
باتوں " میں ادا کیا گیا ھے - یہ ترجمہ نہ جب درست تھا نہ اب ھے -
اب تو ان دونوں کلموں کی جگہ اُردو میں " ارتسام " اور " وجدانیات "
استعمال ھوتا ھے) —

۱۲ - مئی سنہ ۱۸۷۶ کے اخبار میں ایک زبردست افتتاحیہ درج ھے
جس کا موضوع ھے " شاہ جہاں پور کا واقعہ " - اس سے ظاھر ھوتا ھے کہ
شاہ جہاں پور میں کسی انگریز نے تین ھندوستانیوں کو قتل کردیا تھا اور
اپنے بیان میں کہا تھا کہ جب سے اس نے کانپور میں اس یادگار کو دیکھا
جو سنہ ۱۸۵۷ ع کے غدر میں مظلوم یورپین کے قتل کی بابت بنائی گئی
ھے اس وقت سے اُسے ھندوستانیوں سے سخت دشمنی ھوگئی - لکھا ھے :—

" نہایت افسوس کی بات ھے کہ اس نادان یورپین نے ان
بیچارے ناکردہ گناہ ھندوستانیوں کے قتل کو اس ظلم کی
مکافات تصور کیا جو سنہ ۱۸۵۷ ع کے ھنگامہ میں کسی اور کے
طرف سے ھوا تھا اور جس میں ان مقتول ھندوستانیوں کو
کچھہ بھی دخل نہ تھا - ....'' —

اسی مضمون میں آگے جاکر لکھتے ھیں : —

ھم کو یاد ھے کہ اس بارے میں ھم نے اپنی ایک راے بھی دی تھی جس کا منشا یہ تھا کہ ایسی یادگاریں ھمیشہ کینہ کو تازہ کریں گی اور فساد کو بڑھاویں گی۔ پس اسی طرح ھم اب یہ راے ظاھر کرتے ھیں کہ ھماری گورنمنٹ پر بہ نظر بقاء امن و امان ضرور ھے کہ وہ ایسی جملہ یادگاروں کو نیست و نابود کردے۔ .... " —

چند سال ھوے لاھور میں لارنس کے بت کے کتبہ پر بہت جھگڑا ھوا - مدتوں گورنمنٹ اور پبلک میں کشمکش رھی۔ مگر اب گورنمنٹ کی مصلحت اندیشی نے سر سید کے مشورے پر عمل کرنا مناسب سمجھا —

ابھی کل کی بات ھے جب شارڈا ایکٹ اسمبلی کے زیر غور تھا تو ھمارے ارباب وطن کے ایک طبقے نے اس کی مخالفت کی تھی اور اپنی جماعت کو اس کے اثر سے مستثنیٰ رکھنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن ھم دیکھتے ھیں کہ ۱۲ - مئی سنہ ۱۸۷۲ کے علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں ایک صاحب " قانون میعاد نکاح " کی تجویز پیش کرتے ھیں —

۱۵ - ستمبر سنہ ۱۸۷۱ ع کے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں ایک مفصل افتتاحیہ درج ھے جس کا عنوان ھے " ھندوستانیوں کا خون " - یہ سرخی صنعت براعت استہلال کا حکم رکھتی ھے - یہ مضمون مسٹر فلر کے مقدمہ میں لارڈ لٹن کی تنبیہ کے حوالے سے شروع ھوتا ھے - پھر مختلف مقامات میں چھہ ھندوستانیوں کے قتل کا ذکر کیا ھے جو حال میں یوروپینوں کے ھاتھہ سے ھوے تھے۔ مضمون طویل ھے۔ سردست اس اقتباس پر اکتفا کیا جاتا ھے :—

(" قانون تعزیرات ھند کے اس حکم سے کہ اشتعال طبع کی

حالت میں قتل عمد نہیں رهتا اور اگر آله قتل سے قتل نه کرے تو قتل عمد نہیں هوتا یه نوبت پہنچ گئی تهی که بے رحم لوگ نہایت جری هوگئے تھے اور هر شخص اپنے دل کے غبار نکالنے اور قتل میں کامیاب هونے کے واسطے اشتعال طبع کا حیله پکڑنے لگا تها مگر تاهم کچهه اندیشه تها- اور جب سے که شاه جہاں پور میں ایک گورے کے هاتهه سے تین هندوستانی مقتول هوے اس وقت سے آلۂ قتل کی بهی چنداں پروا نه رهی اور لکهنو میں آج کل ایک چوکی دار کا شکار بندوق سے هی هوا- اور اگر آینده ایسے امور میں ڈاکٹروں اور جوریوں کی نیت به خیر رهی تو پهر مقتول کے مریض هونے اور قاتل کے نشه باز هونے سے بڑی گنجایش هوگی اور هندوستانیوں کے خون کی ندیاں بهنے لگیں گی " —

اسی اخبار سے پته چلتا هے که ۲۷ – اکتوبر سنه ۱۸۷۶ کو سر ولیم میور کو جو ایڈریس علی گڈه میں دیا گیا جس کے سکریٹری سر سید احمد خاں تهے وه عربی زبان میں تها —

اوده اخبار نه صرف دهلی والوں بلکه تمام علم دوستوں کو اس کا بڑا قلق تها که وهاں جو دربار قیصری کا انعقاد هوا تو اس سے امید تهی که دهلی کی شان میں ایزادی هوگی- الٹا یه هوا که قدیم دهلی کالج توڑ دیا گیا- ۱۷ – جولائی سنه ۱۸۷۷ کا اوده اخبار راوی هے که :-

" مسٹر فاسٹ صاحب دهلی کالج کے ٹوٹ جانے کا قضیه هوس اف کامنس میں پیش کرنے والے هیں- اور انڈیا آفس سے اس باب میں تار برقی بهی آئی هے اور اس میں لکها هے که کیونکو اور

کیوں یہ کالج توڑ دیا گیا " —

اخبار عام

۶ فروری سنہ ۱۸۷۱ کا اخبار عام کلکتہ یونیورسٹی کے سنہ ۱۸۷۱ کے بی-اے کا نتیجہ شایع کرتا ہے - اس سے پایا جاتا ہے کہ اکیس تعلیمی اداروں نے دو سو بارہ امید وار اس امتحان میں بھیجے جن میں سے کل چوراسی پاس ہوے - سب سے زیادہ طلبا پریسڈنسی کالج کلکتہ نے بھیجے یعنے ۷۶ - جن میں ۳۵ پاس ہوے - دھلی کالج تین میں سے ایک لاھور کالج سے صرف ایک امتحان میں بیٹھا جو فیل ہوگیا - ان اعداد کو یونیورسٹیوں کے آج کل کے نتائج سے کیا کوئی نسبت ہے —

۱۶ اگست سنہ ۷۱ کا اخبار سول سروس کے امتحان کا نتیجہ شایع کرتا ہے جس سے پایا جاتا ہے کہ کل ۴۸ پاس ہوے جن میں سے بابو رومیش چندر دت دوم نمبر پر رہے اور آٹھ سو کا انعام پایا ان کے سوا دو اور ہندوستانی امید وار اس امتحان میں پاس ہوے یعنی بابو بہاری لعل گوپت چوتھے نمبر پر اور بابو سراندر و ناتھ بنرجی بیسویں نمبر پر —

(۱۷ اپریل سنہ ۷۱ کا اخبار بتاتا ہے کہ :-

" لاھور گورنمنٹ کالج جو کہ پہلے ھیرا منڈی میں راجہ دھیان سنگھ کی حویلی میں تھا اب انار کلی میں جہاں پہلے لاھور کرانیکل تھا چلا گیا ") —

یکم مئی سنہ ۷۱ کا اخبار انجمن پنجاب کے جلسہ منعقدہ ۲۷ اپریل کی کارروائی دیتا ہے جس کی یہ دو مدات دلچسپی سے خالی نہیں —

" تجویز دوم - گورنمنٹ میں ایک درخواست اس مضمون کی روانہ کی جاوے کہ کل جلسوں میں جہاں صاحبان

یوروپین و دیسی دونوں شامل ہوں تقریر صرف بہ زبان اردو ہوا کرے"۔

"تجویز سوم - نوکری بلا کسی وجہ خاص کے کسی شخص کو سوائے دینے کسی امتحان کے نہ ملا کرے"۔

معلوم یہ ہوتا ہے کہ چٹا گونگ اور اس کے قرب و جوار کی آب و ہوا نفسیاتی صحت پر خاص اثر رکھتی ہے - حال میں جو کچھ اُس نواح میں ہوا اور ہو رہا ہے بیان کا محتاج نہیں - ہم یہ دیکھتے ہیں کہ وہاں ہمیشہ ایسی ہی ہنگامہ آرائیاں ہوتی رہی ہیں - چنانچہ ۸ مئی سنہ ۷۱ کے اخبار عام میں لکھا ہے :-

"چٹی گونگ - یہاں کے منصف سخت مصیبت میں ہیں - مستغیث لوگوں نے جن کے مقدمے کچہریوں سے خارج ہوجاتے ہیں کیا عادت سیکھی ہے کہ اس منصف کے گھر میں جس نے ان کے بر خلاف فیصلہ کیا آگ لگا دیتے ہیں۔

۱۵ مئی ۱۸۷۱ کا اخبار یہ لوکل خبر معہ اپنے حاشیہ کے لکھتا ہے :-

"لاہور ۱۰ ایک انگریزی اخبار سے منکشف ہوا کہ چیف کورٹ پنجاب نے ایک لڑکے کے واسطے جس کی عمر تیرہ سال کی تھی ایک اور لڑکے کو کوئیں میں دھکا دے کر گرادینے کے جرم پر حبس دوام کا حکم صادر فرمایا - تھوڑے دن ہوئے کہ ایک گورے نے ایک لڑکے کو لاہور میں ایک خندق میں دھکا دے کر مار ڈالا اور صرف ایک ہی سال کی قید سخت کا حکم ہوا تھا - حقیقت میں انصاف کے یہی معنی ہیں"۔

۳۱ مئی سنہ ۷۱ ع کے پرچے میں ایک نہایت اہم افتتاحیہ درج

ہے - صاحب اخبار نہایت دلسوزی سے شاکی ہیں کہ گورنمنٹ انگریز بہادر نے جو انگریزی اور فارسی کی تعلیم عام کردی تو اس سے ان کا منشا یہ تھا کہ جس طرح ان کے وطن میں سب پیشہ ور تعلیم یافتہ ہیں اور وہ لوگ تعلیم پاکر اپنے اپنے پیشے کی ترقی اور ایجادیں کرتے ہیں ویسا یہاں بھی ہوگا - لیکن یہاں نتیجہ الٹا ہوا - پڑھ لکھ کر لوگوں نے اپنے پہلے کام کو بھی دھتا بتائی ایجاد و اختراع کا تو ذکر ہی کیا " -

۷ جون سنہ ۷۱ کا اخبار خبر دیتا ہے کہ پانچ روپیہ کا کرنسی نوٹ عنقریب جاری ہو جائے گا —

۱۹ جولائی سنہ ۷۱ کے اخبار میں دو دلچسپ خبریں درج ہیں :-

(۱) " حبشی غلاموں کا فروخت ہونا شہر بمبئی میں ۵۵ حبشی اطفال بسواری جہاز دخانی وارد ہوئے ہیں اور وہاں کے کمشنر پولیس کی نگرانی میں ہیں جو اشخاص ان کو نوکر رکھنا چاہیں اپنی درخواست پیش کریں " —

(۲) ' قصاص - ۷ جولائی کے انگلشمین میں درج ہے کہ ایک گورہ سپاہی رابنسن جس نے مقام اسیرگڈھ میں ایک شخص ٹھکرو نامی کو سڑک پر چلتے ہوئے مار ڈالا تھا اس کو چیف جسٹس بمبئی نے پھانسی کا حکم دیا -

۲۶ جولائی ۷۱ کے پرچے میں لکھتے ہیں کہ اکثر لوگوں کی رائے میں لکڑی کاٹنے کا وقت اترتے چاند کے دنوں میں ہے - چڑھتے چاند میں کاٹی جائے گی تو ناقص اور ناپائدار ہوگی - انگلستان میں اس کی پابندی کرتے ہیں اور فرانس میں تو چڑھتے چاند لکڑی کاٹنے کی قانوناً ممانعت ہے - ایک صاحب لکھتے ہیں کہ برازیل میں فن فلاحت کے ایک بڑے ماہر نے اپنے تجربے سے یہ سمجھایا کہ جو لکڑی پورنماسی کے قریب گرائی گئی

تھی اس کو جلد گھن لگ گیا اور وہ خراب ہو گئی —

۲ اگست سنہ ۷۱ کے اخبار میں سر ڈانلڈ میکلیوڈ سابق لفٹنٹ گورنر پنجاب کے ایک خط کا ذکر ہے جو لنڈن ٹائمس میں چھپا تھا - اس کا یہ اقتباس ملاحظہ کے قابل ہے :-

" جب تک معاملات سلطنت ہند میں ہم ہندوستانیوں کی صلاح نہ لینگے کبھی وہ معاملات بہتری کی طرف رجوع نہ کریں گے "

۹ اگست کے اخبار میں حضرت سلطان روم کی نئی کشتی 'کیک' کا تذکرہ اور تصویر بھی ہے ۲۳ اگست کے اخبار میں ناصر الدین شاہ ایران کی تصویر اور بوشہر کا نقشہ ہے - ۳۰ اگست کا اخبار 'روڈ سٹیمر' کا حال اس طرح لکھتا ہے :—

" دریدولا روڈ سٹیمر یعنی اُس قسم کی ریل گاڑی جو کنکر کی کچی سڑک پر چلے بنی ہے ہندوستان میں یہ روڈ سٹیمر راولپنڈی سے جہلم تک واسطے روانگی ڈاک اور مسافروں کے جاری ہوگی —

۲۹ نومبر سنہ ۷۱ کے اخبار میں ایک وحشت ناک خبر مثنوی کی صنف میں نظم کرکے لکھتے ہیں - عنوان ہے " ظلم ایک زنگی مردم خوار کا " ملاحظہ ہو :—

اخبار نسیم جونپور کا ہے واقع ظلم یہ سناتا
جبر الٹر اک جگہ کا ہے نام زنگی کوئی واں تھا بد سر انجام
اس نے لڑکا کسی کا پکڑا شہ رگ سے سب اس کا خون چوسا
ہر چند وہ چیخا اور کیا غل یہ پی گیا خون بے تامل
اس پر یہ نیا ستم دکھایا اک ہونٹ بھی اس کا بھون کھایا
ہیں 'مجر' جہاں میں ایسے بھی مرد جن کو ہم جنس کا نہیں درد

بدیا بلاس

جموں کا اخبار بدیا بلاس اپنی دسمبر سنہ ۷۳ کی اشاعت میں سرکار انگریزی کی فوج کے مصارف کے سلسلہ میں یہ دلچسپ اعداد شایع کرتا ھے :—

" ایک مابڑی توپ خانہ گھوڑے کا خرچ ایک لاکھہ پانچ ہزار دو سو چالیس روپیہ سالانہ ھے ایک رجمنٹ سواران فوج گورہ کا خرچ تین لاکھہ ساٹھہ ہزار پانسو تیس روپیہ سالانہ ھے - ایک ہندوستانی سواران رسالہ کا خرچ دو لاکھہ انتالیس ہزار چھہ سو دس روپیہ سالانہ ھے "

اخبار انجمن پنجاب

۲۸ نومبر سنہ ۱۸۷۳ ع کا اخبار انجمن پنجاب راوی ھے کہ :—

" مسٹر کروم صاحب بہادر نے شیر کےشکار کےلئے ایک عجیب پوشاک ولایتی ٹاٹ کی بنائی ھے اس میں بہ وسیلہ چمڑے کے لوھے کی تین تین انچ لمبی میخیں نوکدار اور نہایت پائدار لگائی ھیں اور دوسری یہ خوبی ھے کہ جس جگہ شیر اپنا پنجہ یا منھہ مارے تو خود زخم شدید کھاوے اور شکاری کو کسی قسم کی ایذا نہ پہنچے - یہ پوشاک سر سے پانو تک اسی قسم کی بنائی گئی ھے "

ترجمان شرق

یہ پہلے بتا چکے ھیں کہ استنبول سے ایک اخبار ' دارالخلافۃ ' فارسی زبان میں نکلتا تھا - سنہ ۱۸۷۸ میں وھیں سے ایک اخبار اردو زبان میں بھی نکلنا شروع ھوا - اس کا نام تھا اخبار ' ترجمان شرق ' اس اخبار کے نکالنے والے آیا ترک ھی تھے یا کوئی ہندوستان سے گیا ھوا شخص تھا ؟ یہ نہ معلوم ھوسکا - بہر حال

یه اخبار بین ایشیاٹک تحریک کا علمبردار معلوم هوتا هے - یه اخبار پندرہ روزہ تھا اور اخبار دارالخلافة والے هی اس کے بھی سر براہ کار تھے - ایک اقتباس اس اخبار کا ملاحظه هو :—

"'روس و ترک' ضلع شمله کے باب میں (نیواوغوس) نام اخبار لکھتا هے که روسی شہر مذکور کے قریب هوتے جاتے هیں چنانچه دو فرقه هوکر ایک پندرہ پلٹن اور دوسرا بھی پندرہ پلٹن اور ایک آلائی سواری سے مرکب هونے کے لئے هر دو فرقه عسکر (قرۂ کوز کوئی) کو آیا هے اور اسی هر دو فرقه عسکر کی پاس آٹھه باتر یا توپ هونے سے تیس هزار نفر کے لئے یه اس قدر توپیں بہت زیادہ خیال کی جاتی هیں - ضلع شمله میں جو خبریں شایع هوئی هیں اون کے دیکھنے سے یه معلوم هوتا هے که شمله اور وارنه کی قلعوں میں عساکر دولت علیه سے صرف دس پلٹن رهیں گی باقی سب عساکر شاهانه وهاں سے نکل جائیگا "

یه شمله اُس وقت کی ترکی یا اس کے توابعات میں معلوم هوتا هے - اس تحریر کی زبان اور اسلوب سے یه امر صاف ظاهر هے که یه کسی هندوستانی کے قلم سے نکلی هوئی نهیں - فوج کے حصه کے لئیے 'فرقه' اور 'عساکر' (جمع عسکر) کے لئے فعل صیغه واحد استعمال هوا هے - اس کے علاوہ ساری عبارت کا اسلوب انوکھا هے - اور اهل اردو کے قلم سے نهیں معلوم هوتا —

نصرت الاخبار - دهلی	روس اور روم کی سنه ۱۸۷۷ ع کی جنگ کے دوران میں سرکار برطانیه کسی طرف نه هوئی -

اس لئے تمام رعایا کو طرفداری جانب داری کی تاکید کی گئی جو ہندوستان پر بھی عاید ہوئی - یہاں زخمی اور بیووں اور جنگ کے یتیموں کی امداد کے لئے چندے ہوے - سر سید احمد خاں شاید مزید احتیاط کی رو سے اس فنڈ میں چندہ دینے کے بھی خلاف تھے - نصرت الاخبار نے اس کے خلاف بہت کچھ لکھا - ۱۱ جولائی سنہ ۱۸۷۷ کے اخبار میں لکھا ہے :-

" واے بر حال ان مسلمان اشخاص کے جو خود تو سعی نہ کریں اور اگر کوئی کرے اس میں ہارج ہوں ... ایسے اشخاص مسلمان کاہیکو ہیں برادر زادگان روس سمجھنے چاہئیں - اور بیش در بیش باعث حیرت و بوالعجبی یہ ہے کہ ہندو صاحبان صرف بوجہ محبت اہل اسلام ہند مساعی جمیلہ اعانت روم میں فرما دیں اور بعض اشخاص باوجود ادعاے اسلام مخالفت روم کا قشقہ اپنی پیشانی پر کھچوائیں ... کوہ کسولی میں منشی گنگا بشن صاحب نے ۱۰ ماہ جون سنہ رواں کو مسجد کسولی میں مسلمانان مقام مذکورہ کو جمع فرما کر ایک نہایت دلچسپ طولانی اسپیچ واسطے اجتماع چندہ امداد بیوگان و یتیمان عساکر سلطان روم خلد اللہ ملکہ بڑی عمدگی سے ادا فرمائی جس کی پر تاثیر ہونے کے سبب سے اسی جلسہ میں دو سو روپیہ جمع ہو گئے اور اب ڈگسائی اور سباتو و کسولی ہر سہ مقامات پر منشی صاحب کی جانب سے واسطے اجتماع چندہ کے اور کوشش جاری ہے "-

۱۱ جولائی سنہ ۷ اع کے اخبار میں ایک مضمون ہے جو ہندوستان کے اقتصادی بہی خواہوں کے لئے دلچسپ ثابت ہوگا - لکھتے ہیں :-

ہندوستانی بیچارے کوئی چیز بناویں تو اول کوئی قدر نہیں کرتا مثلاً تلوار گجرات کی کہ روے زمین پر مثل اس کے نہیں ہوتی مگر راجبس کا ہی دم بھرتے ہیں - اورپارچہ زرین بنارس کا کہ پائدار عمدہ ہوتا ہے مگر ولایتی کی قدر ہے - خصوص عمارت کہ دو دو ہزار برس کی موجود ہیں ... "-

۱۱ نومبر سنہ ۷۷ کا پرچہ ایک خبر نہایت عجیب سناتا ہے :-

" نواب صاحب لوہارو کو اوس لیاقت کے صلہ میں جو انہوں نے انگریزی میں حاصل کی ہے گورنمنٹ نے دو توپیں معہ کل سامان کے انعام دی ہیں "-

۱۱ جنوری سنہ ۷۷ کا اخبار 'ہندوستانیوں کا قصاص' کے عنوان کے نیچے لکھتا ہے :-

" ٹائمز اف انڈیا کا لندن سے ایک کارسپانڈنٹ لکھتا ہے کہ ایمپرس اف انڈیا نے ویسراے صاحب کو ایک خط اس مضمون کا لکھا ہے کہ جہاں تک ہوسکے انگریز جو ہندوستانیوں کو حقیر سمجھتے ہیں اور ان کے خون کی کچھہ بھی سزا نہیں پاتے اس کی بابت آپ کو چاہئے کہ انگریزوں کو ایسا کرنے سے جہاں تک آپ سے ہوسکے روکیں اور ان کو ایسا کام کرنے پر سزا لایقہ بغیر کسی لحاظ کے دیں "-

آگرہ اخبار - آگرہ

آگرہ اخبار مطبوعہ ۷ جون سنہ ۱۸۷۷ میں سید امجد علی اشہری ایک مضمون بڑی تحقیق اور تلاش کا لکھتے ہیں اس کا عنوان ہے ہندوستان میں فارسی زبان - سنیے :-

" حالات و واقعات بادشاہان سلف و بعض رسایل و اذکار سے

جس قدر مستنبط ہوا عرض کرتا ہوں کہ پیشتر جب اس ملک ہندوستان میں صرف ہندو ہی ہندو راج کرتے تھے اور مسلمانوں کی سلطنت یا حکومت کہیں نہ تھی تب بھی راجگان ہند کی طرف سے جو تحریریں بادشاہان ایران و امراے افغانستان کو جاتی تھیں وہ پارسی میں ہوتی تھیں اور جیسے اب انگریزی لکھنے کو ریاستہاے اسلام میں انگریزی داں مقرر ہیں اسی طرح اس زمانے میں پارسی لکھنے کے لئے راجاؤں کے پاس پارسی داں منشی رہتے تھے۔ چنانچہ رسالہ تحقیق اللساں تالیف منشی قمرالدین لاہوری میں لکھا ہے کہ پیش از سلطنت اسلام نیز رایان و راجگان ہند باسریر آرایان ایراں و افغانستان نامہ ہا و مکاتیب بزبان پارسی می نوشتند و پیغامہا بہ زبان سفیر پارس می گزاشتند "۔

اس سے پہلے کہ اس قرن کو ختم کیا جاے یہ بتلانا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ دہلی کے اکمل الاخبار کی سنہ ۱۸۷۳ ع کی جلد میں ان بیس معاصرین کے حوالے موقع بہ موقع آے ہیں :- ۱ اردو گائیڈ - ۲ اخبار انجمن پنجاب - ۳ پنجابی اخبار - ۴ کوہ نور - ۵ دہلی گزٹ - ۶ لارنس گزٹ - ۷ سون تھنگ علی گڑہ - ۸ پایونیر - ۹ اودہ اخبار - ۱۰ کارنامہ - ۱۱ نورالانوار - ۱۲ پٹیالہ اخبار - ۱۳ بدیابلاس - ۱۴ نجم الاخبار - ۱۵ شعلہ طور - ۱۶ انڈین مرر - ۱۷ دبدبۂ سکندری - ۱۸ احمد آباد سماچار - ۱۹ کبی بچن سدھا بنارس - ۲۰ نورالابصار -

تیسرے دور پر تبصرہ

۱ - سیاسی جذبات اور قومی احساسات ۔ اس قرن میں بیدار ہونے

لگے تھے - انکم ٹیکس کے خلاف زور سے صداے احتجاج بلند ہوئی - سول سروس کی عمر - انگلستان کے ساتھہ ہندوستان میں بھی سول سروس کا امتحان قایم کرنا - جوتے کا معاملہ - ہندوستانیوں کے خون کا قصاص - تعلیم یافتوں کی بے روز گاری - اور سالانہ بجٹ پر نقد و نظر - یہ باتیں اس دور کے خاص واقعات ہیں - آریہ سماج کا قایم ہونا سوامی دیانند اور سید احمد خاں کی اصلاحی تلقین کا پراپگنڈا ملک کی ذہنیت پر قبضہ کر رہا تھا - شمال مغربی سرحد کے معاملوں میں اب زیادہ دلچسپی لینے لگے - مختصر یہ کہ سیاسی دلچسپی حقوق کے مطالبات اور قومی غیرت و خود داری کا عنوان شروع ہو گیا تھا - اور مفید عام مضامین اب زیادہ نکلنے لگے ــــ

اردو ادب کی تاریخ میں بھی اسی دور نے عہد جدید قایم کیا یعنی سنہ ۱۸۷۴ع میں نئی شاعری کی بنیاد پڑی اور فسانۂ آزاد اودہ اخبار کے ضمیمہ کی طور پر نکلنا شروع ہوا ــــ

انشا انگریزی سے ترجمہ اب اردو انشا پر اثر ڈالنے لگا ۔ فارسیت کی کمی کے ساتھہ انگریزی لفظ داخل ہو رہے تھے - مثلاً انسٹی ٹیوشن - لائف ممبر - کارسپانڈنس - ڈیپوٹیشن - آرٹکل وغیرہ وغیرہ - اگرچہ اخباری انشا میں فارسی کا وہ عمل دخل نہیں رہا تھا جو اس سے پہلے دور میں تھا لیکن وہ جو کچھہ بھی تھا بہت بد نما اثر ڈال رہا تھا - مثلاً "پنجاب کے کالجوں" کے بدلے "کالج ہاے پنجاب" یا اہالیان ڈیپوٹیشن - ممبران کمیٹی - ماسٹران کالج و مڈل سکول - وغیرہ وغیرہ - کون سا امر مانع تھا جو وہ کمیٹی کے ممبر اور کالج اور مڈل سکول کے ماسٹر' لکھتے - اس کے ساتھہ ہی بعض عجیب اختراعیں اور گھڑنتیں بھی اس عہد کی انشا میں پائی جاتی ہیں - مثلاً 'ہمصحایف' بہ معنی ہمعصر یا معاصر کے - یہ استعمال

قطعاً غلط تھا - ' طالب علم دفعہ چہارم ' معلوم نہیں ہوتا کہ یہ دفعہ کس تعزیرات میں سے اخذ کی گئی - ' کلاس ' کی جگہ دھلی اور پنجاب میں ' جماعت اور - یوپی اور اودھ میں ' درجہ بولتے تھے اور یہ استعمال ان کا اول سے چلا آتا ہے - مگر یہاں دفعہ استعمال کیا گیا - ریکروٹ کو ہم رنگروٹ کہتے ہیں - انہوں نے اصلی لہجہ کا پاس کرکے اسے ریکروٹ بنا دیا - یہی حال ہتتال کا ہے - اگرچہ اب ثقل تلفظ کی وجہ سے اس کو ہوتال کہتے ہیں - پھر ایسی ترکیبیں ان کے ذہن پر فارسی اسلوب کی غلامی کا ثبوت پیش کرتی ہیں - مثلاً واسطے تباہ کرنے جہاز دشمنوں کے - برف بھی پڑتا تھا - شیر و بکری - رونق افروزی شہزادہ ویلز الہ آباد - بلتیں مر رہی ہیں - جو باتیں بیان کیں ہیں - کامیابی اختیار کی - ہال انجمن پنجاب - لکچر کا لفظ ایک ہی تحریر میں مذکر بھی اور مونث بھی استعمال کرنا - اس کے ساتھ بعض اچھی اختراعیں بھی ہوئیں جیسے ' سپشل ترین ' کو ' خاص ریل ' لکھنا اور ' مال ترین ' وغیرہ - اور ایسے فقرے گاریاں تکڑے تکڑے ہوگئیں ' نظم سے رغبت اب بھی ویسی ہی رہی چنانچہ ایک خبر کا عنوان ہے ---

کرتی ہے اندھا ہوس انسان کو
نیک و بد کچھ بھی نظر آتا نہیں

" تیکس کے مادہ میں تحریک " اس میں انگریزی لفظ میٹر کا ترجمہ کر دیا گیا وہ بھی غلط اس لفظ کے بہت سے معنی ہیں اور تھے - وہ معاملہ لکھ سکتے تھے - ایک اور بات جو اس دور کے اکثر اخباروں سے متعلق ہے یہ ہے کہ وہ سرکاری گزٹ کا ترجمہ کرتے ہوئے یہ عنوان دیا کرتے تھے :- تقرر ' ترقی ' ترخص ' تبدل تفعل کا وزن برابر چلتا تھا ---

املا املا میں اس دور نے کوئی ترقی نہیں کی سوائے اس کے کہ وقفہ یعنی ڈیش کا استعمال ہونے لگا - اور ہر خبر یا مضمون کے ختم پر لفظ ' فقط 'لکھہ دینا ''اس وقت اور ' اس ملک ' میں الف کے سوا باقی سب حروف کو ملاکر لکھنا اب تک جاری تھا - پہلے دور میں ' شالا مار ' کو ' شعلہ مار ' بنا دیا تھا - اب لال ٹین کے الف کو عین سے بدل دیا - شاید اس زمانے میں ساری لال ٹینیں سرخ شیشے کی ہوتی ہوں گی - 'انچ کے آخر میں دو چشمی ' ہ بڑھا دیتے تھے - وغیرہ وغیرہ —

سنہ ۱۸۸۰ ع سے سنہ ۱۸۸۴ ع تک

اودہ اخبار پہلے ہندوستان کے والیان ریاست کی نقل وحرکت اور آپس میں ملنے جلنے پر سرکار اور انگریز اخباروں کی خاص نظر رہتی تھی - ۲ جنوری سنہ ۱۸۸۰ ع کا اودہ اخبار لکھتا ہے :-

" ناظرین اخبار کو یاد ہوگا کہ مہاراجہ سیندھیہ پچھلے دنوں واسطے عیادت مہاراجہ صاحب اندور کے رونق افروز ہوے تھے اس پر اخبار 'بمبئی ریویو' نے وہ باندھنو باندھا کہ الٰہی توبہ - انگریزی مہذب اخبار اور ایسے لاطایل ڈرپوک خیالات - کچھہ اسی اخبار پر منحصر نہیں بلکہ بمبئی ٹائمز بھی اخبار " بمبئی ریویو " کا اس خاص معاملے میں ساتھی ہے وہ لکھتا ہے :- 'مطلب اس سے (مہاراجہ سیندھیا کے اندور جانے سے) یہ ہے کہ اگر وسط ایشیا میں کچھ بھی فتور پڑا تو مرہٹوں کی ریاستیں اور حیدرآباد کی ریاست بالکل بر خلاف ہوجائیگی - اس قسم کی بدگمانی اور بد باطنی انگریزی اخباروں کو شایاں نہیں ہے " -

بعض آدمیوں کا بھولا پن بھی کتنا مزے کا ہوتا ہے - فسانہ آزاد اودھ اخبار کے ضمیمہ کی شکل میں ابھی نکل رہا تھا کہ ایک صاحب کے خاتون فسانہ وغیرہ کے وطن اور مکان کا پتا پوچھہ ہی تو لیا - اس کا جواب حضرت سرشار ۲ جنوری کے اخبار میں اس طرح دیتے ہیں :-

" جی بتا چکے "

" بت طناز پیاری حسن آرا بیگم اور ان کی ہمشیرہ سراپا انداز سپہر آرا بیگم اور انکی دادی جان بڑی بیگم کے مکان اور وطن مالوف کا پتا مولوی کریم الدین صاحب المتخلص بہ مضطر ہم سے دریافت کرتے ہیں - ہم حضرت مضطر کی خدمت میں ملتمس ہیں کہ عنوان مضمون ہذا ملاحظہ فرمائیں - خوب اچھا سوال کیا - حضرت ہم نہ بتا ئینگے ... ... ' —

۳۰ جنوری سنہ ۱۸۸۰ ع کے اودھ اخبار کا ایک اندراج اس وقت کے سیاسی جد و جہد پر روشنی ڈالتا ہے - لکھا ہے :—

" شاہی اعلان سنہ ۱۸۵۸ ع کی تصدیق خود لارڈ لٹن نے جلسۂ قیصری دھلی میں کی تھی گویہ وعدے مہربانی سے ہوئے ہیں کہ سول اور فوجی عہدے ہندوستانیوں کو دیے جائینگے مگر تب بھی انکو عہدے نہیں ملتے ہیں - امتحان متعہد سول سروس میں ایسی سخت قید لگائی گئی ہے کہ جس سے عمداً ایک ممانعت ہے - ہندو راجہ بموجب 'منو' کے قاعدے کے پیدا وار کا آٹھواں حصہ وصول کرتے تھے - مسلمان بادشاہوں نے بڑھا کر چوتھائی قرار دیا لیکن حال کی اوسط

تو کسیقدر نصف سے کم ھے اور سب سے زیادہ یہ ھے کہ ھندو راجہ اور مسلمان بادشاہ مال گزاری بٹائی سے لیتے تھے اس صورت میں پیدا وار اچھی ھوئی تو آمدنی بھی اچھی ھوئی اور کم ھوئی تو آمدنی بھی کم ھوئی - لہذا رعایا کو اس زمانے میں تکلیف نہ پہنچتی تھی اب رعایا کو مال گزاری کے لئے روپیہ تلاش کرنا پڑتا ھے خواہ وہ اپنے اھل و عیال کی پرورش کرسکے یا نہ کرسکے - اس کے بعد طرح طرح کی شکایت فوجی مصارف اور ایکٹ اسلحہ اور بہت بڑی فوج ھندوستانی رئیسوں کی اور دیسی اخبارات کے ایکٹ اور آخر میں انکم ٹیکس کی ھے" —

۱۹ فروری سنه ۱۸۸۰ ع کے اخبار میں ھے :—

" پنجابی اخبار لاھور سے یکتائے زمانہ خوشنویس یگانہ امام ویردی مرحوم و مغفور کے انتقال کی خبر سنکر ھمکو نہایت افسوس ھوا - امام ویردی مرحوم فن خوش نویسی میں اپنے وقت کے امام اور میر پنجہ کش مرحوم دھلوی کے قایم مقام تھے"-

دھلی کالج کے توڑ دئے جانے کا نہ صرف دھلی والوں بلکہ کل اھل وطن کو الم تھا - ۶ جولائی سنه ۱۸۸۰ ع کا اودہ اخبار لکھتا ھے :—

" نہایت خوشی کی بات ھے کہ دھلی کے چند روسا اور عمایدِ اس غرض سے شملہ پر تشریف لے گئے ھیں کہ دھلی کالج کے از سر نو قایم کرنے میں حضور لارڈ رپن وایسرائے و گورنر جنرل ھند سے اعانت کے خواستگار ھوں یہ کارروائی نہایت ھی مستحسن معلوم ھوتی ھے اور انھوں نے ایسے وقت میں خوب ھی سوچی ھے ... ... " —

۱۴ جولائی کے اخبار میں دیسی کتب خانے کے عنوان سے ایک مفید مضمون ھے - اس کا یہ ٹکڑا ان حضرات کی توجہ کے قابل ھے جن کے گھروں میں کتابوں کا اچھا ذخیرہ موجود ھے - لکھا ھے :-

" ھندوستان کے اکثر شہروں کے خاندانوں میں بظاھر عمدہ عمدہ کتب خانے موجود ھیں اور ایشیائی علوم و فنون کی مختلف کتابیں ان کتب خانوں میں پائی جاتی ھیں لیکن ایسے شخصی کتب خانوں سے ملک کو مطلق فائدہ نہیں پہونچتا- کتب خانوں کے مالک طلبہ کو کتابیں نہیں دیسکتے .... " -

۲۷ جولائی سنہ ۱۸۸۰ ع کے اخبار میں ایک خاص طویل مضمون ھے جس کا عنوان ھے "تیرھویں صدی کے جعفر زتلیوں کی طرف گورنمنٹ اور قوم کو متوجہ ہونا چاھئے" - یہ کھلی بات ھے کہ اودہ اخبار اوو اودہ پنچ کی بہت چلتی تھی - حالانکہ حضرت سرشار اودہ پنچ کے اولیں نمبر کے نامہ نگار تھے - لیکن آگے چلکر اخباروں کے قضیے شخصیتوں پر غالب آگئے —

۲۸ جولائی سنہ ۱۸۸۰ ع کی اشاعت میں ایک مضمون ھے جس کا عنوان ھے نئی روشنی - اُس وقت یہ روشنی شروع ھوئی تھی اِس وقت دھک رھی ھے - اور مغرب زدہ اور مغرب زدگی کی آوازیں کانوں میں آنے لگی ھیں - یہ معلوم کرنا نتیجہ خیز ھوگا کہ اُس وقت اس نئی روشنی کا استقبال کیسا ھوا تھا - لکھتے ھیں :—

" .... ھماری [د]انست میں بھی تہذیب مغربی دنیاوی اِمور میں بالخصوص وہ دنیاوی امور جن میں ذاتی انتفاع ھو اور اپنے عیش و آرام اور ترقی دنیاوی کے باعث ھوں جو

صرف مہذبین مغربی کو مد نظر ہے ... . بہت عمدہ ہے " -

۷ اگست سنه ۱۸۸۰ ع کے اودھ اخبار میں شکایت کے بعد یه تجویز پیش کی گئی تھی کہ زنانه درجوں کے لئے لیڈی ٹکٹ کلکٹر مقرر ہونی چاہئیں - اس پر عمل ہوا تو - مگر تجویز کے چوتھائی صدی بعد —

یکم دسمبر سنه ۸۰ ع کے اودھ اخبار میں آزاد مرحوم کی آب حیات پر مفصل تبصرہ درج ہے - اسی ضمن میں - لکھتے ہیں :—

" نیرنگ خیال کے خیالات ابھی پیش نظر تھے کہ پروفیسر آزاد نے ایک اور تازہ طلسم باندھکر انجمن آراسته کی - بیچ میں آزاد آب حیات کا پیاله لئے کھڑے ہیں دور چل رہے ہیں - ایک جلسه برخاست ہوتا ہے دوسرا جمتا ہے - شعرائے باکمال اردو کے اپنا اپنا کمال دکھاتے ہیں اور آب حیات کا جام پی کر رخصت ہوتے ہیں ... ..." -

" اول یه کام برسوں کا نہیں ہے - عمروں کا ہے - بلکه ایک آدمی کی تو عمر کا بھی کام نہیں - بہت سے سن رسیدہ اور صحبت یافته لوگوں کی کمائی اس میں شامل ہوئی ہوگی - ایسی باتوں کا بہم پہنچانا اور پریشان دانوں کا سمیٹنا کچھہ آسان کام نہیں " —

یه ذکر کرکے که :- " تعجب ہے که مومن خاں صاحب کا حال نہیں لکھا جو که شعرائے مندرجه سے کسی طرح درجے میں کم نه تھے " - بتاتے ہیں که " باوجود ۵۲۰ صفحه سے زیادہ ضخامت ہے اس کی قیمت ایک روپیه ہے " - آج کل ۵۲۰ صفحے بن کر دو روپیه قیمت ہے —

۱۶ دسمبر سنه ۸۰ کے اخبار میں ' تعلیم نسواں ' پر ایک مضمون ہے یه اس طرح شروع ہوتا ہے :—

" ہندوستان کی حالت پر نظر کرکے بعض اخباروں کی رائے ہے کہ اہل ہند اپنی اپنی بی بیوں کو گھر ہی میں تعلیم دیں اور مشن اسکول کی مسوں کو اپنے یہاں آنے سے روکیں یہ رائے بیشک صحیح اور درست ہے لیکن اہل ہند کو اپنے خاندان کی تعلیم کے واسطے وہ علوم مخصوص کرنے چاہئیں جو فرقہ نسواں کے حق میں مفید ہوں " —

بنارس گزٹ

۱۲ جون سنہ ۱۸۸۲ کے بنارس گزٹ میں ایک مضمون کا عنوان ہے " کیا تہذیب اسی کو کہتے ہیں " - لکھتے ہیں : —

" ہم دیکھتے ہیں کہ یورپ کی قومیں جب کبھی مشرق کی طرف اپنا مقدس قدم بڑھاتی ہیں تو عموماً یہی حیلۂ شرعی پیش کرتے ہیں کہ ہم پیغمبر تہذیب ہیں - ہمارا مقصود توسیع سلطنت نہیں بلکہ ہم وحشی قوموں کو زیور شائستگی سے آراستہ کرنے کے لیے جاتے ہیں - یہ بیان ان کا جہاں تک صحیح ہو اس سے ہم کو بحث نہیں لیکن اس قدر ہم ضرور کہیں گے کہ بعض بد تہذیبیاں اس طرف کے ملکوں میں انہیں کے باعث پھیلتی ہیں " —

۱۰ جولائی سنہ ۸۲ کے اخبار میں ایجوکیشن کمیشن پر ایک طویل مضمون ہے —

۲۶ جون سنہ ۸۲ کے اخبار میں " شیشہ بنانے کی ترکیب " پر ایک مفید مضمون ہے - بھٹی کی تصویر اور مفصل ہدایتیں ہیں - اسی اشاعت میں ایک مضمون " یورپ کے معاملات پر ہے - لکھا ہے : —

" آج کل یورپ میں دو ہی مقاموں کی خبروں کی گرم بازاری

ہے - ایک آئرلینڈ دوسرے مصر آئرلینڈ والوں نے جو شور و فساد مچا رکھا ہے اس میں اب تک کمی نہیں نظر آتی اور ہو کیونکر قومی اتفاق ہے کہ تھمتا ...... مصر کی حالت اس سے بڑھ کر نازک ہے - خدیو مصر اور درویش پاشا نے دارالسلطنت کو چھوڑ دیا ہے اور اسکندریہ میں موجود ہیں - ہر ایک سلطنت نے جنگی جہاز اسکندریہ کو روانہ کردیے ہیں تاکہ اس کی رعایا کو جو اسکندریہ میں آباد ہے سوار کرکے وطن پہنچا دے - فرانس اور انگلستان کی حکمت عملی ظاہرا ایک ہے لیکن فرانسیسیوں کا کچھہ اعتبار نہیں کیونکہ وہ تند خو اور ذراسی بات پر بگڑ کھڑے ہونے والے ہیں - آسٹریا اور جرمنی سلطان کے مددگار ہیں .... ادھر یہ ہے اُدھر روس اور جرمنی میں لڑائی کا چرچا ہے ... ... " —

۱۷ جولائی سنہ ۸۲ کے اخبار میں " ہندوستان اور ریشم کی کاشت" پر ایک نہایت مفصل اور عالمانہ مضمون ہے —

آفتاب پنجاب

۳۱ دسمبر سنہ ۱۸۸۰ ع کے اخبار آفتاب پنجاب میں لکھا ہے : —

" حضور پرنس اف ویلز صاحب جو چار لاکھہ کے قرضدار ہیں ان کی طرف سے لارڈ لمستیر نے ایک عرضی اس مضمون کی مسٹر گلیڈ سٹون صاحب کے ہاں پیش کی کہ پرنس کو اس قرضہ کی صفائی تک ایک لاکھہ روپیہ سالانہ زیادہ دیا جائے گلیڈ سٹون صاحب نے اس عرضی کو فرش پر دے پٹکا اور غصے سے کہا کہ قیصرہ ہند ان کو اپنی گرہ سے دینا چاہیں تو دیدیں پر

گورنمنٹ کچھہ نہیں دے سکتی کیونکہ روپیہ کی آگے
ھی ضرورت ھے "—

اسی اشاعت میں کتاب 'توبۃالنصوح پر ریویو درج ھے —

مہر نیمروز - بجنور | ۱۴ فروری سنہ ۱۸۸۱ کی اشاعت میں آزاد مرحوم اس پر تپاک استقبال کا شکریہ ادا کرتے ھیں جو تذکرہ آب حیات کا کیا گیا - اسی ضمن میں فرماتے ھیں :—

" اکثر ذوق و شوق کے وقت تھے کہ سوسائٹیوں اور کمیٹیوں کے مضامین لکھنے میں اڑ گئے - بڑا حصہ عمر گراں بہا کا سر رشتہ تعلیم کی ابتدائی کتابوں کی تصنیف میں صرف ھوا - وہ کتابیں نام کو ابتدائی ھیں مگر مجھہ سے انھوں نے انتہا سے بڑہ کر محنت لی - جاننے والے جانتے ھیں کہ انسان جب تک آپ پختہ نہ بن جائے تب تک بچوں کے مناسب حال کتاب نہیں لکھہ سکتا - پھر انھیں بار بار کاٹنا اور بنانا - لکھنا اور مٹانا - بڈھا ھو کر بچہ بننا پڑا - پھرتے چلتے - جاگتے سوتے بچوں ھی کے خیالات میں رھا - مہینوں نہیں برسوں صرف ھوئے جب وہ بچوں کے کھلونے تیار ھوئے " —

کیا ملک کی مختلف ٹکسٹ بک کمیٹیاں اِن اصولی باتوں پر غور کرنا مناسب سمجھیں گی جو اوپر کے اقتباس سے اخذ ھوتی ھیں۔ یعنی ابتدائی مدرسوں کے لئے نصاب کی کتابیں کیونکر بنائی جائیں اور کون اس کام کا اھل ھے - اسی تحریر میں آزاد مرحوم فرماتے ھیں :—

" خیر میرے پیارے اھل وطن ! یہ تمھاری خدمت ھے وہ تمھارے بچوں کی خدمت تھی - مگر کاش وہ دن جو میری

عمر کی فصل بہار تھی - طبیعت جوان تھی - جوش ٹپکتے تھے - مضامین برستے تھے اور رنگ اڑتے تھے ان تصنیفات میں خرچ ہوتے جن سے میرے اہل وطن کی فلاح و اصلاح ہوتی .... میں اس حال میں بھی تمہیں بھولا نہیں - جو وقت نوکری کے کام سے خالی پاتا تھا اس میں آرام نہ کرتا تھا - بہت کم سوتا تھا - اپنی معلومات کو اور جو اس سے خیالات پیدا ہوتے تھے لکھتا جاتا تھا - اسی میں سے یہ اوراق پریشاں نکالے ہیں جو 'آب حیات' کا جام بنا کر تمہاری ضیافت طبع کے لئے حاضر کئے ہیں " —

آفتاب پنجاب | ۱۱ - مارچ سنه ۱۸۸۱ کی اشاعت میں لکھتا ہے : -

" گورنمنٹ بمبئی نے اپنی سالانہ رپورٹ میں لکھا ہے کہ دیسی اخبارات کی تحریرات سے ہرگز بغاوت نہیں پھیلتی - البتہ جب سرکاری افسر رعایا کی کسی تکلیف کو رفع نہیں کرتے تو اس وقت وہ ملکی ہمدردی سے بڑے جوش کے ساتھہ تحریر کرتے ہیں اور ایسی صورت میں ان کی تحریر سے کارآمد اطلاع حاصل ہو جاتی ہے ' —

ریفارمر - لاہور | اس اخبار نے ۳۰ - جنوری سنه ۱۸۸۲ کی اشاعت میں اعتراض کیا کہ عیسائی قاضیوں (چیپلین) کو ہندوستان کے خزانے سے تنخواہ دینا نہیں چاہیے - اس نے لکھا : —

" گورنمنٹ کی پالسی یہ نہیں ہے کہ کسی مخصوص مذہب کی وہ حمایت یا اعانت کرے تو پھر کوئی وجہ نہیں ہے کہ گرجا گھروں کے لیے جو چیپلین محض عیسائی مذہب کی وعظ کرنے

کے لیے مقرر ہوتے ہیں ان کو اس ملک کے روپیہ سے تنخواہیں
دی جائیں - یہ کارروائی گورنمنٹ کی انصاف پر مبنی نہیں ہے "-

اسی اشاعت میں ایک صاحب جن کا نام رحیم بخش ہے صدر بازار ملتان سے "ایک عجیب بد رسم" کی مذمت کرتے ہیں اور تعلیم یافتوں کو سوشل اصلاح میں کام کرنے کی دعوت دے کر لکھتے ہیں: —

"اہل اسلام کی مستورات محرم میں عشرہ کے دن فصد کھلواتی ہیں - اس کے یہ معنی رکھے گئے ہیں کہ ہمارے آقا اور سردار امام (رضہ) جو اس روز شہید ہوئے ان کی تکلیف میں ہم بھی شریک ہوں ...... جس میں ذرا بھی عقل ہوگی وہ اس بات کے قبول کرنے میں حجت نہیں کرے گا کہ یہ رسم بد ہی ہے ...." —

یہی اخبار ۲ - فروری سنہ ۸۲ کی اشاعت میں 'تیرتھہ' کے موضوع پر لکھتا ہے: —

"تیرتھہ جاترا میں ہمارے ہندو بھائی بہت روپیہ صرف کرتے ہیں اور تکلیفیں اُٹھاتے ہیں اگرچہ بعض لوگ صرف تماشے کے لیے جاتے ہیں مگر اکثر لوگ ثواب حاصل کرنے کی ہی غرض سے تیرتھہ کو جاتے ہیں ......" —

خاتمہ پر شیو جی کا یہ بچن لکھا ہے: —

"اے پاربتی بے وقوف لوگ 'یہ تیرتھہ ہے یہ تیرتھہ ہے' ایسا کہتے ہوئے گھومتے پھرتے ہیں وہ لوگ روحانی تیرتھہ کو نہیں جانتے پس ان کی نجات کیونکر ہو" —

لارڈ لٹن کی حکومت میں جو ورنیکولر پریس ایکٹ ملک میں

جاری ہوا تھا اور جسے لوگ ”گیگنگ ایکٹ“ کہتے تھے لارڈ رپن کی گورنمنٹ نے اسے منسوخ کیا - اس پر اطمینان اور خوشنودی کے اظہار کے لئے انڈین ایسوسی ایشن کی تحریک سے جو جلسہ ۲۴ - مارچ سنہ ۱۸۸۲ کو باشندگان لاہور کا ہوا تھا اس کی کیفیت ۳ - اپریل سنہ ۸۲ کے ریفارمر میں درج ہے- اسی اشاعت میں ایک مضمون ”تہذیب (سویلزیشن)“ پر ہے جس کا ”راقم لاجپت رائے طالب العلم گورنمنٹ کالج لاہور“ ہے- یہ راقم ضرور زندۂ جاوید لیڈر لالہ لاجپت رائے ہیں - گنجائش کی قلت کی وجہ سے صرف ایک سطر اس میں سے اقتباس کی جاتی ہے جس سے پوت کے پانو پالنے میں دیکھے جا سکتے ہیں - وہ سطر یہ ہے :—

”ہمارے تعلیم یافتوں میں یہ ایک بڑی کمزوری ہے کہ وہ اپنے علم و عمل کو ایک نہیں کر سکتے“ —

۲۲ مئی سنہ ۱۸۸۲ کا ریفارمر الہ آباد کے ہائی کورٹ کے بنچ پر مسٹر سید محمود کی تقرری کی خبر شایع کرتا ہے —

۲۶ جون سنہ ۸۲ کا ریفارمر لاہور سے دو نئے پرچوں کے نکلنے کی خوشخبری سناتا ہے- جن میں ایک تو ہندی کا ہفتہ وار اخبار 'ہمنشین' ہے اور دوسرا ماہوار رسالہ ہے جس کا نام 'سوانح عمری' ہے- پہلے کے مالک اور اڈیٹر پنڈت ہز مکند شاستری تھے جو اورینٹل کالج کے تعلیم یافتہ تھے اور دوسرے کے منشی نتھو رام آنند برہم سماجی تھے -

اخبار عام

اب لارڈ رپن کی قانونی کونسل میں وہ قانونی مسودہ پیش ہو گیا تھا جو البرٹ بل کے نام سے مشہور ہے - معلوم ہوتا ہے کہ بنارس کے راجہ شو پرشاد جو دو ایک سال بعد انڈین نیشنل کانگرس کی مخالفت کے علم برداروں میں شامل ہو گئے اُس وقت اس تاریخی بل کے

حق میں تھے اور سر سید احمد خاں اس کے خلاف - ۱۲ مئی سنہ ۱۸۸۳ کا اخبار عام اس پر ایک تیز مضمون لکھتا ھے —

پایا جاتا ھے کہ کونسل میں ان کے وطن کی ھمدردی سے دور رہنے سے غضب ناک ھوکر پبلک نے کلکتہ میں ان کا پتلا جلایا تھا - جس کی تفصیل ۵ مئی سنہ ۱۸۸۳ کے اخبار عام میں ھے —

۲ مئی سنہ ۸۳ کے اخبار عام میں آب حیات کے دوسرے اڈیشن کا اشتہار مصنف کی طرف سے دیا گیا ھے - اب اس کی قیمت بعض مضامین کی ایزادی کی وجہ سے ایک روپیہ کی جگہ سوا روپیہ ھوگئی-

۳ جنوری سنہ ۸۳ کا اخبار عام ناردرن سٹیٹ ریلوے پر انٹر میڈیٹ کے کھلنے کی خبر دیتا ھے -

۰ جنوری سنہ ۸۳ کے اخبار عام کا افتتاحیہ ان الفاظ سے شروع ھوتا ھے :-

"موجودہ امتحان سول سروس کے خوفناک قواعد سے اس امید کو منقطع دیکھکر کہ اس امتحان میں دیسی لوگوں کا کامیاب ھونا ناممکنات سے ھے ھم مجبور ھوتے ھیں کہ گورنمنٹ سے درخواست کریں کہ یہ امتحان بالکل موقوف کیا جاے" -

۰ا مارچ سنہ ۸۳ کے اخبار عام میں ایک نظم ھے - جس کے چند شعر نقل کئے جاتے ھیں :-

اے ساکنان خطۂ ھندوستاں بڑھو — آگے نکل گئے ھیں بہت کارواں بڑھو
تا نام ایشیا کا جہاں میں بلند ھو — کاندھے پہ رکھہ کے قوم کا اونچا نشاں بڑھو
بیٹھے ھو پانو توڑ کے کیوں کنج غم میں تم — دیکھو ذرا نشیب و فراز جہاں بڑھو
ھم لوگ تم میں ھیں کہ جرس کارواں میں ھے — چلا رھا ھے طوطئے ھندوستاں بڑھو

۱۴ اپریل کے اخبار عام میں ھندوستانیوں کے والنٹیر بننے کی

اجازت پر ایک نوٹ ہے - ہوا یہ تھا کہ والنٹیر بننے کے لیے ہندوستانی ہونے کی جو روک تھی وہ ہٹادی گئی - مگر ان کی والنٹیر فوجیں الگ قایم نہیں ہوئیں اور صرف یہ ہوا کہ انگریزی والنٹیر فوجوں میں وہ شامل ہوسکتے تھے - امر واقعہ یہ ہے کہ قید اڑانے کا نتیجہ واقع میں کچھہ نہ نکلا - انگریز والنٹیروں نے شاید کسی ہندو یا مسلمان کو اپنے میں شامل کیا ہو - ہاں پارسی دو چار ضرور شامل کرلیے تھے —

ریختی اخبار دھلی | ۲۴ ستمبر سنہ ۱۸۸۱ کا ریختی اخبار مولوی فتح الدین بسمل مالک اخبار پنجاب پنچ عرف اخباروں کا قبلہ گاہ کی وفات پر افسوس کرتا ہے —

خیر خواہ ہند- دھلی | یکم نومبر سنہ ۱۸۸۱ کا اخبار ایک خبر دیتا ہے - امید ہے اس کو آج کل کی فلم بنانے والی کمپنیاں دلچسپی سے پڑھیں گی - وہ یہ ہے :—

" لندن سے ڈاک روانہ ہونے سے ایک آدہ روز پہلے رسل سٹریٹ میں جوڈروری لین تھیٹر کے عقب میں ہے یہ واقعہ ہوا - اس تھیٹر میں بڑے دن کے واسطے تماشوں کا سامان ہو رہا تھا اور اشتہار دیا گیا تھا کہ سو لیڈیاں جوان ' کم عمر سڈول جسم کی درکار ہیں - اشتہار دیکھتے ہی رسل سٹریٹ میں سو کی جگہہ پندرہ سو آگئیں اور تمام تھیٹر کو گھیر لیا سڑک پر گاڑیوں سے راستہ بند تھا " -

یہی اخبار مٹیا برج کلکتہ کی ایک خبر دیتا ہے - جہاں اودہ کے معزول بادشاہ واجد علی شاہ رہا کرتے تھے - وہ خبر یہ ہے :-

" ذوالفقارالدولہ پر نالش دایر ہوئی ہے - صاحب عالم بہادر

مستغیث ہیں - دعویٰ یہ ہے کہ ذوالفقار الدولہ کی ایک جابرانہ ممانعت سے نواب تابار محل کی زندگی میں خلل آیا " -

۱۹ دسمبر سنہ ۸۱ کے اخبار سے پایا جاتا ہے کہ ۲۴ دسمبر سنہ ۸۱ کو لاہور میں ایک نمایش کھلنی تھی یہ پنجاب کی غالباً پہلی نمایش ہو -

۲۴ اکتوبر سنہ ۱۸۸۳ کا پرچہ لارڈ رپن کے دوسرے معرکة الآرا بل یعنی لوکل سلف گورنمنٹ بل کے پاس ہونے کی خبر دیتا ہے۔ یہ معلوم کر کے آپ محظوظ ہوں گے کہ اینگلو انڈین اخبار برسوں تک اسے بگاڑ کر لوکل سلف لکھتے رہے —

علم کی پیاس یہاں تک اور علمی کتابوں کی کمی اتنی تھی کہ پنڈت دھرم نارائین ھاکسر نے جان سٹوارٹ مل کی پولیٹیکل اکونومی کا جو ترجمہ اردو میں کیا تھا وہ امرتسر کے سفیر ھند میں سنہ ۱۸۸۰ ع میں بہ اقساط چھپتا رہا —

تبصرہ

اب ہم اپنے قایم کئے ہوے آخری عہد سے بھی رخصت ہوتے ہیں - آپ کو خیال رہے کہ اس عہد کو اب پورے پچاس برس گزرے - ہمارے اس دور کا اخیری سال یعنی ۱۸۸۴ ع دو امور کے لیے بہت ممتاز ہے - ایک تو یہ کہ اسی سال مولوی سید احمد مولف فرہنگ آصفیہ نے دھلی سے ایک اخبار محض صنف نازک کے لئے نکالا - جس کا نام " اخبارالنسا تھا - اور دوسرے یہ کہ اسی سال منشی محرم علی چشتی صاحب کے اخبار رفیق ہند کا جنم ہوا - اس اخبار نے پنجاب کی صحافتی دنیا میں نئی روح پھونکی —

۱ - یہ دور اگرچہ مدت میں اور دوروں سے نصف اور کسی سے اور بھی کم زمانہ کو احاطہ کرتا ھے لیکن اس کی اھمیت کسی سے کم نہیں ترمیم ضابطہ فوجداری - لوکل سلف گورنمنٹ بل - مہاراجہ دلیپ سنگھ کا معاملہ - دھلی کالج کے حق میں اجی ٹیشن - ڈاکٹر لایٹنر وغیرہ کے خلاف اظہار نفرت جنھوں نے ایجوکیشن کمیشن میں مخالفانہ اور انگریزی زبان کی تعلیم کے خلاف شہادت دی تھی - سر سید اور ان کی اصلاحی اور تعلیمی تحریک اور اس کی مخالفت - ھندوستانیوں کے خون کے قصاص کا مطالبہ - حالانکہ وایسرائے کی قانونی کونسل میں غیر سرکاری ممبر گورنمنٹ کی پسند سے نامزد ھوتا تھا لیکن ایک خاص ممبر کی نسبت یہ کہنا کہ وہ ممبر قوم فروش ھے اسے ممبری سے الگ کرکے جس پر پبلک کو اعتماد ھو اسے ممبر بنایا جاے - یہ اور ایسے کئی امور جو تفصیل کے محتاج نہیں ان چند سالوں کے عرصہ میں ایسے پیش آے جو ملک میں بیداری اور جانداری کا بین ثبوت ھیں - بات یہ بھی ھے کہ پریس کا وہ گل گوتھو قانون بھی منسوخ ھوچکا تھا - لیکن یہ امر ذھن نشین رھے کہ کانگریس ابھی پیدا نہیں ھوئی تھی - اس کا جلم سنہ ۱۸۸۵ میں ھوگا - سیاسی بیداری کے ساتھہ لوگوں میں سوشل اصلاح اور معاشرت کے دوسرے شعبوں کی اکھاڑ پچھاڑ کی چیٹک بھی شروع ھوگئی تھی - یہ سب کچھہ تو تھا لیکن ملیات کے لوث سے اردو صحافت کا دامن اب تک بالکل پاک رھا - اسی سلسلے میں ایک امر کا واضح کردینا ضروری معلوم ھوتا ھے - وہ یہ کہ جناب چکبست مرحوم نے ایک مضمون میں لکھا (ان کے مضامین کا مجموعہ چھپ گیا ھے) کہ سواے لارنس گزٹ کے پرانے اردو اخبار سیاسی معاملات سے مس نہیں

رکھتے تھے - مرحوم کی نظر تنقید اور ذوق تحقیق کو تسلیم کرتے ہوے مجھے افسوس کے ساتھہ کہنا پڑتا ھے کہ معاملہ اس کے بالکل برعکس ھے - لارنس گزٹ کی کئی جلدیں میرے ہاں موجود ھیں مگر ان میں کہیں بھی سیاسی دلچسپی کا کوئی مضمون نہیں ملتا برخلاف اس کے اور اخبار جو دلچسپی سیاسی معاملوں میں لیا کرتے تھے اس کے نمونے آپ ابھی دیکھہ چکے ھیں —

۲ - زبان کے بارے میں اودہ اخبار اور اکمل الاخبار سب سے آگے پاے گئے ان میں بھی اودہ اخبار کو فوقیت حاصل ھے - انشا سے فارسی اسلوب اور جملے کے ارکان کی ترتیب اب قریب قریب غایب کے تھی - اور اردو نے اردو کا خانہ ساز جامہ پہنا تھا - ہاں انگریزی کے الفاظ اس چار پانچ برس کے دور میں بہت دخل پا گئے - جیسے :- اڈیٹوریل - پولیٹیکل اٹما سفیر - پسمیسٹ - آپٹمسٹ - وغیرہ وغیرہ - قلمی کتابیں جنہیں آج کل قاموسی نام 'مخطوطات' دیا جاتا ھے اس دور میں 'دستی' کتابوں کے نام سے پکاری جاتی تھیں - قصہ مختصر صحافت کی زبان منجھنے لگی تھی - اودہ اخبار کا ایک جملہ دیکھئے اور آج کل کی اخباری زبان کا اُس سے مقابلہ کیجئے لکھا ھے :- " دہلی کالج جیسے نام آور کے توٹ جانے سے دہلی کے باشندوں کے دل توٹ گئے - ان کی آنکھیں دہلی کالج کو ڈھونڈ رہی ھیں " صنف نازک کی تعلیم و تربیت اور ان کے لئے خاص اخبار کا اہتمام بھی اس عہد کی بالغ نظری کا ثبوت ھے —

۳ - املا میں بھی قدرے اصلاح ہوئی - وقفے عموماً استعمال ہونے لگے - اقتباس کے لئے واوین بھی مستعمل ہوے - مگر اول لفظ کے الف مضموم کے ساتھہ 'واو' کا پن چھلا اور 'پہنچنا' میں واو کی ایزادی وغیرہ چیزیں قائم رھیں - یاے آخر لفظ کا امتیاز ابھی تک

قائم نہیں ہو سکا —

اس عہد کے اخباروں میں اشتہاروں کی تعداد اور نوعیت میں بہت ترقی ہوئی - ہالوی صاحب کا مرہم اور گولیاں تو اس بارے میں اولیت کا امتیاز رکھتی ہیں اب گریمالٹ کمپنی کا سرپ آف ہائی پوسفیٹ آف لایم بھی اشتہاری کالموں میں داخل ہوگیا - ان دو تین دواؤں کے سوا بدیشی چیزوں کے اشتہار دیکھنے میں نہیں آے - ہاں دیسی صنعت و حرفت کی چیزوں کے اشتہاروں کی تعداد ترقی پر تھی- اور ایک صوبے کی چیزوں کے اشتہار دوسرے صوبوں کے اخباروں میں نکلنے لگے تھے —

ایک بات اور نوٹ کے قابل ہے - اب تک بعض گھٹیا اخباروں کی چندے کی شرح میں بہ اعتبار خریداروں کے جو فرق و امتیاز تھا وہ اب بھی جاری رہا - مثلاً خیر خواہ ہند دہلی کی قیمت ' نوابان والا شان و راجگان بلند مکان و سرکار انگلشیہ کے لئے پیشگی سالانہ ۳۰ - رؤسا کے لئے ۱۵ روپے - ملازم آدمیوں سے بہ حساب تنخواہ اگر پچاس روپیہ ہو چار آنہ ماہوار اور جو صاحب کم مقدور ہوں وہ صرف دو روپیہ پیشگی سالانہ اور محصول ڈاک دے دیا کریں - اس میں بہت گڑ بڑ ہے - اسی حیثیت کے دوسرے اخباروں نے صرف تین نرخ رکھے ہوے تھے یعنی گورنمنٹ اور والیان ریاست - روسا و معززین اور عام پبلک کے لئے چندے کا یہ امتیاز کوہ نور - اودھ اخبار اور اخبار عام جیسے اخباروں نے نہیں رکھا تھا - ان کا چندہ ہر ایک کے لئے یکساں تھا —

خاتمہ

۱ - مجھے افسوس ہے کہ میں نے اپنے ہاتھہ خود ہی باندہ لئے اگر ایسا نہ ہوا ہوتا تو میں سنہ ۱۸۹۶ ع کے پیسہ اخبار کی ایک

اشاعت کا مفصل ذکر کرتا - سر دست صرف اس پر اکتفا کرتا ہوں کہ منشی محبوب عالم مرحوم کے مشہور پیسہ اخبار کا ۷ - نومبر سنہ ۱۸۹۹ کا برچہ ایک خاص اور تاریخی نمبر تھا - اس لئے کہ اس کے تمام مندرجات نظم و نثر خواتین کے قلم سے نکلے ہوے تھے —

پیشتر اس سے کہ میں آپ سے رخصت ہوں چند اعداد و شمار کا پیش کرنا منظور ہے جو سرکاری رپوٹوں وغیرہ سے ماخوذ ہیں - سرکاری کاغذات سے صرف صوبہ پنجاب کے اُردو اخباروں سے متعلق یہ دریافت ہوا ہے کہ ان کی مجموعی اشاعت سنہ ۱۹۱۷ ع میں دو لاکھ چھیالیس ہزار- سنہ ۱۹۱۸ ع میں تین لاکھ بیس ہزار- سنہ ۱۹۱۹ ع میں تین لاکھ بیالیس ہزار- سنہ ۱۹۲۰ ع میں تین لاکھ اٹھاون ہزار اور پچھلے سال یعنی سنہ ۱۹۳۳ ع میں چھہ لاکھ کے قریب یعنی پانچ لاکھ چورانوے ہزار تھی - حال میں جو اعداد پنجاب کی قانونی کونسل میں بتائے گئے وہ صرف چند مشہور روزانہ اخباروں سے تعلق رکھتے ہیں - اس فہرست میں اور زبانوں کے بھی اخبار شامل ہیں جس سے بالمقابل موازنہ خوب ہوسکےگا- پنجاب لجیس لیٹو کونسل کے اجلاس میں جو ۲۴ - اکتوبر سنہ ۱۹۳۴ کو لاہور میں ہوا فنانس ممبر نے ایک سوال کے جواب میں پنجاب کے بڑے روز ناموں کی اشاعت کے یہ اعداد پیش کئے :- (۱) ٹریبیون پندرہ ہزار- (۲) سول اینڈ ملٹری گزٹ بارہ ہزار- (۳) ڈیلی ہرلڈ پانچ ہزار- (۴) ایسٹرن ٹائمز ایک ہزار تین سو جیسا کہ آپ جانتے ہیں یہ سب اخبار انگریزی کے ہیں- (۵) ہندی ملاپ پانچ ہزار- (۶) اکالی پترکا دو ہزار تین سو- اب اردو کے اخبار شروع ہوتے ہیں- (۱) پرتاب گیارہ ہزار دو سو پچیس- (۲) ملاپ گیارہ ہزار دو سو پچیس- (۳)

بندے ماترم تین ہزار۔ (۴) ویر بھارت دو ہزار پانچ سو۔ (۵) انقلاب تین ہزار چار سو پچھتر۔ (۶) زمیندار تین ہزار دو سو اسی۔ (۷) سیاست ایک ہزار —

بہر حال یہ امر اطمینان بخش ہے کہ اُردو اخباروں کی تعداد اور اشاعت روز بروز بڑھ رہی ہے —

یہ بتانا آپ کو متعجب کرے گا کہ پنجاب میں انگریزی صحافت کے بانی بھی اہل اُردو تھے۔ انگریزی اخبار لاہور کرانیکل دہلی کے محمد عظیم نے سنہ ۱۸۴۹ ع میں لاہور سے جاری کیا۔ یہ بزرگ پنجاب کے مشہور مورخ سید محمد لطیف کے والد تھے۔ لاہور کرانیکل پنجاب کا پہلا انگریزی اخبار تھا۔ لاہور کرانیکل نام اور ملکیت بدلتے بدلتے اس وقت آپ کے لاہور کے سول اینڈ ملیٹری گزٹ کی شکل میں موجود ہے۔ یہ امر واقعہ بھی ہر منصف مزاج کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ اہالی اردو اور دیسی زبانوں کے حاسد یا دشمن ہرگز نہ تھے۔ کیوں کہ ہم دیکھتے ہیں کہ پنجابی زبان کا سب سے پہلا اخبار بھی انھیں بزرگ محمد عظیم موصوف نے لاہور سے سنہ ۱۸۵۶ ع میں نکالا۔ اس کا نام بھی 'پنجابی' تھا۔ یہ اخبار پنجابی زبان میں اور گورمکھی اور پہلو بہ پہلو فارسی حروف میں چھپتا تھا اور سنہ ۱۸۹۰ ع تک زندہ رہا —

ایک بات اور کہنی ہے اس سے پہلے کہ میں ختم کروں۔ وہ یہ کہ آج کل ہمارے انگریزی خواں ارباب وطن مغرب کی پیروی میں ہر موضوع کا بالمقابل مطالعہ اور موازنہ طلب کرتے ہیں۔ اس لکچر میں اس طرح کی کمپیریٹو سٹڈی کے نتیجے پیش کرنا غیر ممکن ہے۔ لیکن میں نے پہلے ہی اس کا کسی قدر خیال رکھا ہے۔ اُردو پریس کے بیان کے ساتھ اور

ورنیکولر زبانوں کے اخباروں کے کوایف پیش کرنا تو یہاں نہایت دشوار ہے لیکن یہ بتایا جاسکتا ہے کہ جہاں سے هندوستان کا سب سے پہلا اخبار نکلا تھا وهاں یعنی کلکتہ میں بنگالی پریس کا کب جنم هوا - تحقیق سے پایا جاتا ہے کہ بنگال میں دیسی زبان کے کئی اخبار انیسویں صدی کے اول ربع میں نکلے ان کے نام اور تاریخ اجرا پر اکتفا کیا جاتا ہے :—

۱ - سما چار درپن - ۲۳ - مئی سنہ ۱۸۱۸ ع - بعض محققوں کی راے ہے کہ یہ اخبار سنہ ۱۸۲۱ ع میں جاری هوا تھا -

۲ - برهمن سبدھی - ستمبر سنہ ۱۹۲۱ ع -

۳ - سمباد کومُدی - ۴ - دسمبر سنہ ۱۹۲۱ ع - یہ اخبار راجہ رام موهن راے نے 'رسم ستی' کے خلاف پراپگنڈا کرنے کو نکالا تھا -

۴ - سما چار چندرکا سنہ ۱۹۲۱ع اسے بابو بھبانی چرن بندیو پادھیایہ نے نکالا تھا —

۵ - سمباد تمرناشک سنہ ۱۸۲۳ ع -

اس اجمال سے یہ امر واضح هوگا کہ همارا اُردو پریس بنگال کے بنگالی پریس سے بہت پیچھے نہیں رها - بلکہ یہ کہنا درست هوگا کہ بنگال میں دیسی زبان کے پریس کا ظہور سنہ ۱۸۲۱ ع یا سنہ ۱۸۱۸ ع سے بہت پہلے هونا چاهیے تھا - کیوں کہ اهل بنگال سنہ ۱۷۸۱ ع سے پریس کی هستی سے واقف هوچکے تھے —

اب میں آپ سے رخصت هوتا هوں اور ایک بات جو شروع میں عرض کی تھی اب پھر عرض کرتا هوں کہ جو واقفیت قدیم اور اب سے نصف صدی سے پیشتر کی صحافت سے متعلق آپ کی خدمت میں پیش کی گئی اس کی نسبت مکمل هونے کا هرگز ادعا نہیں - هاں اقتباس

کی صحت کا میں ذمہ دار ہوں- کیا اچھا ہو کہ لٹریچر کے اس اہم شعبہ کی تواریخ کی تکمیل کا کام مجھ سے زیادہ اہل اور زیادہ وسایل تلاش رکھنے والے حضرات اپنے ذمہ لیں یا اس کام میں میری اعانت فرمائیں تاکہ یہ کام پورا ہو جاے- ورنہ یہ تو سنتے ہی آے ہیں :-

کار دنیا کسے تمام نہ کرد



ضرب الامثال اور ان کے ماخذ

از

جناب شیخ محمد اسماعیل صاحب پانی پتی

(۲)

دودھ کا دودھ پانی کا پانی

یہ مثل ایسے موقع پر بولتے ہیں جب کسی مقدمہ میں حاکم نہایت منصفانہ فیصلہ کرے - یا کسی معاملہ میں خود ہی قدرت کی طرف سے دو ٹوک فیصلہ ہو جائے کہتے ہیں کہ یہ مثل اس طرح مشہور ہوئی کہ ایک حلوائی دودھ میں پورا آدھا پانی ملا کر فروخت کیا کرتا تھا - اور اس طرح دودھ بیچ کر اس نے دوسو روپے جمع کئے - جب دو سو ہو گئے تو اس نے ان کو ایک ہمیانی میں رکھا اور اپنی کمر سے باندھ کر وطن کو روانہ ہو گیا - راستہ میں دریا پڑتا تھا وہ کنارے پر کچھ دیر کے لئے ٹھہر گیا - ہمیانی کمر سے کھول کر نیچے زمین پر رکھ دی اور خود دریا پر ہاتھ منہ دھونے اور پانی پینے لگا - اس ساری کارروائی کو ایک بندر درخت پر بیٹھا ہوا خاموشی سے دیکھ رہا تھا - جب حلوائی پانی پینے کو ذرا نیچے جھکا بندر جھٹ درخت سے اُتر کر چپکے چپکے آیا اور ہمیانی اُٹھا درخت پر جا بیٹھا - حلوائی نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو بندر ہمیانی اُٹھائے لئے جا رہا

تھا - وہ اُس کے پیچھے دوڑا مگر بے سود - اب ستم ظریفی سنیے - بندر نے درخت پر اطمینان سے بیٹھ کر همیانی کھولی - اور اس میں سے ایک روپیہ نکالا اور تھوڑی دیر تک اُسے دیکھنے کے بعد دریا میں پھینک دیا - حلوائی نے بیتاب ہو کر کہا - " ہے ہے ظالم ! کیا غضب کرتا ہے - میری سالہا سال کی گاڑھی کمائی کو یوں پانی کے راستے بہاتا ہے - بندر نے جھٹ دوسرا روپیہ نکالا اور اسے تاک کر حلوائی کے سر پر مارا - اگرچہ چوٹ تو لگی - لیکن اس بات کی امید بندھ گئی کہ اب بندر سارے روپے خشکی ہی پر پھینکے گا - بندر نے اب تیسرا روپیہ نکالا - اور دریا میں ڈال دیا - پھر چوتھا نکالا اور خشکی میں پھینکہ دیا اور اس طرح آدھے روپے اُس نے دریا میں پھینک دیے اور آدھے خشکی پر - اُس وقت حلوائی نے کہا " میں سمجھ گیا - دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہوگیا - جتنے دودھ کے دام تھے وہ میرے پاس آگئے - جتنی پانی کی قیمت تھی وہ پانی میں مل گئی "-

---

دھم دھم هیچ نہ غم ، مرے سو ہم

یہ مثل ایسے موقع پر بولی جاتی ہے - جب یہ ظاہر کرنا ہو کہ سب سے زیادہ مصیبت اور آفت میں ہم ہی ہیں - اس مثل کی ابتدا کے متعلق یہ قصہ عوام میں مشہور ہے کہ ایک بنیا اتفاق سے سفر پر روانہ ہوا - راستے میں اسے پیاس لگی - ڈوری لٹیا اس کے پاس تھی - تھوڑی دور پر ایک کنواں مل گیا - اس نے ڈوری کو کھول لٹیا کوئیں میں ڈال بھرنی چاہی - ابھی پانی سے بھری ہوئی لٹیا کنویں میں آدھے ہی راستے پر تھی کہ ڈوری میں سے نکل کنویں میں جا پڑی - بنیے نے سوچا یہ تو کچھ نہ ہوا - مفت میں لٹیا ہی کا نقصان ہوا - یہ نقصان اسی

طرح پورا ہو سکتا تھا کہ کنویں میں اتر کر لٹیا کو لایا جائے - چنانچہ لٹیا لانے کے لئے بنیا کنویں میں اترا پانی تک پہنچا ہی تھا کہ دیکھا ایک کالا سانپ عین پاؤں کے نیچے بیٹھا پھنکاریں مار رہا تھا بنیے کے اوسان جاتے رہے - افتاں و خیزاں واپس لوٹا - ابھی تھوڑی دور اوپر چڑھا تھا - کیا دیکھتا ہے کہ ایک بڑا شیر کنویں پر کھڑا دھم دھم کر رہا ہے - نیچے نظر کی تو سانپ کو یہ کہتے سنا کہ ہوچ نہ غم (ہمیں کیا پروا ہے - شیر تجھے پھاڑے گا) اس وقت بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا " مرے سو ہم ' یعنی ہماری قضا آگئی - نیچے اترتا ہے تو سانپ ڈسے گا - اوپر جاتے ہیں تو شیر کھائے گا - جب ہی سے یہ مثل بولی جانے لگی —

دیکھہ مردوں کی پھیری ' یہ ماں میری یا تیری

یہ مثل ایسے موقع پر بولتے ہیں - جب کوئی آدمی اپنے خیال میں کسی شخص کو دھوکا دینے اور الو بنانے کی کوشش کرے مگر وہ شخص اس آدمی سے بھی زیادہ چالباز ثابت ہو - اس کی ابتدا کے متعلق یہ مزیدار قصہ مشہور ہے کہ ایک مرتبہ ایک میاں بیوی میں یہ بحث ہوئی کہ دونوں میں سے کون زیادہ ہشیار ہے عورت کہتی تھی میں اور مرد کہتا تھا نہیں میں - آخر یہ طے پایا کہ دونوں ایک دوسرے کا امتحان لیں - دونوں میں سے جو دوسرے کو دھوکا دینے میں کامیاب ہوجائے وہی زیادہ ہوشیار مانا جائے - خیر بات گئی گذری ہوئی - اور دونوں فکر میں رہنے لگے کہ موقع پڑے تو دوسرے کو دھوکہ دیں - بہت دنوں کے بعد ایک دن جب کہ عورت نے خیال کیا کہ اب خاوند اُس دن کی شرط کو بالکل بھول گیا ہوگا - اُس نے پلنگ پر لیٹ کر چلانا اور شور مچانا شروع کیا - خاوند گھر ہی

میں تھا - وہ دوڑا ہوا آیا اور کہنے لگا کیوں کیا ہوا؟ عورت نے کہا اس وقت بیٹھے بیٹھے سر پھٹا جا رہا ہے - جلدی کچھہ دوا کرو - ورنہ میں کوئی دم کی مہمان ہوں - خاوند بیچارہ دوڑا دوڑا گیا - حکیم کو بلاکرلایا - دوا پلائی - مگر کچھہ افاقہ نہ ہوا جب پےدر پے بہت سی دوائیں استعمال کرنے کے بعد بھی آرام کی صورت نظر نہ آئی تو بیوی نے درد سے کراہتے ہوے میاں سے کہا کہ مجھے ایک سیانے نے سر کے درد کا ایک نہایت مجرب عمل بتلایا تھا اگر تم وہ کر سکو تو یقین ہے کہ مجھے فوراً شفا ہو جاے گی - خاوند نے کہا - میں ضرور کروں گا - بتلاؤ وہ کس طرح ہے؟ بیوی نے کہا اُس نے بتلایا تھا کہ اپنی ساس کے سر کے بالوں کی ایک لٹ اگر تو اپنے تکیے کے نیچے رکھے گی تو کبھی سر کا درد نہیں ہوگا - اور اگر درد ہو رہا ہوگا تو فوراً رفع ہو جاے گا - میں نے اب تک تم سے اس لئے نہیں کہا کہ شاید تم برا مانو! اور مجھہ پر ناراض ہو - مرد نے جواب دیا - واہ! تم نے اب تک مجھے کیوں نہ بتایا؟ تم ایک لٹ کہتی ہو میں سارے سر کے بال اُتروا کر لے آتا ہوں - یہ کہتے ہی وہ بھاگا بھاگا کمال ہوشیاری کے ساتھہ بجاے بیوی کی ساس یعنی اپنی ماں کے اپنی ساس یعنی بیوی کی والدہ کے پاس پہنچا اور ہانپتا ہوا کہنے لگا - تمہاری بیٹی کے اس وقت سر میں نہایت شدید درد ہو رہا ہے - کسی نے اُسے یہ بتایا ہے کہ تمہارے سر کے بال اُس کے تکیے کے نیچے رکھے جائیں تو فوراً آرام ہو جاے گا - ماں بیچاری مامتا کی ماری حواس باختہ ہو گئی اور اُس نے فوراً اپنے سر کے سارے بال اُتروا داماد کے حوالے کئے خاوند صاحب اُن کو لئے ہوے خوش خوش بیوی کے پاس پہنچے اور کہنے لگے لو میں بال لے آیا ہوں - بالوں کو دیکھتے ہی بیوی صاحبہ کھل کھلا کر ہنس پڑیں

اور کہنے لگیں - دیکھی تم نے عورتوں کی چالاکی - کس ہوشیاری کے ساتھہ میں نے تمہارے هی هاتھوں سے تمہاری ماں کے بال اُتروا لئے اور تمہیں شبہہ بھی نہ ہوا کہ کیا چالاکی کی جا رہی هے - مرد مسکرایا اور کہنے لگا اچھا ذرا تھرو میں ابھی آتا هوں - تھوڑی دیر میں وہ پھر واپس آیا اور اُس کے ساتھہ دو عورتیں تھیں - ایک ساس اور ایک والدہ اس نے دونوں کو لاکر بیوی کے سامنے کھڑا کردیا - اور هنس کر کہنے لگا - " دیکھہ مردوں کی پھیری (یعنے چالاکی) یہ ماں میری یا تیری " - جب عورت نے دیکھا کہ بجاے میری ساس کے میری ماں کے سر کے بال سارے اڑے ہوے هیں تو وہ نہایت خفیف اور خجل ہوئی - اس نے مرد کو دھوکا دینا چاھا تھا - مرد بھانپ گیا اور اس نے عورت کو ایسا چکمہ دیا کہ ساری عمر یاد کرتی ہوگی —

دیکھئے اُونٹ کس کروٹ بیٹھتا هے

یہ مثل ایسے موقعہ پر بولتے هیں - جب کسی بات کا انجام معلوم نہ هو اور امید و بیم کی سی حالت هو - اس مثل کی ابتدا کے متعلق یہ قصہ بیان کیا جاتا هے کہ ایک کمہار اور ایک سبزی فروش نے شراکت میں ایک اونٹ کرایہ پر لیا - اور اس کے ایک طرف ترکاری اور دوسری طرف مٹی کے برتن باندہ کر دونوں شہر سے اپنے گاؤں کو چل پڑے راستہ میں اونٹ گردن پھیر کر ترکاری کھاتا جاتا تھا - یہ دیکھہ کر کمہار سبزی فروش کا مذاق اڑانے لگا - سبزی فروش نے کہا " میرے نقصان پر کیا هنستا هے - ابھی تو یہ دیکھنا هے کہ " اونٹ کس کروٹ بیٹھتا هے " - اس کے بعد پتہ لگیگا کہ نقصان کس کا زیادہ ہوا ؟ اتفاق کی بات کہ منزل مقصود

پر پہنچ کر اونٹ برتنوں کی طرف بیٹھا - جس کی وجہ سے سارے برتن چکنا چور ہوگئے - اب تو کنجڑے کی بن آئی اور کہنے لگا کہ "میں نہ کہتا تھا کہ دیکھئے اونٹ کس کروٹ بیٹھے - اب میری تو تھوڑی سی ترکاری اونٹ نے کھائی اور تیرے سارے مال کا صفایا ہو گیا تب سے یہ مثل بولی جانے لگی —

ڈوبا بنس کبیر کا جو جاے پوت کمال

رام رام دھن بیچ کے لاے چار ھنوال

یہ مثل ایسے موقع پر بولتے ھیں جہاں اولاد کے متعلق یہ بتانا مقصود ہوکہ وہ نہایت نالائق اور ناخلف ھے - مثل کا سلیس ترجمہ یہ ھے کہ کبیر کی نسل ھلاک ہوگئی جس میں کمال جیسا لڑکا پیدا ہوا - جس نے عاقبت کو چھوڑ کر دنیا کو اختیار کیا - ھنوال کے معنی گدھے یا خچر کے ھیں - اس کا قصہ یوں مشہور ھے کہ کبیر بھگت کے زمانہ میں کسی راجہ کا لڑکا اتنا شدید بیمار ہوا کہ جان کے لالے پڑ گئے - ہر چند علاج کئے مگر مرض بڑھتا ہی گیا - جب کوئی چارہ کار باقی نہ رہا تو ایک دن کسی شخص نے راجہ کو صلاح دی کہ کبیر کا لڑکا شاہ کمال بڑا پہنچا ہوا فقیر ھے - اگر راجہ اس کے پاس جائے اور اپنے لڑکے کے لئے اُس سے صحت کی دعا کرائے تو یقین ھے کہ اس کی دعا سے لڑکے کو تندرستی حاصل ہوگی - راجہ مصیبت کا مارا شاہ کمال کے پاس پہنچا - اور خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ شاہ کمال کی دعا سے راجہ کے لڑکے کو صحت ہوگئی - اس پر راجہ نے بطور اظہار شکر گذاری کے بہت سی اشرفیاں چار خچروں پر لدوا کر شاہ کمال کے حضور میں بطور نذر بھیجیں - شاہ کمال نے اُن کو قبول

کر لیا - اور اُن کا ڈھیر اپنے مکان کے صحن میں لگوا دیا - اس وقت
گھر میں کبیر بھگت موجود نہیں تھے - کہیں باہر گئے ہوئے تھے - واپس
آئے تو دیکھا کہ انگنائی میں اشرفیوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے - بڑا تعجب
ہوا کہ یہ اشرفیاں کہاں سے آئیں - بیٹے نے سارا واقعہ باپ کی
خدمت میں عرض کیا - یہ سن کر کبیر بیٹے پر بہت ناراض ہوئے کہ
تونے یہ اشرفیاں لے کر اپنی خودداری اور استغنا کو بٹہ لگایا - اور
دعا کے بدلے میں یہ اشرفیاں کیوں وصول کیں - اُس وقت اُنہوں نے یہ
دوہا پڑھا - جو بعد میں زبان زد عوام ہوگیا - اور بعد میں عام طور
پر ایسے شخص کے متعلق بولا جانے لگا جو اپنی نازیبا حرکتوں سے اپنے
آبا و اجداد کو بد نام کرے —

ڈوم کا تیر خدا جھوٹ کرے

یہ مثل ایسے موقع پر بولتے ہیں جہاں کوئی شخص کسی مشکل
میں پھنس جاے اور وہ اپنی مصیبت کو عام لوگوں سے مخفی رکھنا
چاہتا ہو - یا کوئی شخص کسی بالکل ظاہر بات کو چھپانا چاہے اُس
وقت بولتے ہیں - اس کا قصہ اس طرح مشہور ہے کہ ایک دفعہ اتفاقاً
کسی ڈوم کی ران میں ایک تیر لگ گیا - اور زخم سے خون بہنے لگا -
لوگوں نے دیکھا تو ہمدردی کا اظہار کرنے لگے - مگر ڈوم زخم پونچھتا
جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا - خدا نہ کرے کہ میرے تیر لگے - خدا
کرے کہ لوگوں کا یہ کہنا جھوٹ ہوجاے کہ میرے تیر لگا - تماشائیوں نے
سنا تو ہنسنے لگے کہ بے وقوف جب تیر لگ چکا تو اب کیا جھوٹ ہوگا -
اُس وقت سے یہ مثل بولنے لگے —

رام رام دونیاں گلے مل چونیاں

یہ مثل ایسے موقع پر بولتے ھیں جب کوئی عیار اور چالاک شخص بہ نسبت غیروں کے اپنے دوستوں اور واقفکاروں کو کسی خرید و فروخت کے معاملہ میں زیادہ لوٹے - اوروں سے اگر کسی چیز پر مثلاً چار آنے نفع لیتا ھو تو اپنے دوست سے آٹھہ آنے نفع وصول کرے —

اس مثل کی ابتدا کے متعلق یہ قصہ مشہور ھے کہ ایک مرتبہ کسی شخص نے اپنے ایک دوست سے کہا کہ بھئی مجھے بازار سے کچھہ سودا خریدنا ھے - کوئی ایسی دوکان بتلاو جہاں سے چیز سستی بھی ملے اور عمدہ بھی - دوست نے جواب دیا - فلاں دوکاندار نہایت دیانتدار اور ایماندار ھے - اُس نے اپنا یہ اصول مقرر کر رکھا ھے کہ گاھک کے ھاتھہ ھمیشہ اچھی اور عمدہ چیز بیچے گا اور نفع نہایت ھی کم لیگا - یعنی صرف ایک پیسہ فی روپیہ - آج تک کوئی گاھک اُس کے پاس اُس کی چیز کی شکایت لے کر نہیں آیا - اُس کے ھاں سے بہتر آپ کو اس شہر میں اور کہیں چیز نہیں مل سکیگی - میرا پرانا واقف ھے اور میرا بہت لحاظ کرتا ھے - یقین ھے کہ بہ نسبت دوسروں کے میری خاطر سے آپ کو چیز اور بھی سستی دے دیگا - چلئے اُس کے ھاں چلیں اور جس چیز کی آپ کو ضرورت ھو وھاں سے لے لیں - چنانچہ دونوں دوست اُس کی دوکان پر پہنچے - اور بہت سا سودا خریدا - جب لے کر گھر آے اور بیوی نے ھر ایک چیز کے دام پوچھے تو چونکہ عورتوں کو عام طور پر عام استعمالی اشیاء کے بھاو معلوم رھتے ھیں - اس لئے اُس نے کہا کہ یہ چیزیں تو تم بہت مہنگی اُٹھا لاے ؟ شوھر نے بازار میں جاکر تحقیق کی تو معلوم ھوا کہ دوسرے دوکاندار دونی فی روپیہ

منافع لیتے هیں مگر اُس " دیانتدار " دوکاندار نے فی روپیہ چونی کے حساب سے منافع لیا - جس میں دلال صاحب کا جو ساتھہ تھے پورا نصف کا ساجھا تھا - تب اُس شخص نے مذکورۂ بالا جملہ کہا اور اُس وقت سے یہ بطور ضرب المثل استعمال هونے لگا —

ریوڑی کے پھیر میں آگئے

یعنی کسی بڑی مصیبت اور چکر میں پھنس گئے - مقدمہ بازی میں گرفتار ہوگئے یا قرض کی آفت میں مبتلا ہوگئے - یا کوئی اور ایسی مشکل آپڑی کہ دن رات بیچینی ور پریشانی میں بسر هونے لگی - اس مثل کی ابتدا یوں بیان کی جاتی هے کہ ایک مرتبہ چند نوجوان اور بے فکرے دوست بیٹھے هوے خوش فعلیاں کررهے تھے - جاڑوں کے دن تھے - ایک دوست نے کہا - بھئی ! هم تو اُس کو بہادر جانیں جو اس طرح ریوڑیاں کھاے کہ پہلے ایک پھر دو - علی هذالقیاس هر مرتبہ دوگنی کرتا جاے - یہاں تک کہ دس دفعہ کھاے - دوستوں میں سے ایک جو خیر سے ذرا زیادہ عقلمند واقع هوے تھے جھٹ بول اٹھے کہ " واہ یہ کیا مشکل هے - لاؤ میں کھاتا هوں " چنانچہ شرط بدی گئی اور ریوڑیاں آگئیں - اُن صاحب نے شروع میں تو بظاهر اس کو بہت هی آسان کام سمجھا تھا اور خیال کیا تھا کہ صرف چند ریوڑیاں کھانی پڑیں گی - اور شرط مفت میں جیت جاؤں گا - مگر جب ریوڑیاں کھانے بیٹھے اور حساب کیا کہ اگر هر مرتبہ ریوڑیوں کو دوگنا کیا جاے تو دس مرتبہ میں کتنی ریوڑیاں هوں گی - تو معلوم هوا کہ اس طرح ایک هزار اور تیئیس ریوڑیاں کھانی پڑیں گی - اب تو یہ صاحب بڑے چکراے مگر کر کیا سکتے تھے - شرط کر چکے تھے -

چنانچه بادل ناخواسته ریوڑیاں کھانی شروع کیں - مگر آخر کہاں تک ۱۰۲۳ ریوڑیاں کھانا کوئی آسان کام نه تھا - کھاتے کھاتے منه دکھنے لگا - اور تھوڑی دیر میں یه نوبت ہوگئی که منه چلتا ہی نه تھا. اب دوستوں نے مذاق اُڑانا شروع کیا - اور کہنے لگے دیکھا کیا خوب پھنسے - آخر ریوڑی کے پھیر میں آگئے نه - دوست مذاق اُڑا رہے تھے اور ان صاحب کا نه پوچھو که کتنا پتلا حال ریوڑیاں کھاتے کھاتے ہوگیا تھا - آخر کو شرط ہار گئے - ان سے ریوڑیاں نه کھائی گئیں اور تھک کر فرش پر لیٹ گئے - اس وقت سے یه مثل بولی جانے لگی —



ساٹھ گاؤں بکری چر گئی

جب کسی بڑے نقصان کی طرف اشارہ کرنا ہوتا ہے تو اس وقت علی‌العموم یه مثل بولتے ہیں - اس کی ابتدا اس طرح بیان کی جاتی ہے که ایک مرتبه کوئی بادشاہ شکار کھیلنے جنگل میں گیا - وہاں اتفاق سے اپنے ساتھیوں سے بچھڑ کر اکیلا رہ گیا - بھوک پیاس کی شدت سے مجبور ہوکر ایک کسان کے جھونپڑے میں چلا گیا - اور اُس سے کہا که کچھه کھانے کو ہو تو لاؤ - میں مسافر ہوں اور سخت بھوکا ہوں - کسان نے اُس کی بڑی خاطر مدارات کی - فوراً پانی لایا - بادشاہ کا ہاتھه منه دھلایا پھر لسی کا ایک پیاله بھر کر دیا - پھر روٹی اور چنے کا ساگ لایا - اور بادشاہ کے آگے رکھه دیا - بادشاہ بھوکا تو تھا ہی ایسا ٹوٹ کر روٹی پر گرا که تھوڑی سی دیر میں ساری روٹیاں ختم ہوگئیں - اُس وقت وہ روٹیاں اُس کو اعلیٰ درجه کے لذیذ کھانوں سے بھی زیادہ مزے کی معلوم ہوئیں - بادشاہ کسان کی خاطر و مدارات اور مہمانداری

سے نہایت خوش ہوا اور کہنے لگا "دراصل میں اس ملک کا بادشاہ ہوں- اور تمہارے اس سلوک سے مجھے بڑی خوشی اور مسرت حاصل ہوئی ھے- تمہارے اس چھوٹے سے مکان میں میں نے بہت آرام پایا ھے- میں تمہیں ساتھہ گاؤں جاگیر میں دیتا ہوں- تاکہ تم ہر مسافر کی اچھی طرح خاطر مدارات کرسکو"- چونکہ وہاں سند لکھنے کے لیے کاغذ نہ مل سکا- لہذا بادشاہ نے ایک پیپل کے پتے پر کسان کو ساتھہ گاؤں کی سند لکھہ کر دیدی اور چلا گیا—

اب اتفاق یہ ہوا کہ کسان کی بکری جو شام کو جھونپڑے میں آئی تو وہ پتہ رکھا ہوا تھا- اسے کیا پتہ کہ یہ پتہ اس وقت کتنی قیمتی دستاویز ھے- وہ اسے اُٹھا اور کھا گئی- کسان کی نظر بکری پر اس وقت پڑی جب آدھا پتہ بکری کے منہ کے اندر اور آدھا باہر تھا- یہ دیکھکر کسان کی جان ہی تو نکل گئی- وہ دوڑا کہ بکری کے منہ میں ہاتھہ ڈال کر پتے کو نکال لے- مگر اتنے دوڑتا رہا اتنے بکری پتے کو نگل گئی- اب سوائے افسوس کے کیا رکھا تھا- مجبوراً کسان روتا پیٹتا دارالخلافۃ میں پہنچا- مشکل سے بادشاہ سلامت تک رسائی ہوئی- اس بیچارے نے اپنی مصیبت کی کہانی رو رو کر بادشاہ کو سنائی- بادشاہ سن کر ہنسا اور کہنے لگا "تو یوں کہو کہ ساتھہ گاؤں بکری چر گئی" یہ کہہ کر دوسری دستاویز اسے لکھدی اور وہ خوش خوش گھر واپس چلا گیا-



سارا گھر جل گیا تب چوڑیاں پوچھیں

یہ مثل ایسے موقع پر کہتے ہیں جب کہیں بہت کچھہ نقصان ہوچکنے کے بعد اپنی قدر دانی ہو- نام و نمود اور دکھاوے کی خواہش

میں اپنا نقصان کرلینے کے موقع پر بھی یہ مثل بولتے ھیں- اس مثل کی ابتدا اس طرح بیان کی جاتی ھے - کہ ایک مرتبہ کسی شیخی باز عورت نے عید کے موقعہ پر بڑی بیش قیمت چوڑیاں پہنیں- اور اس امید میں کہ لوگ میری چوڑیوں کی تعریف کریں گے- ھر ایک کے آگے ھاتھہ مٹکاتی پھری- مگر بد قسمتی سے نہ تو کسی نے چوڑیوں کو دیکھا- اور نہ ان کی تعریف کی- اب تو عورت کو بڑا غصہ آیا کہ میں نے تو اتنے دام خرچ کئے- اور کسی نے چوڑیوں کی طرف آنکھہ اٹھا کر بھی نہ دیکھا- مگر غصہ ظاھر ھے کہ فضول تھا- اور دوسرے آدمیوں پر کیا اثر کرسکتا تھا؟ آخر سوچتے سوچتے ایک ترکیب اس کے ذھن میں آئی- چنانچہ وہ اس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے گھر آئی- اور دیا سلائی کھینچ مکان کو آگ لگا دی - مکان دھڑا دھڑ جلنے لگا - لوگ دوڑ پڑے- بہ مشکل آگ بجھائی اور عورت سے پوچھا کہ آگ کس طرح لگی؟ عورت نے ھاتھہ اٹھا کر چولھے کی طرف انگلی سے اشارہ کیا- اور کہنے لگی- ”اس چولھے میں سے کوئی چنگاری اڑ کر کمرہ میں جا پڑی اور اس سے سارے مکان میں آگ لگ گئی“ کسی کی نظر چوڑیوں پر بھی جا پڑی کہنے لگا- چوڑیاں تو بڑی خوبصورت ھیں- کہاں سے بنوائیں؟ عورت نے کہا- کم بخت پہلے سے نہ پوچھا جب سارا گھر جل گیا تب چوڑیاں پوچھیں- پہلے سے پوچھہ لیتا تو میرا گھر کیوں جلتا؟ اس وقت سے یہ مثل بولی جانے لگی-



ساس مر گئی اپنی ارواح تونبے میں چھوڑ گئی

یعنی مرنے کے بعد بھی مصیبت باقی رھی- اس مثل کی ابتدا اس طرح بیان کرتے ھیں کہ کوئی ساس تھی- بڑی ظالم و جلاد- اپنی بہو کو

نہایت ستاتی اور بیحد پریشان رکھتی - نہ اچھا کھانے کو دیتی - نہ بھرپور پہننے کو - اور کام لیتی بے انتہا - غریب بہو کی مجال نہیں تھی جو اس کے سامنے دم بھی مار سکے - بیچاری بڑی خاموشی کے ساتھہ اس کے سارے ظلم برداشت کرتی اور زبان سے اُف نہ نکالتی - خیر جب ساس کا آخری وقت قریب آیا تو اس نے بہو کو بلایا - بہو ڈری کہ دیکھئے اب کیا آفت آتی ہے - ڈری سہمی ساس کے پاس گئی اور چپکی کھڑی ہوگئی - ساس نے کہا بہو - مجھے اپنا آخری وقت قریب معلوم ہو رہا ہے - خیر خدا کی مرضی اسی طرح تھی - مگر دنیا سے جاتے ہوئے میں تجھے ایک وصیت کرتی ہوں وہ یہ ہے کہ زندگی میں تو جو کام کیا کرتی تھی میری مرضی اور اجازت سے اور میرے حکم سے کیا کرتی تھی - اب جب کہ میں نہ ہونگی تو کس سے اجازت لیا کرےگی - اس لیے اب میری بجائے تو اس تونبے کو سمجھیو - جو کام کریو پہلے تونبے کے آگے بیان کیجو - اور پھر اسے کیجو - خبردار جو اس کے خلاف ہوا - میری روح اس تونبے میں رہےگی - اگر تو نے میرے کہنے کے خلاف کیا تو پھر سمجھہ لے کہ تیری خیر نہیں —

تھوڑی دیر کے بعد ساس کا انتقال ہوگیا - اور ڈر کی ماری پھوہڑ نے ساس کے حکم کی تعمیل بڑی راسخ الاعتقادی سے کرنی شروع کی - جو کام شروع کرنے کو ہوتی پہلے مفصل طور پر تونبے کے سامنے بیان کرتی اور ڈرتی رہتی کہ ساس کی روح جو تونبے میں بیٹھی ہے کہیں ناراض نہ ہو جائے - اور سب کچھہ بیان کر چکنے کے بعد پھر اس کام کو کرتی - ایک زمانہ بیچاری مصیبت کی ماری بہو پر اسی طرح گذر گیا - ایک روز اس کی ایک سہیلی آئی ہوئی تھی - اس نے جو یہ تماشا دیکھا تو بڑے تعجب

سے پوچھا کہ تو نے اس وقت یہ کیا حماقت کی ؟ یہ سنتے ہی بہو کا رنگ مارے ڈر کے فق ہوگیا اور کہنے لگی - چپ چپ ساس کو خبر ہوگئی تو مجھے کچی کھا جائے گی - سہیلی بولی - پاگل ہوئی ہے - اُسے تو مرنے ہوئے بھی دو برس ہولئے - اب ساس رکھی ہے - اس کی تو ہڈیوں کا بھی پتہ نہ ہوگا - بہو نے جواب دیا - اری پگلی ساس تو بیشک مرگئی ہے مگر اپنی ارواح اس تونبے میں چھوڑ گئی ہے - اسی لیے تو میں نے اس سے اجازت لی تھی - اماں کی وصیت تھی کہ ہر کام کرنے سے پہلے اس تونبے سے پوچھہ لیا کروں - سہیلی نے یہ سن آؤ دیکھا نہ تاؤ - جھٹ تونبا اتھا زمین پر دے مارا - وہ توٹ گیا تو کہنے لگی - لے اب بتا - تیری ساس کہاں رہے گی - تونبا تو توت تاٹ ختم ہوا - اس وقت بہو کو معلوم ہوا کہ یہ ساری کارروائی محض میرے ڈرانے کے لیے تھی - نہ روح تونبے میں آئی اور نہ وہ کوئی نقصان پہنچا سکتی ہے - چونکہ تونبا ہی نہ رہا تھا لہذا اس روز سے بہو کو چھتی مل گئی - وہ جو چاہتی اپنی مرضی سے کرتی - نہ اس سے کوئی پوچھنے والا تھا نہ اسے کسی کا خوف تھا —

سوت کی انتی اور یوسف کی خریداری

یہ مثل ایسے موقع پر بولتے ہیں جہاں کوئی معمولی حیثیت والا آدمی کسی عظیم الشان کام میں ہاتھہ ڈالنا چاہے - تھوڑی بساط ہو اور بڑا حوصلہ رکھے - اس کی وجہ تسمیہ اس طرح بیان کی جاتی ہے کہ جب ایک قافلے والے حضرت یوسف کو کنویں میں سے نکال کر بیچنے کے لیے مصر لے گئے - تو وہاں ان کے حسن و جمال اور لیاقت و قابلیت کا بڑا شہرہ ہوا - بڑے بڑے امیر ان کی خریداری کے لیے آئے - اور لاکھوں کا

بڑا هجوم هوا - اسی هجوم میں ایک بہت غریب بڑھیا بھی موجود تھی-
جس کے لباس میں جگہ جگہ پیوند لگے ہوئے تھے - اور پھٹی ہوئی
جوتیاں پاؤں میں پہنے ہوئے تھی - ہاتھہ میں ایک سوت کی انٹی تھی -
کسی نے پوچھا - بڑی بی تم نے اس هجوم میں آنے کی کیوں تکلیف کی ؟
بڑھیا کہنے لگی - بیٹا یہ سوت کی انٹی لے کر آئی ہوں - اس خیال سے کہ
اگر مالک راضی ہوں تو یہ انٹی دے کر یوسف کو خرید لوں - میں نے
سنا ہے کہ وہ نہایت لائق اور بڑا خوبصورت غلام ہے - لوگ هنسنے لگے -
لیکن بڑھیا بدستور سنجیدہ بنی ہوئی تھی —

سوکن تو چون کی بھی بری

یعنی اگر عورت کی سوکن نہایت هی معمولی اور بے حیثیت بھی
هو شوهر پر اس کا کچھہ بھی اثر اور دباؤ نہ هو تب بھی عورت کے دل
پر سانپ هی لوٹتا رهتا ہے - اور اس کو وہ ایک آنکھہ نہیں بھاتی -
کہتے هیں کہ کسی آدمی کی بیوی بہت درشت مزاج بد خو اور زبان
دراز تھی - خاوند نے یہ کام کیا کہ چونی کی ایک بڑی سی عورت بنائی-
اس کو اچھے اچھے کپڑے پہنائے اور اسے لاکر بیوی کے کمرے میں رکھہ
دیا - جب گھر میں آتا تو بجائے بیوی سے بات چیت کے اس چونی کے
پتلے کی غور و پرداخت اور بناؤ سنگار میں مصروف رهتا - بیوی بیٹھی بیٹھی
دیکھتی اور جلتی کہ مجھہ سے تو ایسی الغرضی اوراس فرضی سوکن کی اتنی
خاطر - مگر آخرکار بیوی کو سمجھہ آگئی - اُس نے خیال کیا کہ محض
میری درشت مزاجی هی خاوند کی بے التفاتی کا سبب ہوئی ہے - اس نے
خاوند سے اپنے پچھلے قصوروں کی معافی مانگی - اس چونی کی سوکن کو

باہر پھنکوایا اور دونوں میاں بیوی ہنسی خوشی رہنے لگے —

سونا سنار کا ابھرن سنسار کا

یہ مثل ایسے موقع پر بولتے ہیں جب کوئی شخص کمال ہوشیاری سے کسی شخص کو الو بنا کر اپنا مطلب نکالے - یا کسی بھلے آدمی کو بڑی چالاکی کے ساتھہ دھوکہ دیکر اپنا کام بنائے - اور آدمی باوجود چوکنا رہنے کے دھوکہ کھا جائے - اس مثل کی ابتدا کے متعلق یہ قصہ مشہور ہے کہ ایک دفعہ کسی نہایت چابکدست اور مشہور سنار سے بادشاہ نے پوچھا کہ ایمان ایمان سے بتانا - اگر تمہیں کوئی آدمی کوئی سونے کی چیز بننے کے لیے دے تو اس میں کتنا کھوٹ ملاتے ہو؟ سنار نے عرض کیا - حضور جان کی امان پاؤں تو عرض کروں بادشاہ نے کہا بیشک تمہیں امن ہے جو کچھہ کہنا چاہتے ہو بے خوفی کے ساتھہ کہو - تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا - بادشاہ کی زبان سے اتنا سن کر سنار بولا حضور سچی بات تو یہ ہے کہ ہم سنار لوگ روپے میں پورے سولہ آنے کا مال خود ہضم کرتے ہیں اور گاہک کو خالص کھوٹا مال بنا کر دیتے ہیں - حضور وہ سنار ہی کیا جس نے ذرا سا بھی کھرا مال بنا کر مالک کو دے دیا —

بادشاہ یہ عجیب و غریب بات سن کر نہایت حیران ہوا - اور کہنے لگا - اچھا اگر ہم تمہیں کچھہ مال بننے کے لئے دیں اور تم پر سخت پہرہ مقرر کردیں تو پھر تم اس میں کس طرح کھوٹ ملا سکتے ہو؟ سنار نے عرض کیا - حضور خواہ کچھہ ہی انتظام کرلیں - ہونے والی بات تو ہوکر رہے گی - بادشاہ نے کہا اچھا ہم امتحان کرتے ہیں - یہ کہ کر سنار کو ایک سونے کی پتلی بنانے کا حکم دیا - اور ایک علحدہ مکان میں اس کی

ضروریات کی تمام چیزیں مہیا کردیں - اور اس پر دس سپاھیوں کا ایک زبردست پہرہ بٹھا دیا - اور انھیں تاکید کردی کہ خبردار! نہ کسی شخص کو اندر داخل ہونے دینا - اور نہ سنار کو باھر نکلنے دینا البتہ جس چیز کی ضرورت سنار کو ہو وہ خود لادینا - اور سنار کو دے دیا کرنا - الغرض سنار نے اس سخت قید میں بیٹھہ کر کام شروع کیا - جس وقت شام کو سنار کام سے فارغ ہوکر گھر جاتا اس وقت نہایت احتیاط کے ساتھہ اس کی جامہ تلاشی لی جاتی - اور جس وقت صبح کو کام پر واپس آتا تو اچھی طرح تلاشی دینے کے بعد اس کو اندر آنے کی اجازت ملتی —

سنار نے یہ چالاکی کی کہ رات کو گھر پر پیتل کی ایک ویسی ہی پتلی بنانی شروع کی جیسی وہ بادشاہ کی زیر ہدایت سونے کی بنا رہا تھا - قصہ مختصر سونے کی پتلی بھی بنتی رہی اور پیتل کی پتلی بھی تیار ہوتی رہی - یہاں تک کہ ایک دن دونوں تیار ہوگئیں - اب سنار نے یہ کام کیا کہ اپنی بیوی سے کہا کہ تو دہی والی بن کر اور دہی کا ایک مٹکا سر پر رکھہ کر اس طرف آئیو جہاں میں کام کر رہا ہوں اور دہی کے مٹکے میں وہ پیتل کی پتلی چھپاتی لائیو جو میں نے بناکر فلاں جگہ رکھہ دی ہے - یہ انتظام کرکے وہ کام پر گیا - اور سپاھیوں سے کہنے لگا کہ کام بالکل تیار ہوگیا - اب صرف اتنا کام کرنا باقی ہے کہ دہی سے اس کے تمام جسم کو صاف کیا جاے - تم کہیں سے تھوڑی سی دہی منگا دو تو آج یہ کام ختم ہو جاے گا - اس پر پہرے والے سپاہیوں میں سے ایک تیار ہوا کہ وہ جاکر بازار سے دہی لے آے - عین اس وقت ایک دہی بیچنے والی دہی کا مٹکا سر پر رکھے آواز دیتی ہوئی چلی آرہی تھی - سپاھیوں نے اس کو نہایت غنیمت سمجھا اور اسے بلا کر اندر مکان میں لے گئے - اور سنار سے کہا کہ لو

تمھیں دھی کی ضرورت تھی یہ دھی بیچنے والی اتفاق سے ادھر آ نکلی۔ اس سے جس قدر دھی کی ضرورت ہو لے لو۔ اب سنار نے یہ کام کیا کہ نہایت ہوشیاری کے ساتھہ بڑی پھرتی سے سونے کی پتلی تو مٹکے میں ڈال دی اور پیتل کی پتلی دھی میں سے نکال کر سونے کی پتلی کی جگہ رکھہ دی۔ خیر پتلی بادشاہ کے سامنے پہنچی تو اُس کے رنگ و روغن۔ آب و تاب اور خوبصورتی و صفائی کو دیکھہ کر بادشاہ بڑا خوش ہوا۔ وہ ہرگز بھی نہ سمجھا کہ یہ سارا پیتل کا معاملہ ہے اور اس میں ایک رتی برابر بھی سونا نہیں ہے۔ بادشاہ کو یقین تھا کہ اس کے بنانے میں سنار کوئی چالاکی نہیں کر سکا ہوگا۔ چنانچہ اس نے سنار کو بلایا اُس کی صنعت اور کمال کی داد دی اور ھنسکر پوچھا کہ کہو اس پتلی میں کتنا کھوٹ ملایا؟ سنار نے جواب دیا۔ جہاں پناہ آپ کے ہاتھہ میں خالص پیتل کی پتلی ہے۔ جس میں سونا رتی برابر بھی نہیں۔ بادشاہ یہ سن کر بڑا ہی حیران ہوا۔ اور جوھریوں کو بلایا۔ جنھوں نے دیکھہ کر کہا کہ حضور یہ تو خالص پیتل ہے۔ اب بادشاہ نے اس سے پوچھا کہ اچھا یہ تو بتاؤ کہ تم نے یہ عجیب و غریب کار روائی کس طرح کی؟ سنار نے ساری کیفیت من و عن بیان کردی۔ یہ ہے مثل کی وجہ تسمیہ۔

سیف تو پٹ پڑی تھی پر نیمچہ کاٹ کر گیا

یہ مثل ایسے موقع پر بولتے ہیں جہاں جس شخص سے کام بننے کی توقع ہو وہ تو کام کرے نہیں ہاں دوسرا شخص جس سے کچھہ زیادہ امید نہ ہو وہ کام کردے یعنی خلاف توقع کام بن جانے کے موقع پر یہ مثل استعمال کی جاتی ہے۔ اس مثل کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ ایک روز

ایک نواب صاحب جن کا اسم گرامی سیف خاں تھا اپنی سواری پر بازار میں سے گذر رہے تھے - اور اُن کے آگے اُن کا بیٹا بیٹھا ہوا تھا - راستے میں جاتے ہوئے ایک فقیر نے نواب صاحب سے سوال کیا مگر نواب صاحب نے کوئی توجہ نہ دی - لیکن ان کے لڑکے نے جھٹ ایک اشرفی نکال کر فقیر کی طرف پھینک دی - اُس وقت فقیر نے فوراً یہ فقرہ کہا - جو فوراً سارے شہر میں مشہور ہوگیا اور بعد میں ضرب المثل بن گیا - سیف کے معنی تلوار کے ہیں - اور امیر کا نام سیف خاں تھا - اسی مناسبت سے فقیر نے یہ فقرہ چست کیا —

—— * ——

سیکھہ وا کو دیجئے جا کو سیکھہ سہاے

سیکھہ نہ دیجئے باندر اکو جو گھربئے کا جاے

سیکھہ کے معنی نصیحت کے ہیں - ضرب المثل کا مطلب یہ ہے کہ واعظ و نصیحت اس شخص کو کرنی چاہئے جو اسے قبول کرے اور کہنا مانے - بندر کو نصیحت کرنے سے کیا فائدہ جو غصہ میں آکر بئے کے ہی گھونسلے کا صفایا کرے - یہ مثل ایسے موقع پر بولتے ہیں جہاں کسی شخص کو نصیحت تو کی جاے - ہمدردی کی خاطر وہ شخص اور اُلٹا نصیحت کرنے والے کے گلے کا ہار ہوجاے - اور نصیحت کرنے والے ہی کو برا بھلا کہنا شروع کردے - مطلب یہ ہے کہ اُلٹی آنتیں گلے میں پڑیں - اس مثل کے متعلق یہ پر لطف قصہ مشہور ہے کہ ایک مرتبہ موسلا دھار بارش ہورہی تھی - جنگل کا موقعہ تھا - ایک درخت پر بئے نے اپنا گھونسلا بنا رکھا تھا اور اس میں بیا اور بئی نہایت آرام اور بے فکری سے بیٹھے تھے - نہ ان تک پانی کی کوئی بوند پہنچتی تھی اور نہ بوچھار ہی آتی تھی - اتنے میں بئے نے دیکھا کہ ایک بندر بھی سکڑا سکڑا

درخت کی ایک ٹہنی پر بیٹھا ہے - زور زور سے بوندیاں پڑنے لگیں تو وہ اُچھل کر دوسری شاخ پر جا بیٹھا - وہاں بھی امن نہ ملا تو تیسری پر جا چڑھا - غرض سارے درخت پر اسی طرح سراسیمہ اور پریشان پھر رہا ہے اور بیچارے کو کہیں سر چھپانے کو جگہہ نہیں ملتی - سردی سے الگ کانپ رہا ہے - تڑا تڑ جو اولے پڑ رہے ہیں وہ اور بلاے جان ہو رہے ہیں - قصہ مختصر بیچارے کی جان مصیبت میں آرہی ہے اور کچھہ بن نہیں آتا کہ کیا کرے بئے نے بندر کی جو یہ حالت دیکھی تو کہنے لگا " میاں بندر! اللہ میاں نے تمہیں مضبوط ہاتھہ تیز پانچے - پھرتیلا جسم دیا ہے - اگر برسات آنے سے پہلے ایک اچھا سا گھر بنا لیتے تو اِس وقت کیسا آرام پاتے اور اس مصیبت سے بچ جاتے جو اس وقت اُٹھا رہے ہو - مجھے ہی دیکھہ لو - تمہارے سے چھوٹا اور کمزور پرندہ ہوں - نہ میرے ہاتھہ پاؤں ایسے مضبوط ہیں جیسے تمہارے نہ پانچے ایسے تیز ہیں اور نہ جسم ایسا چست و چالاک ہے - پھر بھی میں نے محنت اُٹھاکر ایسا اچھا گھر بنا لیا ہے کہ اب اس میں بیٹھا ہوا چین کر رہا ہوں - نہ بارش کا خطرہ ہے اور نہ سردی کا خوف - کاش میری طرح تم بھی عاقبت اندیش ہوتے تو یہ برے دن کیوں دیکھنے نصیب ہوتے —

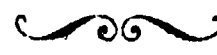
بندر مارے سردی اور اولوں کے پہلے ہی بد حواس ہو رہا تھا - اس بے وقت کی نصیحت سے اپنے آپے میں نہیں رہا - جھٹ جھنجھلا کر ایک آن کی آن میں بئے کا گھونسلا نوچ ناچ پھینک دیا - اور کہا " ہاں اب کہ کیا کہتا ہے - میں نے سنا نہیں تھا " - غریب بیا اور بئی دونوں اڑ کر ایک شاخ پر جا بیٹھے اور اب ان کی بھی وہی حالت تھی جو بندر کی —

—— * ——

سینک سڑپے تو لالہ جی کے ساتھہ گئے اب تو دیکھو اور کھاؤ

یہ مثل ایسے موقع پر بولتے ہیں جہاں بہ نسبت پہلے کے اور زیادہ کفایت شعاری کرنے کی تاکید کی جاے - اس مثل کی ابتدا کے متعلق یہ قصہ مشہور ہے کہ ایک بنیا حد درجہ کا کنجوس اور بخیل تھا - اُس کے بخل کی انتہا یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ اس نے ایک شیشی میں تھوڑا سا گھی لیکر رکھہ لیا تھا - کھانے کے وقت ایک سینک اُس میں ڈبوکر نکال لیتا اور دال میں ڈال دیتا خیر اسی طرح گھر کا گزارہ چلتا رہا - اور لالہ جی روپ جوڑتے رہے - یہاں تک کہ وقت آپہنچا - اور لالہ جی بیکنتھہ باشی ہو گئے اب صاحبزادہ بلند اقبال کی سنیے - وہ جو گھر کے مالک ہوے تو اُنھوں نے سارے گھر والوں کو جمع کیا - گھی کی قدیمی شیشی سامنے رکھہ لی اور فرمانے لگے سنو بھئی - یہ تو سب جانتے ہیں کہ سر گباشی لالہ جی اس شیشی میں سے دونوں وقت ایک ایک سینک نکال کر دال میں ڈالا کرتے تھے - مگر بات یہ ہے کہ لالہ جی کی آمدنی کثیر تھی - وہ اگر ایسی فضول خرچی کرتے تھے تو وہ تو اپنی نبھا گئے - مگر ہم سے نبھنی بہت مشکل ہے - کیونکہ اگر اس طرح روز دونوں وقت اس شیشی میں سے ایک ایک سینک استعمال کی جاتی رہی تو ایک نہ ایک دن ضرور سارا گھی ختم ہو جاے گا - اور ذرا سوچنے کی بات ہے کہ پھر اور گھی کہاں سے آے گا - تو بھائیو سینک سڑپے تو لالہ جی کے ساتھہ گئے اب تو دیکھو اور کھاؤ - بس یہی ترکیب آسان معلوم ہوتی ہے کہ کھانا کھانے بیٹھے تو شیشی کو طاق میں سے اتار کر سامنے رکھہ لیا اس کی خوشبو دماغ میں پہنچتی رہی - اور گھر والے کھانا کھاتے رہے یقین جانو اس سونگھنے میں وہ لطف آیا کرے گا جو کھانے میں کبھی نہیں آسکتا - چنانچہ سب گھر

والوں نے بہ خوشی خاطر اس زرین تجویز کو منظور کیا - اور پہلے سے زیادہ کفایت شعار بن گئے —



عذر گناہ بدتر از گناہ

یہ فارسی ضرب المثل ہے مگر اردو میں بھی بہ کثرت استعمال ہوتی ہے - جب کوئی شخص اپنے قصور کی ایسی غلط اور قابل مضحکہ تاویل کرے کہ وہ تاویل اصل قصور سے بھی بڑھ جاے - جرم پہلے سے بھی زیادہ سنگین نظر آے - اس وقت یہ مثل بولتے ہیں - یہ تو پتہ نہیں لگ سکا کہ اس مثل کی ابتدا کب اور کس طرح ہوئی مگر اس کے متعلق ایک بڑا ہی پر لطف تاریخی لطیفہ مشہور ہے جو ہم ناظرین کی تفنن طبع کی خاطر یہاں لکھتے ہیں :-

خلیفہ ہارون الرشید نے ایک روز دربار میں کہا کہ "عذر گناہ بدتر از گناہ کا فارسی مقولہ بظاہر نہایت لغو اور فضول نظر آتا ہے - بھلا یہ بات کس طرح سمجھ میں آسکتی ہے کہ قصور کی عذر خواہی کی جاے اور وہ عذر خواہی خود اصل قصور سے بھی بڑھ جاے - فارس کے باشندے دراصل ہوتے ہی ہیں بڑے لغوگو اور مبالغہ پسند" اس وقت دربار کا مشہور شاعر ابو نواس بھی حاضر تھا - وہ جواب دیے بغیر نہ رہ سکا اور کہنے لگا - حضور! مقولہ بالکل درست اور ٹھیک ہے - اور اس میں ذرہ برابر بھی جھوٹ یا مبالغہ نہیں - ہارون الرشید نے کہا - اچھا اسے ثابت کرو ابو نواس نے عرض کیا کہ "بیشک اس کا ثابت کرد کھانا میرے ذمہ ہے - حضور چندے توقف فرمائیں - میں اس کی صداقت کو چند ہی ثابت کردکھاؤں گا - یہ میں نے اس لئے عرض کیا کہ جب تک حضور عملی طور پر اس کی صداقت کو ملاحظہ نہ فرمائیں گے اس وقت تک یہ مقولہ ذرا مشکل سے سمجھ

میں آے گا" یہ کہ کر ابو نواس خاموش ہو گیا اور بات بظاہر آئی گئی ہوئی -

اسی دن رات کو ابو نواس نے یہ کام کیا کہ خواجہ سراؤں کو کسی طرح راضی کر کے زنانی ڈیوڑھی میں ایسے مقام پر چھپ کر بیٹھ گیا جہاں اتفاق سے کچھہ اندھیرا تھا - بادشاہ جو باہر سے ڈیوڑھی میں داخل ہونے لگے تو جس وقت اس مقام پر پہنچے جھٹ ابو نواس نے پردے کے پیچھے سے نکل کر بادشاہ کا منہ چوم لیا - بادشاہ نے گبھرا کر کہا - کون ہے ؟ ہیں ابو نواس ! تو ہے - اے یہ کیا نامعقول حرکت تھی - ابو نواس نے بڑی شرمندہ صورت بنا کر کہا کہ افوہ ! حضور ہیں - میں سمجھا تھا کہ زبیدہ خاتون ہیں - خیر اس وقت تو معاف کر دیجئے آئندہ ایسی غلطی کبھی نہیں ہوگی" اس عجیب وغریب جواب سے ہارون الرشید کے غضب کا پارہ آخری ڈگری پر پہنچ گیا - اور وہ مارے غصہ کے تھر تھر کانپنے لگا اور ڈپٹ کر اس نے ابو نواس سے کہا "مردود! کیا بکتا ہے" ابو نواس فوراً قدموں پر گر پڑا اور کہنے لگا - حضور ایسے ہی موقع پر تو بولتے ہیں کہ "عذر گناہ بد تر از گناہ" ہارون الرشید ہنس پڑا اور ابو نواس کو کچھہ انعام دے کر رخصت کر دیا —

کالی بھلی نہ سیت دونوں کو مارو ایک ہی کھیت

سیت کے معنی سفید کے ہیں کہتے ہیں کسی شخص کے دو بیویاں تھیں ایک کالی کلوٹی اور بد صورت اور دوسری گوری چٹی اور خوبصورت مگر تھیں دونوں اول درجہ کی بد طینت شوہر کو ہمیشہ دق اور پریشان رکھتیں - یہاں تک کہ بیچارے کی زندگی اجیرن ہوگئی جب گھر میں پڑتا دونوں جھاڑ کا کانٹا ہو کر اسے چمٹ جاتیں ایک دوسرے کی شکایت

کرتیں - شوہر کو صلواتیں سناتیں - قسمت کا گلہ کرتیں اور اپنے آپ کو کوستیں - یہی ان کا دن رات کا مشغلہ تھا - ایک روز کسی دوست نے تذکرۃ "پوچھا کہ دونوں میں سے زیادہ نیک اور سلیقہ شعار آپ کی کون سی بیوی ہے؟ اس پر جل کر شوہر نے جواب دیا کہ "کالی بھلی نہ سیت دونوں کو مارا ایک ہی کھیت" یعنی دونوں ہی نکھد اور نالائق ہیں - میرا بس چلے تو ایسی جگہ ماروں جہاں پانی نہ ملے —

اس وقت سے یہ فقرہ ضرب المثل کے طور پر استعمال ہونے لگا - اور ایسے موقع پر بولا جانے لگا جب کسی آدمی کے دو دشمن ہوں اور دونوں بظاہر ہمدردی کا اظہار کریں —

کچھہ تم سمجھے کچھہ ہم سمجھے

یہ مثل ایسے موقع پر بولتے ہیں جہاں دو آدمیوں کے درمیان اشاروں کناؤں میں ایسی طنز آمیز گفتگو ہو جسے دوسرے لوگ نہ سمجھہ سکیں - مگر وہ دونوں اپنی اپنی جگہ سمجھہ کر خاموش ہو جائیں - بیان کرتے ہیں کہ کسی مسافر کے پاس ایک ہزار روپے کی تھیلی تھی - اور وہ ایک غیر آباد راستہ پر سفر کر رہا تھا - پیچھے سے اتفاقاً ایک اور مسافر اس سے آملا - اس نے کہا بھائی تو میرے سے زیادہ طاقتور اور مضبوط ہے اور راستہ خطرہ سے خالی نہیں - میرے پاس ہزار روپیہ نقد ہے - یہ تو اپنے پاس رکھہ لے - منزل مقصود پر پہنچ کر لے لوں گا - نو وارد نے جواب دیا - نہیں بھائی! میں اس جھنجھٹ میں نہیں پڑتا - اور یہ کہہ کر آگے بڑھ گیا - اب مسافر نے خیال کیا کہ اچھا ہی ہوا تھا جو میں نے روپیہ اس اجنبی کے پاس نہیں رکھوایا تھا - اگر یہ لے کر

چل دیتا تو میں کیا کر لیتا - اب ادھر کی سنئیے - نووارد مسافر کے دل میں آگے جاکر خیال آیا کہ مفت میں رقم آرہی تھی - ہاتھ سے دے کر بڑی بیوقوفی کی - چلو اب واپس چلو - اور رقم ہاتھ آجائے تو لے کر فرو ہو جاؤ - میرا بنا ہی کیا لے گا - یہ خیال کر کے واپس پیچھے کی طرف لوٹا - مسافر بیچارا آہستہ آہستہ آرہا تھا - اسے دیکھتے ہی کہنے لگا: میاں میں نے خیال کیا کہ اگر اپنے سے کسی کا کام بنتا ہو تو اس کا کام کر دینا چاہئیے - لاؤ روپیہ رکھ لوں - منزل پر پہنچ کر لے لینا - اچھا ہے بے فکری سے راستہ طے کر لوگے —

مسافر ہوشیار ہو چکا تھا - فوراً سمجھ گیا کہ یہ اظہار ہمدردی بلا وجہ نہیں - اس پر کہنے لگا - بھائی آپ کی مہربانی - لیکن بات یہ ہے کہ کچھ تم سمجھے کچھ ہم سمجھے - ایسا کیا بوجھ ہے - خود ہی لے جاؤں گا - اسی وقت سے یہ فقرہ بطور ضرب المثل استعمال ہونے لگا —

کر تو ڈر - نہ کر تو بھی ڈر

یہ مثل ایسے موقع پر بولتے ہیں جہاں کسی آدمی کو یہ نصیحت کرنی ہو کہ ہر وقت اور ہر گھڑی خدا سے پناہ مانگتے رہنا چاہئیے - نہ معلوم کس وقت کیا آفت آن پڑے - کہتے ہیں کہ دو دوست تھے جو بازار میں پاس ہی پاس دوکانیں کرتے تھے - ایک روز ایک دوکاندار نے اپنے دوست سے کہا "بھئی! کر تو ڈر، نہ کر تو بھی ڈر"

دوست نے جواب دیا - واہ یہ کیا بات ہے - اگر برا کام کریں تو تو ڈریں بھی - جب برا کام ہی نہ کریں تو پھر ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟ مجرم ہی کو سپاہی پکڑتا ہے - جس نے کوئی قصور ہی نہیں کیا اسے سپاہی سے

کہا تو ؟ خیر دونوں کا مباحثہ اس مسئلے کے متعلق ہوتا رہا اور دن گذرتے رہے - ایک روز ایک امیر آدمی بڑا شاندار لباس زیب تن کئے دوکان پر آیا - اس کے ساتھ اس کا ملازم بھی تھا - جو ایک چھوٹے بچے کو کندھے سے لگائے ہوئے تھا - خیر آقا نے بہت سا سامان دوکان پر سے خریدا - اور ملازم سے کہا دیکھو جی یہاں بیٹھ جاؤ - میں یہ سامان گھر لے جاتا ہوں - وہاں سے آدمی کے ہاتھ قیمت بھیج دوں گا - پھر تم واپس چلے آنا یہ کہہ کر امیر آدمی تو چلا گیا اور اس کا ملازم دوکان پر بیٹھ گیا - دوکاندار مطمئن تھا کہ بچہ اور ملازم دونوں موجود ہیں ابھی روپیہ آتا ہوگا - تھوڑی دیر نہ گذری تھی کہ ملازم نے بچہ کو آہستہ سے دوکان کے فرش پر لٹا دیا - اور کہنے لگا ذرا پیشاب کر آوں - دوکاندار نے خیال کیا ' کیا ہرج ہے بچہ تو سامنے سو رہا ہے - بچہ کو چھوڑ کر یہ کہاں جا سکتا ہے ؟ جب ملازم کو گئے ہوئے بہت دیر ہوگئی اور آقا صاحب کی واپسی کی بھی کوئی امید نہ رہی تب تو دوکاندار بڑا گھبرایا - جلدی سے اٹھ کر بچہ کو دیکھا تو وہ مردہ تھا - اب تو اس نے اپنا سر پیٹ لیا - چاہتا تھا کہ پولیس کو اس عجیب و غریب چالاکی کی اطلاع دے کہ یکایک امیر آدمی اور اس کا نوکر سامنے سے آتے ہوئے نظر آئے - اور آتے ہی کہنے لگے - معاف کیجئے - ہمیں کچھ دیر ہوگئی - خیر لیجئے - اپنی رقم اور ہاں وہ ہمارا بچہ کہاں ہے؟ اچھا یہ رہا - یہ کہہ کر امیر آدمی نے جوں ہی اسے اٹھانا چاہا - فوراً ایک چیخ ماری اور کہنے لگا - ہیں یہ تو مرگیا - کیوں میاں دوکاندار ! اس معصوم کا گلا کس جرم میں گھونٹا ؟ چلو تھانے میں - بیچارہ دوکاندار سخت پریشان ہوا کہ اب کیا کرے - پولیس کو خبر ہوگئی تو یہی سمجھا جائے گا کہ اسی نے اس کا گلا گھونٹا ہے - اصل بات کون دیکھتا ہے - اس لئے اپنی

عزت بچانے کی خاطر اس نے امیر آدمی کی خوشامد کرنی شروع کی اور بہ مشکل ایک هزار روپیہ اسے دے کر اپنی جان چھڑائی - ملازم نے بچہ کو اتھا کر پھر کندھے سے لگا لیا اور دونوں جدھر سے آئے تھے ادھر ھی چلے گئے - ان کے چلے جانے کے بعد دوکاندار کو خیال آیا کہ اس جھگڑے میں مال کی قیمت بھی ان سے وصول نہیں ہوئی - لیکن اب کیا ہو سکتا تھا —

دوست نے یہ سارا واقعہ دیکھا اور کہنے لگا - کیوں بھئی کیا اب بھی تم اس فقرے کی صداقت کے قائل نہیں ھوگے کہ "کر تو ڈر نہ کر تو بھی ڈر" —

—— * ——

کھاویں خان خاناں اُڑاویں میاں فہیم

اس مثل کو دوسری طرح یوں بیان کرسکتے ہیں کہ مال مفت دل بے رحم - یہ مثل ایسے موقع پر بولتے ہیں جہاں کماوے کوئی اور اڑاوے کوئی - اکبری امرا میں سے عبدالرحیم خان خاناں نہایت مشہور گزرا ہے - بڑا فیاض طبع اور دریا دل انسان تھا - اُس کا ایک نہایت ھی عزیز اور چاھتا غلام تھا فہیم نام - فہیم آقا کے مزاج میں اس قدر دخیل تھا کہ جو چاھتا کرتا اور جس قدر چاھتا خرچ کرتا - کوئی اس کے معاملہ میں بولنے والا اور اس کا ہاتھ پکڑنے والا نہ تھا - میاں فہیم بے دریغ روپیہ دھڑنے سے خرچ کرتے تھے اور بڑی شان سے رہتے تھے - انہی فہیم کو دیکھ کر یہ مثل بنائی گئی —

—— * ——

کھچڑی کھاتے پہنچا اُترتا ہے

اس مثل کا استعمال ایسے موقع پر ہوتا ہے جب کہ بہت ھی معمولی

سا کام کرتے ہوئے کوئی بڑی تکلیف اتفاقاً پہنچ جائے - نازک مزاج آدمی کے لئے بڑی بولتے ہیں - اس مثل کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ کوئی نواب صاحب تھے - نہایت بسیار خور اور بڑے کھاؤ - ان کی ایک وقت کی خوراک پندرہ بیس سیر کے قریب تھی - ایک روز نواب صاحب کی طبیعت کچھ علیل تھی - حکیم صاحب نے غذا میں کھچڑی تجویز کی - خیر جب کھچڑی پک کر آئی تو ایک بہت بڑے لگن میں بھردی گئی - نواب صاحب کھانے بیٹھے اور پہنچے تک ایک دفعہ ہی اپنا ہاتھ اس میں ڈال دیا - کھچڑی تھی بہت گرم - ہاتھ جل گیا - سوزش جو ہوی تو نواب صاحب نے جلدی سے اپنا ہاتھ اس میں سے نکالا - جتنی کھچڑی ہاتھ میں لگی رہ گئی تھی اس کے لئے ہاتھ کو جو زور سے جھٹکا دیا تو فوراً پہنچا اُتر گیا - اور بڑی مالش کے بعد درست ہوا - اس وقت سے یہ مثل بولی جانے لگی —

---*---

کہوں تو ماں ماری جائے نہ کہوں تو باپ کتا کھائے

فارسی زبان میں اس مثل کی مترادف مثل " گویم مشکل و گرنہ گویم مشکل " ہے - یعنی ایسی بات جو نہ کہتے بن پڑے اور نہ چپ رہا جائے - آدمی تذبذب میں پڑجائے کہ اب کیا کروں - کہتا ہوں تو خرابی نہ کہوں تو مشکل - اس مثل کے متعلق ایک بڑے ہی مزے کی حکایت مشہور ہے - اللہ کو پتہ ہے کہ کہاں تک سچ ہے مگر اس میں شبہ نہیں کہ ہے دلچسپ - کہتے ہیں کہ دو میاں بیوی تھے - اور دونوں میں روز مرہ تکا فضیحتی رہتی تھی - خاوند بہت سخت تھا اور کوئی دن ایسا نہ جاتا ہوگا جو دو چار مرتبہ بیچاری بیوی پر مار نہ پڑجاتی

ہو - عورت تھی جاھل مطلق - کسی بیوقوف نے اسے بتا دیا کہ اگر تو کسی کتے کو پکڑ کر اور اُسے کاٹ کر اس کا گوشت خاوند کو کھلا دے تو خاوند فوراً تیرا ھاتھہ باندھا غلام ہوجائے گا - جس طرح تو کہیگی اس طرح کرے گا - اور جو تو حکم کریگی بجالائے گا - بیوی نے سوچا یہ تو بڑا سہل نسخہ ہے - لاؤ کیوں نہ آزماؤں - فوراً ہی ھمسائی کی معرفت ایک بازاری کتا پکڑوا کر منگوایا - اور اس کے گلے پر چھری پھیر گوشت کو صاف کر چولھے پر چڑھا دیا - مصالحہ اور گھی اس میں کافی ڈالا اور اچھا تر ترا تا شوربا کردیا - شوربا کیا معلی قورما - خیر شوھر صاحب جو باھر سے آئے تو جھٹ خوشی خوشی ان کے سامنے کھانا نکالنے بیٹھی - جب وہ رکابی میں تار تار نکال رھی تھی تو صاحبزادہ بلند اقبال بھی پاس ھی تشریف فرما تھے - جن کی عمر ھوگی کوئی آٹھہ سات برس کی اور کتے کے پکڑے ھوئے آنے اور اس کے پکنے کی ساری کارروائی نور بصر کے سامنے ھی ھوئی تھی - اور ماں نے اس خیال سے کہ بچہ ہے کیا سمجھے گا اس سے معاملہ کو چھپانے کا کوئی اهتمام نہ کیا تھا - اب جو سالن نکلنا شروع ھوا تو برخوردار سوچنے لگا کہ یہ تو بری ھوئی - اگر یہ کہتا ھوں کہ ھیں ابا جان ! یہ مت کھانا کتے کا گوشت ہے تو ماں کی آج خیر نہیں - اور اگر چپ رھتا ھوں تو یہ کس طرح گوارا کرلوں کہ والد بزرگوار کتے کا گوشت کھائیں - آخر کو جو آپ کے دل میں تھا آھستہ آھستہ زبان پر بھی آنے لگا - اور آپ نے دبی زبان کہنا شروع کیا —

کہوں تو ماں ماری جائے　　نہ کہوں تو باپ کتا کھائے

باپ کو شبہ ھوا اور اس نے پیار سے پوچھا - بیٹا ! کیا بات ہے ؟ آج تو تم ایک نئی بات کہ رھے ھو - اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ ھوا -

اور میاں صاحبزادہ نے سارا کچا چٹھا باپ کے سامنے کھول کر رکھہ دیا۔
شوہر نے کڑے تیوروں سے بیوی کی طرف دیکھا اور بیوی کے :—

کاٹو تو لہو نہیں بدن میں

اس کے بعد جو کچھہ ہوا اسے ہم ناظرین کے تخیل پر چھوڑتے ہیں۔

گھڑی اِدھر اور میں اُدھر

یہ مثل ایسے بیوقوف اور احمق کے متعلق بولتے ہیں جس کے منہ سے نادانستہ طور پر جلدی میں ایسی بات نکل جائے جس سے وہ خود ملزم ہوجائے۔ اس مثل کی ابتدا اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ایک صاحب تھے اُنھیں جو ہوئی کوئی ضرورت۔ تو سوچتے سوچتے یہ ترکیب اُن کی سمجھہ میں آئی کہ ہمسایہ کے مکان میں چوری کرنی چاھئے۔ فوراً بہت سا مال ھاتھہ آجائیگا۔ اور سب دلدر پار ھوجائیں گے۔ دیوار بیچ تو تھی ھی۔ اس لئے کام بھی کچھہ مشکل نہ تھا۔ رات گئے آپ دیوار پھاند ھمسایے کے مکان میں داخل ھوے۔ یہاں سب سو رہے تھے اور سناٹا پڑا ھوا تھا۔ آپ نے جو قیمتی قیمتی چیزیں ملیں اور نقد جو کچھہ دستیاب ھوسکا ایک جگہ جمع کیا۔ وھیں سے ایک چادر لی اور اس میں سارے مال غنیمت کو باندھا۔ اور اُٹھا کر لے چلے۔ ابھی کوٹھے پر نہ پہنچے تھے کہ اُن کی بدقسمتی سے گھر کے لوگ جاگ اُٹھے۔ اور اُنھوں نے وھیں سے چور چور کا شور مچایا۔ یہ گھڑی لے کر بھاگے۔ دیوار جو پھاندنے لگے تو گھڑی سر پر سے گر پڑی۔ فوراً لوگ پہنچ گئے اور گھڑی کو قبضہ میں کیا۔ خیریت یہ ھوئی کہ یہ دوسری طرف کود چکے تھے۔ اور اُنھیں کودتے ھوے کسی نے نہیں دیکھا۔ یہ دبک گئے اور چپکے سے جاکر پلنگ

پر لیٹ گئے - اب محلہ کے جس قدر آدمی جمع تھے سب نے اپنی اپنی سمجھہ کے موافق رات کے واقعہ پر راے زنی کرنی شروع کی - چور صاحب سب انسپکٹر کی طرف مخاطب ہوے اور کہنے لگے تھانیدار صاحب! میرے تو خیال میں چور اس بیچ والی دیوار پر سے آیا ہوگا - اور اسباب باندہ کر اسی طرف واپس کودنا چاہتا ہوگا کہ گھر والے جاگ اُٹھے - اس کے آگے یہ کہنا چاہتے تھے کہ جلدی میں گھڑی اِدھر گر پڑی اور چور اُدھر کود گیا - لیکن اُن کی زبان سے نکلا یہ کہ " بس جناب گھبراہٹ میں گھڑی اِدھر اور میں اُدھر " تھانیدار نے مسکرا کر کہا " ہاں جناب آپ نے سچ فرمایا کہ گھڑی ادھر اور میں اُدھر - مگر اب تو آپ بھی ادھر ہی آجائیے " یہ کہہ کر تھانیدار نے سپاہی کو اشارہ کیا اور اُس نے اس اقبالی مجرم کے ہتھکڑیاں لگالیں —

گربہ کشتن روز اول باید

یہ فارسی کی ضرب المثل ہے جو اردو میں بہ کثرت استعمال ہوتی ہے - مطلب یہ ہے کہ کسی کام کا انتظام پہلے دن اور ابتداهی میں کرنا چاهئے - جب شروع میں کسی خرابی کی روک تھام نہ کی گئی تو پھر بعد میں اُس کا انتظام محال کے قریب ہوجاتا ہے - اور سخت دقتیں اور مشکلات پیش آتی ہیں - اس کی ابتدا کے متعلق یہ قصہ بیان کیا جاتا ہے کی دو تین دوست تھے جو آپس میں بڑی محبت سے رہا کرتے تھے مختلف اوقات میں سب کی شادیاں ہوگئیں - ارر ہر شخص فکر معاش میں مشغول ہوگیا - مدت کے بعد جو دوستوں کا آپس میں ملنا ہوا تو ایک نے دوسرے سے پوچھا کہ کہو بھئی بیوی کیسی ملی! ایک صاحب فرمانے لگے -

بھئی کچھہ نہ پوچھو ہماری بیوی تو سخت بد مزاج ھے - بات بات پر پھاڑ کھانے دوڑتی ھے - میں تو اس کے ھاتھوں سخت تنگ ھو رھا ھوں - بن نہیں آتا کہ کیا کروں ؟ دوسرے دوست فرمانے لگے - میاں ! ہماری بیوی تو ہمارے سامنے چوں نہیں کر سکتی - حکم کی بندی ھے - مجال نہیں کہ ہمارے کہنے کے خلاف کرے - شاکی دوست نے بڑے تعجب سے پوچھا کہ آخر بتاو تو سہی تم نے ایسا کیا عمل کیا تھا جو تمہاری بیوی اس قدر تمہاری فرمانبردار ھے ؟ ان صاحب نے جواب دیا - میں نے شادی سے پہلے ھی سن لیا تھا کہ میری ھونے والی بیوی بہت بد مزاج ھے - اس لئے میں نے یہ تدبیر کی کہ پہلے ھی دن ایک بلی کو تمام دن بھوکا رکھہ کر شام کو اپنے پلنگ سے باندھ دیا - رات کو جس وقت سونے کے لئے پلنگ پر لیٹا تو بلی بھوک کے مارے میاوں میاوں کرنے لگی - میں فوراً پلنگ سے کودا - اور بڑے غصہ کی شکل بناکر میں نے کہا اچھا تو کیا تو مجھے سونے بھی نہیں دیگی ؟ یہ کہا اور بڑے غصہ میں آکر میں نے تلوار سے بلی کے دو ٹکڑے کردیے - میری بیوی پہلے ھی دن میرے غصہ کو دیکھہ کر کانپ اُٹھی - اور اُس نے سوچا کہ یہ تو بڑا غصیل اور سخت آدمی ھے - اگر میں نے ذرا بھی اس کے ساتھہ سختی برتی یا اس کا حکم نہ مانا تو پھر میرا بھی یہی حشر کرے گا - بس اُس روز سے جو میرا رعب بیوی پر بیٹھا ھے تو اس وقت تک وھی حالت ھے - اور اسی وجہ سے بڑے چین و آرام سے زندگی بسر ھوتی ھے —

دوسرے دوست نے یہ عجیب و غریب قصہ سنا تو اپنے دل میں پختہ ارادہ کرلیا کہ میں بھی یہی تدبیر کروں گا - تاکہ بیوی کی درشت مزاجی سے نجات ملے - چنانچہ آپ نے بھی کہیں سے ایک بلی حاصل کی اور اسے اپنے پلنگ سے باندھ دیا - شب کو جس وقت سونے لگے تو اس نے

بندھے ہونے کی وجہ سے میاؤں میاؤں کرنی شروع کی اس پر آپ فوراً اٹھہ بیٹھے اور تلوار کھینچ کر جو پہلے ہی سے پاس رکھہ لی تھی بلی پر حملہ کیا - اور نہایت غصہ کا منہ بناکر اس کے تلوار ماری - معاً بیوی نے پیچھے سے ایک دو مکے رسید کیا - اور کہا کہ آج بیٹھے بٹھائے یہ کیا خبط سوجھا ؟ عقل بھی ٹھکانے ہے - حواس غائب کیوں ہوگئے - میں تم سے پوچھتی ہوں - آج تمھیں کیا ہوا ؟ شام تک تو تم اچھے بھلے چنگے تھے --

اب میاں کیا بولیں - دم بخود پلنگ پر لیٹ گئے اور غم و غصہ میں ساری رات گذار دی - صبح سویرے اُٹھہ کر اُن دوست صاحب کے پاس پہنچے جن سے یہ ترکیب سیکھی تھی - اور کہنے لگے - واہ حضرت اچھی ترکیب بتلائی - اور الٹی ہمارے ہی اوپر مار پڑی - دوست نے متعجب ہوکر حال پوچھا - اور کیفیت معلوم ہونے پر کھلکھلا کر ہنس پڑا اور کہنے لگا - دوست ! گربہ کشتن روز اول باید - یہ طریقہ تو تمھیں پہلے دن اختیار کرنا چاہئے تھا - اتنے دنوں کے بعد اب کیا بن سکتا ہے - اب تو بیوی کے ہاتھہ سے جتنی جوتیاں کھانی قسمت میں لکھوا لائے ہو کھانی ہی پڑیں گی —

گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے

یعنی بہ نسبت غیر شخص کے گھر کے راز دار سے بہت زیادہ نقصان پہنچ سکتا ہے - شہروں میں اکثر چھوٹی موٹی چوریاں گھر کے واقفوں اور ملازموں ہی کے پتہ بتانے پر کی جاتی ہیں - یہ مثل اس مشہور و معروف واقعہ کی طرف اشارہ کرتی ہے جب کہ رام چندر جی نے سیتا جی کو چھڑانے کے لیے لنکا کے راجہ راون پر حملہ کیا ہے - اور اسے شکست دیکر

لنکا کو پھونک دیا ہے - کہتے ہیں کہ لنکا کی فتح میں سب سے بڑا ہاتھ راون کے بھائی کا تھا - جو رام چندر جی سے مل گیا اور تمام راز کی باتیں ان کو بتلادیں - جس کی وجہ سے رام چندر جی اتنی آسانی کے ساتھ لنکا پر قابض ہوسکے - اگر وہ یہ غداری نہ کرتا تو شاید رام چندر جی کو لنکا فتح کرنے میں بہت کافی عرصہ لگتا - یا بالکل ہی فتح نہ ہوسکتی -

---

لینا ایک نہ دینا دو

یہ مثل ایسے موقع پر بولتے ہیں جہاں نہایت ہی معمولی بات پر جھگڑا ہونے لگے - یا مفت میں کوئی شخص مشکل میں پھنس جاے - فضول اور بیکار میں پھنس جانے والے کے لیے بھی بولتے ہیں اس کا قصہ یہ مشہور ہے کہ ایک مور اور ایک مینڈک کی بڑی گہری دوستی تھی - مینڈک پانی میں سے باہر آجاتا اور دونوں دیر تک خوب سیر کرتے - پھر مور مینڈک کو پانی میں چھوڑ جاتا اور اپنے آپ چلا جاتا - ایک روز اسی طرح مور مینڈک کو چھوڑ کر واپس جا رہا تھا کہ کسی چڑی مار کے جال میں پھنس گیا - اور چڑیمار اسے شہر کو لے چلا - اب تو مور بڑا گھبرایا - اور چڑیمار سے کہنے لگا کہ تم نے آخر مجھے کس غرض سے پکڑا ہے ؟ اور تم میرا کیا کروگے ؟ چڑیمار نے کہا کروں گا کیا - بازار میں لیجا کر بیچوں گا - اور پیسے لیکر بال بچوں کو کھلاؤں گا - مور نے کہا اچھا اگر میری معمولی قیمت سے بہت زیادہ قیمتی شے تم کو میرے معاوضہ میں مل جاے تو کیا تم مجھے چھوڑ دوگے چڑیمار نے کہا ہاں مجھے اور کیا چاھئے ؟ اس پر مور نے کہا اچھا تو مجھے سمندر کے کنارے لے چلو - خیر سمندر کے کنارے پہنچ کر مور نے مینڈک کو آواز دی - وہ فوراً پانی سے باہر آیا

یہاں دیکھا تو دوست کو جال میں پھنسا پایا ۔ مور نے کہا ۔ بھئی اس وقت میں اس چڑیمار کے جال میں پھنس گیا ہوں اور اس بات پر میری رہائی کا وعدہ چڑیمار کرتا ہے کہ اگر بازار میں جو کچھہ میری معمولی قیمت اٹھے اس سے بہت زیادہ قیمتی چیز اس کو دے دی جاے تو یہ مجھے چھوڑ دے گا ۔ اب میں تمھارے پاس آیا ہوں کہ تم میری رہائی کے معاملہ میں میری مدد کرو ۔ مینڈک نے فوراً پانی میں غوطہ مارا اور ایک بڑا سا موتی لاکر اسے دکھایا ۔ اور کہنے لگا لو یہ ایسا موتی ہے کہ ہزاروں روپے کا فروخت ہوگا ۔ اور سواے بادشاہ کے اور کوئی اس کی قیمت نہیں دے سکتا ۔ اسے لو اور مور کو چھوڑ دو ۔

اتنے بڑے موتی کو دیکھہ کر چڑیمار کو لالچ پیدا ہوا اور کہنے لگا کہ میں تو جوڑا لوں گا ۔ مینڈک نے کہا اچھا تم مور کو چھوڑ دو ۔ میں اس کا جوڑا لاتا ہوں ۔ چڑیمار نے مور کو چھوڑ دیا ۔ اور مینڈک نے مور سے کہا بھئی ! اب تم تو یہاں سے فوراً ہوا ہوجاؤ ۔ رہ گیا چڑیمار ! تو یہ ایک موتی لینا نہیں اور میں اسے جوڑا دینے کا نہیں ۔ لہذا لینا ایک نہ دینا دو ۔ تم اپنی منزل کھوٹی کیوں کرو ۔ جاؤ اب کل ملیں گے ۔ یہ کہا اور پانی میں غوطہ مار کر غائب ہوگیا ۔ اور بیچارا چڑیمار کف افسوس ملتا ہوا گھر کو چلا آیا ۔

مایا تیرے تین نام پرسا ۔ پرسو ۔ پرس رام

یہ مثل ایسے موقع پر بولتے ہیں جب کہ کوئی شخص ادنیٰ حالت سے ترقی کرکے دولت مند بن جاے تو لوگ اس کی دولت کے سبب اس کی عزت کرنے لگیں ۔ اور اس کا نام تعظیم سے لینے لگیں ۔ حالانکہ پہلے اس کو

اس کے معمولی نام سے مخاطب کرتے تھے - اس مثل کی ابتدا کے متعلق یہ قصہ مشہور ہے کہ پرسا نام ایک معمولی غریب آدمی کسی قصبہ میں رہتا تھا - لوگ اسے پرسا پرسا کر کے پکارتے تھے - کیونکہ یہی اس کا نام تھا - رفتہ رفتہ اس کی مالی حالت سدھرنے لگی اور وہ اچھا کھاتا پیتا شخص ہوگیا - اب لوگ اسے بجائے پرسا کے ذرا کچھہ لحاظ کے ساتھہ "پرسو" کہنے لگے - کچھہ عرصہ کے بعد اتفاق سے وہ ایک بڑا دولت مند اور امیر ہوگیا - اب لوگوں نے اسے تعظیماً سیٹھہ پرسرام کہنا شروع کیا - دولت کے ساتھہ ساتھہ ناموں کی ان تبدیلیوں کو دیکھہ کر ایک شخص نے یہ فقرہ کہا اور آہستہ آہستہ ضرب المثل بن گیا —

مُلا کی ڈاڑھی تبرک میں گئی

یہ مثل ایسے موقع پر بولتے ہیں جہاں کوئی چیز فضول اور بے کار خرچ ہوجاے اور جائز طریقے پر خرچ نہ ہو - کہتے ہیں کہ یہ مثل یوں شروع ہوئی کہ کوئی مولوی صاحب تھے - جو کسی گاؤں میں وعظ کرنے کے لیے گئے - اور وعظ کے بعد حسب معمول کچھہ مٹھائی ان کے سامنے بطور تبرک کے تقسیم کرنے کے لیے رکھی گئی - مولوی صاحب جو تبرک تقسیم کرنے کے لئے کھڑے ہوے تو اتفاقاً ایک بال اُن کی لمبی ڈاڑھی میں سے گرا - اور جاہل دیہاتیوں نے اُسے بھی تبرک جان کر فوراً خود اٹھا لیا - دوسروں نے دیکھا تو جھٹ ہاتھہ بڑھا مولوی صاحب کی ڈاڑھی کے چند بال اُکھیڑ بطور تبرک آپس میں تقسیم کر لیے - اُن کی دیکھا دیکھی دوسروں نے بھی جو اب تک بیٹھے ہوے یہ تماشا خاموشی سے دیکھہ رہے تھے مولوی صاحب کی ڈاڑھی پر ہاتھہ صاف کیا اور چند بال حاصل کر لئے - قصہ مختصر آن

کی آن میں مولوی صاحب کی ساری ڈاڑھی تبرک بن کر رہ گئی- اور مولوی صاحب جاہل دیہاتیوں کی اس عجیب و غریب تبرک پسندی سے پریشان ہوکر وہاں سے سر پر پیر رکھہ کر بھاگے اور گھر آکر دم لیا - یار لوگوں نے جو یہ لطیفہ سنا تو ان کو ایک بات ہاتھہ آئی اور گھر گھر مولوی صاحب کے تبرک کا تذکرہ ہونے لگا - اور بعد میں یہ واقعہ بطور ضرب المثل کے بیان کیا جانے لگا —

موچھوں پر تاؤ دینا

یہ اگرچہ کوئی ضرب المثل نہیں بلکہ ایک محاورہ ہے - لیکن چونکہ اس کے متعلق ایک قصہ بھی مشہور ہے لہذا ضرب الامثال کی ذیل میں اسے درج کیا گیا ہے - یہ محاورہ شیخی باز آدمی کے لئے استعمال کیا جاتا ہے ۔ اور اس کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ کوئی شیخ صاحب تھے - گھر سے جو نکلے تو موچھوں کو تاؤ دیتے ہوے اور اینٹھتے ہوے - اتفاقاً سامنے سے ایک خان صاحب بھی تشریف لا رہے تھے ۔ انھوں نے جو شیخ صاحب کو موچھیں چڑھاے ہوے آتے دیکھا تو انھیں بڑا غصہ آیا - کہنے لگے سنو شیخ صاحب ! کیا تم ہی سب سے زیادہ بہادر اور شجاع ہو ؟ اگر تمھیں بہادری کا کچھہ زعم ہے تو آو دو دو ہاتھہ ہوجائیں - جو جیتے وہی اپنی موچھوں پر تاو دے - شیخ صاحب بھی نہایت ہوشیار واقع ہوے تھے - سوچنے لگے مقابلہ پر پٹھان بھائی سے ور آنا مشکل ہے - لاو اس وقت کوئی چال چلو - جھٹ اکڑ کر جواب دیا - خان صاحب ہم کیا تم سے کسی بات میں ہٹتے ہیں ؟ مگر یوں لڑنے کا لطف نہیں - ایک کام کرو ۔ تم اپنے گھر والوں کا صفایا کر آو ۔ اور میں اپنے بچوں اور

بیوی کو قتل کرآوں - پھر دونوں بے فکر ہوکر لڑیں گے - آگے نتیجہ خدا کے ہاتھہ ہے - خان صاحب سپاہی آدمی تھے - اس چال کو نہ سمجھے اور جوش شجاعت میں کہنے لگے " منظور " اور یہ کہہ گھر کی طرف روانہ ہوگئے - اور جاتے ہی ایک ایک کرکے سارے گھر والوں کو مار دھرا - فارغ ہوکر آپ باہر تشریف لاے تو شیخ صاحب بھی سامنے سے آتے ہوے دکھائی دیے - ان کی مونچھیں اسی طرح چڑھی ہوئی تھیں - آتے ہی انھوں نے خان صاحب سے ہنس کر کہا " خان صاحب ! اچھا آپ یہ تو بتائیں کہ آپ مجھہ سے کیوں ناراض ہیں ؟ اور کیوں آپ کو مجھہ پر غصہ آرہا ہے " خان صاحب نے فرمایا - وجہ ظاہر ہے - تم میرے مقابلہ پر مونچھوں کو تاو دیتے ہوے گھر سے نکلے - اس سے زیادہ بناے مخاصمت اور کیا ہوسکتی ہے ؟ اس لئے اب یا تو تم ہی دنیا میں رہوگے یا میں ہی رہوں گا - آو مقابلے پر اور نکالو اپنے ہتھیار —

شیخ صاحب نے جواب دیا - واہ خان صاحب ! آپ نے اچھی کہی - کیا صرف اتنی سی بات آپ کی ناراضگی کا موجب ہوئی - لاحول ولا قوۃ - بھلا یہ بھی کوئی ایسی بات تھی جس کی وجہ سے اتنا جھگڑا بکھیڑا کرنا پڑا - اگر آپ میری مونچھیں چڑھانے سے خفا ہیں تو لیجئے میں اپنی مونچھیں نیچی کرلیتا ہوں - آپ ناراض نہ ہوں - اور غصہ تھوک دیں - یہ کہہ کر جھٹ اپنی مونچھیں نیچی کرلیں - اور فوراً وہاں سے چل دیے - پٹھان بے چارا پیچ و تاب کھاکر رہ گیا کہ مقابلہ بھی نہ ہوا اور اہل و عیال بھی سارے موت کے گھاٹ اترے - مگر اب کیا ہوسکتا تھا جو کچھہ ہونا تھا وہ ہو چکا تھا - مگر اس معاملہ کا صدمہ بے چارے خان صاحب کو ہمیشہ رہا - اس وقت سے یہ محاورہ استعمال ہونے لگا —

نمازی کا ٹکا

یہ ضرب المثل ایسے وقت میں بولتے ھیں جب کہ یہ ظاھر کرنا ھو کہ فلاں کام کی جزا کبھی نہ کبھی مل ھی جاے گی۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ھے کہ کوئی لڑکا تھا بڑا شریر اور چالاک - اس کو یہ ایک بری عادت پڑی کہ مسجد میں جب لوگ سجدہ میں جاتے تو ان کی ٹانگیں پکڑ کر کھینچ لیتا - ایک مرتبہ جو ایک شخص کی ٹانگیں اس نے پکڑ کر گھسیٹیں تو اس نے بڑی نرمی اور شفقت سے اسے پاس بلایا - اور ایک ٹکا جیب میں سے نکال کر اس کے حوالے کیا اور کہا لو میاں صاحبزادے اس کی ریوڑیاں کھانا ٹکا پاکر لڑکا بڑا خوش ھوا - اور خیال کرنے لگا کہ اس آدمی نے ڈرکر مجھے یہ ٹکا دیا ھے تاکہ میں پھر کبھی اس کی ٹانگیں نہ کھینچوں۔ یہ تو بڑا اچھا روزگار ھے - اگر لوگ اسی طرح ڈرکر مجھے روزانہ ٹکے دیا کریں تو پھر تو قسمت میں چین ھی چین لکھا ھے - روز مرہ ریوڑیاں کھانے میں آیا کریں گی - چنانچہ اسی امید میں اس نے پہلے سے بھی زیادہ مستعدی کے ساتھ یہ فرض انجام دینا شروع کیا - مگر اس نمازی نے در اصل یہ ٹکا اس کو اس غرض سے دیا تھا کہ ٹکے کے لالچ میں جب یہ لڑکا اسی طرح لوگوں کی ٹانگیں کھینچا کرے گا تو کبھی نہ کبھی کوئی ایسا آدمی بھی نکل آے گا جو اس کو اس کرتوت کی پوری پوری سزا دے دے گا - حسب امید لڑکے نے ایسا ھی کیا - اتفاقاً ایک روز کوئی اجلھی پٹھان صاحب بھی نماز پڑھنے مسجد میں آگئے - لڑکے نے حسب معمول ان کی بھی ٹانگیں پکڑ کر گھسیٹیں اور امید کی کہ شاید یہ بھی مجھے ٹکا دے - پٹھان صاحب کو جو غصہ آیا تو انہوں نے ایک دو ھتڑ ایسا رسید کیا کہ سارا کھایا پیا منہ کے راستے نکل گیا - اور خون کی قے جاری ھوگئی - لوگ اسے

اٹھا کر اس کے گھر لے گئے - اور بہت دنوں کے بعد وہ اچھا ہوا - سبق ایسا ملا تھا کہ پھر ساری عمر کو اسے کان ہوگئے اور آئندہ کسی شخص کی ٹانگیں پکڑ کر گھسیٹنے کی جرأت اسے نہیں ہوئی - غرض یہ ہے کہ اس نمازی کا ٹکا بیکار نہیں گیا - اور اسی کا ثمرہ تھا کہ لڑکا ہمیشہ کے لئے اس فعل سے تائب ہوگیا ــ

—— * ——

ننانوے کے پھیر میں پڑ گیا

کسی ایسی مشکل میں پھنس جانے کے موقع پر بولتے ہیں جس سے رہائی ہی نہ مل سکے - کہتے ہیں کہ کوئی شخص تھا - اگرچہ گھر میں غربت تھی مگر معمولی طور پر گھر کا گذارا چلتا رہتا تھا - اور گھر کے سب لوگ اس غریبی میں بھی خوش و خرم رہتے تھے - کیونکہ کچھہ فکر نہ تھا - ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ وہ شخص جنگل میں چلا جاتا تھا کہ اس کو ایک تھیلی درخت کے نیچے پڑی ملی - اٹھا کر جو کھولا تو روپوں سے بھری ہوئی تھی - جلدی سے تھیلی کو اپنے کرتے کے نیچے چھپا لیا - اور لوگوں کی نظروں سے بچتا ہوا گھر پہنچا - کواڑ اچھی طرح سے بند کر کے بیوی کو بلایا - اور اس کے سامنے تھیلی رکھہ دی - بیوی نے حیرت سے میاں کی طرف دیکھا اور پوچھا کہ کیا بات ہے اور اتنے سارے روپے کہاں سے مل گئے ؟ شوہر نے سارا واقعہ سنایا - دونوں نے اس مال غنیمت کے ملنے پر بڑی خوشی کا اظہار کیا کہ اب بڑے چین و آرام سے زندگی بسر ہوگی - دونوں نے روپوں کو گنا تو ۹۹ روپے تھے - سوچنے لگے کہ یہ تو کچھہ نہ ہوئی - پورے سو بھی نہ ہوے - اچھا خیر کچھہ مضائقہ نہیں - ہم محنت مزدوری کر کے اس میں ایک روپیہ اور ملا دیں گے - اور پورے سو روپے

کردیں گے - چنانچہ انہوں نے بڑی محنت مشقت اٹھا کر اور اپنا پیٹ کاٹ کر ایک روپیہ ذرا ذرا سا کرکے روزانہ اخراجات میں سے بچایا - اور پورے سو روپے کردیے جب سو روپے ہوگئے تو اب دونوں میاں بیوی کو خیال آیا کہ اگر یہ دوسو روپے ہوجائیں تب تو ہم خاصے امیر آدمی ہوجائیں گے - یہ خیال کرکے دونوں نے پور گھر کے اخراجات میں کتر بیونت کرنی شروع کی - اور پہلے سے زیادہ کفایت شعاری کیا معنی بلکہ کنجوسی کے ساتھہ خرچ کرنا شروع کیا - گھر کا آرام راحت اور خوشی اس خبط میں سب جاتی رہی - اور ہر وقت یہی دھن انہیں لگ گئی کہ کسی طرح یہ رقم دو سو روپے تک پہنچ جائے - کسی شخص نے جو اس مصیبت میں ان کو دیکھا تو ان کے حسب حال یہ فقرہ کہا اور چونکہ بالکل موزوں تھا بطور ضرب المثل استعمال ہونے لگا —

—— * ——

واہ پیر علیا! پکائی تھی کھیر - ہوگیا دلیا

کسی کام کے بری طرح سے بگڑ جانے کے موقع پر یہ مثل بولا کرتے ہیں - اس کے متعلق یہ قصہ مشہور ہے کہ علیا نامی کوئی پیر صاحب تھے - انہوں نے ایک بڑھیا سے پوچھا کہ بڑی بی کیا پکا رہی ہو - بڑھیا نے کھیر چڑھا رکھی تھی خیال کرنے لگی - اِن سے کہا کہ کھیر ہے تو ساری چٹ کرجائیں گے اور مجھے کچھہ بھی نہ بچے گی - کہنے لگی - پیر جی صاحب! تھوڑا سا دلیا پکا رہی ہوں اور تو کچھہ نہیں - خیر پیر جی صاحب خاموش ہو کر چلے گئے تھوڑی دیر میں بڑھیا نے جو چپنی اتار کر ہنڈیا کو دیکھا تو واقعی دلیا ہی کھدر بدر پک رہا تھا - بڑھیا نے دلیا دیکھہ کر اپنا سر پیٹ لیا - اور کہنے لگی - واہ پیر علیا! پکائی تھی کھیر ہوگیا دلیا - اب کیا کروں پیرجی کی بد دعا لگ گئی -

وہ پانی ملتان گیا

یہ مثل ایسے موقع پر بولتے ہیں جب کسی شخص سے یہ کہنا ہو کہ تم نے غفلت اور سستی میں وقت گذار دیا - اور اب پچھتانے سے کیا ہوتا ہے - اس کہاوت کا ماخذ یہ حکایت بیان کی جاتی ہے کہ بنارس میں کوئی چمار رئیداس نام رہتا تھا مگر تھا ایشور کا بڑا بھگت - اور دور دور اپنے زہد و تقدس کی وجہ سے مشہور تھا - ایک روز گورکھہ ناتھہ نامی ایک بڑے مہاتما اس سے ملنے کے لیے آئے - اس کے ہاں پہنچتے ہی ان کو ایسی پیاس لگی کہ جان بے چین ہوگئی - انہوں نے رئیداس سے کہا ذرا سا پانی پلاؤ - رئیداس فوراً اٹھا اور ایک مٹی کے پیالہ میں پانی لاکر گورکھہ ناتھہ کے سامنے رکھہ دیا - اس وقت گورکھہ ناتھہ مہاتما کو خیال آیا کہ اوھو یہ تو چمار ہے - اس کے ہاں کا پانی کس طرح پاک ہو سکتا ہے - خیر جب وہ پانی لایا تو انہوں نے کہا بھئی میری چھاگل میں ڈال دو اور آپ باتوں میں مشغول ہوگئے - اور تھوڑی دیر کے بعد اٹھہ کر اور چھاگل لے کر چلے آئے - اس کے بعد کبیر صاحب کے ہاں پہنچے - چھاگل رکھہ دی اور کبیر صاحب سے باتیں کرنے لگے - اتنے میں کبیر صاحب کی لڑکی آئی - پانی رکھا تھا - اسے جو پیاس لگی تو غٹ غٹ سارا چڑھا گئی - پانی کا حلق سے اترنا تھا کہ لڑکی پر چودہ طبق روشن ہوگئے - اور زمین و آسمان کا سب پوشیدہ حال اس پر ظاہر ہوگیا - جب گورکھہ ناتھہ پر یہ حال کھلا تو وہ بہت ہی پچھتائے کہ وہ پانی میں نے کیوں نہ پی لیا - بھاگے بھاگے پھر رئیداس کے ہاں گئے - اور چھوٹتے ہی اس سے کہنے لگے - میاں ذرا سا پانی تو پلواؤ - وہ اپنے علم کے زور سے سارے حال سے پہلے ہی واقف ہوچکا تھا - کہنے لگا گورکھہ ناتھہ مہاراج ! وہ

پانی ملتان گیا - بات یہ تھی کہ بعد میں وہ لڑکی جس نے پانی پیا تھا
اپنی سسرال روانہ ہوچکی تھی - جو ملتان میں تھی - اسی وجہ سے
رئیداس نے کہا کہ وہ پانی ملتان گیا - گورکھہ ناتھہ بھی چارے سمجھہ
گئے کہ اب پھر پانی کا ملنا محال ہے - لہذا افسوس کرتے ہوئے
گھر کو چلے آئے —

وہی مرغے کی ایک ٹانگ

یعنی کسی بیجا اور نا واجب بات کے صحیح اور درست ہونے پر
اصرار کرنا - اپنی ضد پر اڑے رہنا - اس مثل کے متعلق یہ قصہ مشہور
ہے کہ کسی صاحب بہادر کا ایک خان ساماں تھا نہایت چالاک - ایک
مرتبہ صاحب نے اس سے کہا کہ رات کے کھانے کے لیے ایک مرغ پکاؤ -
چنانچہ خانساماں نے ایک نہایت فربہ مرغ کا سالن تیار کیا - اور نصف
سالن اور ایک ٹانگ خود چٹ کی - صاحب کے سامنے جس وقت ایک
ہی ٹانگ آئی تو انھوں نے خانساماں کو بلایا اور پوچھا کہ مرغ کی
ایک ٹانگ کیا ہوئی ؟ بغیر ایک لحظہ تامل کیے ہوئے خانساماں نے برجستہ
جواب دیا کہ حضور ! یہ بڑا اصیل اور نہایت اعلیٰ نسل کا مرغ تھا جو میں
حضور کے لیے بڑی تلاش سے بہت قیمت دے کر لایا تھا - اس نسل کے مرغوں
کی اور خصوصیات کے علاوہ ایک بڑی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ یہ صرف
ایک ٹانگ کے ہوتے ہیں - صاحب عقلمند تھے - سوچا کہ خانساماں جوتیوں
سمیت آنکھوں میں بڑنا چاہتا ہے - ہنس کر چپکے ہوگئے - دو تین روز کے
بعد اتفاقاً صاحب کہیں جا رہے تھے - خانساماں ساتھہ تھا - کہ راستے میں
ایک مرغ اپنا ایک پاؤں پروں میں چھپائے کھڑا تھا - خانساماں نے دیکھتے ہی

چوہٹ صاحب کو ادھر متوجہ کیا - اور کہنے لگا دیکھئے حضور یہ مرغا بھی اسی نسل کا ہے جو آپ نے پرسوں کھایا تھا - اس کے بھی ایک ہی ٹانگ ہے اور اس کے بھی ایک ہی ٹانگ تھی - صاحب نے مسکراتے ہوئے تالی بجاکر جو ہش کی تو فوراً مرغا چوکنا ہوکر دونوں ٹانگوں سے کھڑا ہوگیا - صاحب نے خانساماں کی طرف دیکھا - خانساماں بڑا ہی ہوشیار اور حاضر جواب تھا - فوراً بول اٹھا - آج تو حضور نے کمال کردیا جیسے تالی بجاکر یہاں حضور نے مرغے کی دونوں ٹانگیں پیدا کردیں ایسا ہی حضور نے کھانے پر اس روز تالی نہ بجائی - نہیں تو وہاں بھی فوراً دوسری ٹانگ موجود ہوجاتی - صاحب کو اس کے اس برجستہ جواب پر بے اختیار ہنسی آگئی اور قصہ آیا گیا ہوا - اس وقت سے یہ فقرہ بطور ضرب المثل استعمال ہونے لگا ۔

ہنوز دہلی دور است

اس فارسی ضرب المثل کے معنی ہیں "ابھی دلی دور ہے" یہ ایسے موقع پر بولتے ہیں جب یہ ظاہر کرنا ہو کہ کام کے بننے اور مقصد کے حاصل ہونے میں ابھی بہت دیر لگے گی - اور منزل مقصود ابھی کوسوں دور ہے - یہ اگرچہ فارسی کی کہاوت ہے مگر اردو میں بہ کثرت مستعمل ہے - اور اسی لئے ہم اسے یہاں لکھتے ہیں - خوش قسمتی سے یہ مثل ایسی ہے کہ اُس کی ابتدا کے متعلق تاریخ کے روشن صفحات ہماری پوری پوری رہنمائی کرتے ہیں اور ہمیں صحیح اور یقینی طور پر اُس کے ماخذ کا پتہ معلوم ہے - تفصیل حسب ذیل ہے :—

خسرو خاں نامی ایک نوجوان شخص نے سنہ ۷۲۰ ھ مطابق ۱۳۱۳ ع

میں قطب الدین مبارک شاہ پادشاہ دہلی کو قتل کرکے دارالسلطنت پر قبضہ جمایا - اور ہندوستان کا بادشاہ ہوگیا - اس شکر میں اس نے دہلی میں جتنے بڑے بڑے علماء اور زہاد اور صوفیاے عظام تھے سب کو معقول ہدیے اور نذرانے بھیجے - اور تمام مشائخ دہلی کے سرتاج حضرت شاہ نظام الدین اولیاء محبوب الہی کے حضور میں بھی پانچ لاکھ تنکہ پیش کئے - اس دربار میں شاہی نذرانے کی کیا وقعت ہونی تھی - فوراً حضور نے تمام رقم غریبوں اور حاجتمندوں میں تقسیم فرما دی اور ایک پیسہ بھی اپنے پاس نہ رکھا —

زمانہ کی بساط الٹی اور خسرو خاں نے صرف چار ماہ حکومت کے مزے لوٹے تھے کہ اس کو بھی وہی دن دیکھنا نصیب ہوا جو اس نے قطب الدین کو دکھایا تھا - یعنی غیاث الدین تغلق کے ہاتھہ سے مارا گیا - اور اب غیاث الدین دہلی کا بادشاہ تھا —

بادشاہ ہوتے ہی اس نے تمام مشائخ دہلی کے نام ایک فرمان جاری کیا کہ جس جس شخص کو خسرو خاں نے ہدیے اور نذرانے پیش کیے تھے سب واپس لاکر بادشاہ کے حضور میں پیش کریں - کیوں کہ یہ خسرو خاں کا اپنا مال نہیں تھا - بلکہ شاہی خزانہ جو سلطنت کی چیز تھی بے دریغ لٹایا گیا تھا - پس جو اشخاص رقمیں واپس پیش نہ کریں گے - غضب سلطانی کے مورد بنیں گے - چنانچہ مارے خوف کے تمام بزرگوں نے فوراً بلا توقف رقمیں شاہی قاصدوں کے حوالے کیں - اور جنھوں نے رقمیں واپس کرنے میں ذرا بھی تامل کیا - انھیں سخت تکلیفیں دی گئیں - جب شاہی قاصد حضرت سلطان الاولیاء کے حضور میں پہنچا اور فرمان سلطانی پیش کیا تو آپ نے فرمایا کہ بھئی میری طرف سے کہہ دینا کہ

روپیہ تو خرچ کرنے اور غریبوں کی امداد کرنے کے لئے ہوتا ہے۔ نہ کہ جوڑنے اور حفاظت سے رکھہ چھوڑنے کے لئے۔ میں نے تو اسی وقت تمام روپیہ ضرورتمندوں اور مساکین میں تقسیم کردیا تھا۔ اب میرے پاس روپیہ کہاں جو میں دے دوں —

غیاث الدین کو اس صاف جواب پر غصہ تو بہت آیا مگر حضرت سلطان المشائخ کی شخصیت اتنی زبردست تھی کہ بادشاہ ان کو گرفتار کرانے یا کسی سزا کے دینے کا خیال بھی نہیں کرسکتا تھا۔ مجبوراً چپ ہورہا۔ کینہ توز اور بد باطن اراکین دولت نے جب دیکھا کہ بادشاہ حضرت سلطان المشائخ سے ناراض ہے تو انہیں اور کیا چاہیے تھا۔ حضرت کے خلاف بادشاہ کو بھڑکانے کا خوب موقع ہاتھہ آیا۔ چنانچہ انہوں نے حضرت محبوب الہی کے خلاف بہت سے اتہامات تراشے اور انہیں خوب نمک مرچ لگا کر بادشاہ کے سامنے پیش کیا۔ منجملہ اور باتوں کے یہ بھی کہا کہ حضور وہاں تو ہر وقت محفل سماع منعقد رہتی ہے جو بالکل خلاف شرع اور بدعت ہے۔ فوراً علماے کرام سے اس کے متعلق استفسار کیا جاے کہ ایسے شخص کی کیا سزا ہونی چاہئے جو یوں علانیہ شریعت کی ہتک کرے۔ فرشتہ اس واقعہ کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے :—

"جمعے کہ با شیخ عداوت و حسد داشتند و منکر سماع بودند۔ فرصت یافتہ بہ عرض رسانیدند کہ ایں شیخ با جمیع مریدان خود غیر از سماع کارے ندارد و سرود کہ در مذہب حنفی حرام است۔ می شنود۔ پس بادشاہ را واجب است کہ علماء را طلبیدہ محضرے سازد و او را ازاں فعل نامشروع نہی نمائد"۔

کتاب سیر الاولیاء کے صفحات ۵۲۰ - ۵۲۷ پر یہ واقعہ نہایت تفصیل سے لکھا ہوا ہے - اور اس میں ان تمام کمینہ خصلت لوگوں کے نام بھی گنائے گئے ہیں جو اس شیطانی فعل میں شامل تھے- چنانچہ علماء نے حسب معمول بڑے ذوق و شوق سے حضرت سلطان الاولیاء کے خلاف کفر اور فسق کے فتوے دے دیے اور اپنے نزدیک بڑی خدمت اسلام انجام دی - نتیجہ یہ ہوا کہ علماء عصر اور حضرت محبوب الٰہی کے درمیان دربار سلطانی میں ایک زبردست مباحثہ ہوا - جس میں علماء کو شکست کی ذلت نصیب ہوئی - اور حضرت شیخ واپس گھر چلے آے - اور اس طرح یہ قضیہ نامرضیہ بہ ظاہر ختم ہوگیا - مگر بادشاہ کے دل میں دشمنی اور کاوش پیدا ہوگئی ——

اس واقعہ کے تھوڑے ہی عرصہ بعد بادشاہ کو بنگالہ کی مہم پیش آگئی - اور وہ وہاں چلا گیا - مہم کو سر کرنے کے بعد جب وہاں سے واپس دارالسلطنت کی طرف لوٹا تو راستہ ہی میں سے حضرت سلطان الاولیاء کو فرمان بھیجا کہ ہم واپس پایۂ تخت کو آ رہے ہیں- اگر اپنی خیر چاہتے ہو تو فوراً دہلی کو خالی کر دو- اور جہاں دل چاہے چلے جاؤ - میرے داخلہ دہلی کے وقت اگر تم وہیں ہوئے اور وہاں سے چلے نہ گئے تو پھر تمہارے حق میں اچھا نہ ہوگا ——

حضرت شیخ کے پاس جس وقت یہ فرمان شاہی پہنچا تو آپ پڑھ کر ہنسے اور صرف اتنا فرمایا کہ "ہنوز دہلی دور است" یعنی بادشاہ نے جو لکھا تھا کہ میں دہلی آرہا ہوں- اس کے جواب میں آپ نے فرمایا کہ ابھی دہلی بہت دور ہے- حضرت محبوب الٰہی کے منہ سے اس فقرہ کا نکلنا تھا کہ معاً سارے شہر میں مشہور ہوگیا ——

اب سنئے کہ شہنشاہ بڑے شان و شوکت اور تزک و احتشام سے منزل بہ منزل کوچ کرتا ہوا نہایت اطمینان سے دارالسلطنت کو واپس آرہا تھا -

اور خیال کر رہا تھا کہ نظام الدین کی کیا مجال ہے جو میرے اس قاہرانہ حکم سے ذرا سرتابی کر سکے - اور یقیناً میرے داخلۂ دہلی سے پہلے دہلی اُس کے وجود سے پاک ہو جاے گی - اِدھر بادشاہ کی واپسی کی خبر ملتے ہی دارالخلافہ میں اُسکے شاندار استقبال کی تیاریاں ہونے لگیں اور تمام شہر دلہن کی طرح سجایا جانے لگا - قرار یہ پایا کہ شہر کے تمام معززین اور بادشاہ کے اراکین دربار شہر سے باہر تین کوس پر جا کر شہنشاہ کا استقبال کریں - جہاں ایک رفیع الشان محل اس غرض سے تعمیر کیا جائے کہ بادشاہ آن کر اُس میں قیام فرمائیں - اور کچھ عرصہ وہاں اپنی تکان دور فرماکر پھر دارالسلطنت میں داخل ہوں - غرض ولیعہد نے نہایت سرعت کے ساتھ محل تیار کروایا - اور اُسے ہر قسم کے سامان آرائش سے آراستہ کیا - جس وقت بادشاہ کے آنے کی خبر ہوئی ایک بڑا جم غفیر معزز لوگوں اور درباری آدمیوں کا بادشاہ کے استقبال کے لیے شہر سے باہر نکلا اور اُسی قصر میں سب نے اپنی نذریں بادشاہ کے حضور میں پیش کیں - ولیعہد نے ایک نہایت پرتکلف دعوت بادشاہ اور تمام حاضرین کی کی - لوگ کھانا کھا کر فارغ ہوئے ہی تھے اور بادشاہ نے ابھی ہاتھ بھی نہیں دھوئے تھے کہ قہر الٰہی بجلی بن کر گرا - اور بادشاہ کے ساتھ چند اور امرا کو بھی زندگی سے ہاتھ دھونے پڑے - معاً تمام حاضرین کو "ہنوز دہلی دور است" کا الہامی فقرہ یاد آیا - اور سب نے نہایت صاف طور پر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ بادشاہ کے لئے دہلی صرف تین کوس کے فاصلے پر ہونے کے باوجود کس قدر دور ہے اور ہمیشہ دور ہی رہے گی - سب نے حیرت اور تعجب کے ساتھ ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور اب وہاں ہر شخص کی زبان پر

"ہنوز دہلی دور است" کا جملہ تھا - جس کو دہراتے ہوئے وہ لوگ افسوس کے ساتھ اپنے اپنے گھروں کو واپس ہو رہے تھے - اُسی وقت سے یہ فقرہ ضرب المثل کے طور پر استعمال ہونے لگا - چنانچہ عبدالقادر بدایونی اپنی تاریخ کی جلد اول کے صفحہ ۲۲۵ پر لکھتا ہے :—

"مردم چوں دانستہ بودند کہ سلطان بہ سرعت سوار می شود - دست ناشستہ ازاں خانہ بر آمدند - و سلطان بہ تقریب دست شستن ازآں خانہ برنیامد تا دست از حیات شست وقصر بر سر او افتاد ... ... سلطان غیاث الدین تغلق با سلطان المشائخ چوں سوء مزاج داشت از راہ لکھنوتی پیغام بہ شیخ فرستاد کہ بعد ازاں کہ من بہ دہلی رسم یا شیخ آں جا باشد یا من - شیخ فرمود "ہنوز دہلی دوراست" وایں سخن ازاں روز ضرب المثل گشتہ شہرت یافت"-

دیکھا سلطان وقت نے سلطان المشائخ سے مقابلہ کا انجام! کیا اچھا کہا ہے :—

جو خدا کا ہے اُسے للکارنا اچھا نہیں
ہاتھ شیروں پر نہ ڈال اے روبۂ زار و نزار

یک من علم را دہ من عقل باید

مطلب یہ ہے کہ محض علم فائدہ مند نہیں جب تک کہ اس کے ساتھ انسان میں عقل بھی نہ ہو - اردو میں اس مثل کا لفظی ترجمہ بھی بطور ضرب المثل کے مستعمل ہے یعنی ایک من علم کے لئے دس من عقل چاہئے - اس مثل کی ابتدا کے متعلق یہ حکایت مشہور ہے کہ کسی

بادشاہ نے اپنے لڑکے کو ایک بڑے ماہر نجومی اور جفار کے حوالے کیا اور کہا کہ اِسے خوب اچھی طرح نجوم اور جفر کی تعلیم دو خیر پانچ چھ سال کے بعد نجومی نے ایک روز بادشاہ کے حضور میں عرض کیا کہ میں نے شہزادہ کو نجوم میں کامل کردیا ہے اور جو کچھ مجھے آتا تھا سب کچھ اُسے بتا دیا ہے - بادشاہ نے ایک تاریخ شہزادہ کے امتحان لینے کی مقرر کی - بڑی شان سے دربار آراستہ کیا اور نجومی کو اپنے برابر تخت پر بٹھایا - خیر اب امتحان شروع ہوا - بادشاہ نے ایک سونے کی انگوٹھی اپنی مٹھی میں دبا کر شہزادہ سے پوچھا - بتاؤ! میرے ہاتھ میں کیا ہے - شہزادہ نے تھوڑی دیر کچھ حساب لگاکر جواب دیا "والا حضرت کے ہاتھ میں کوئی ایسی چیز ہے جو بیچ میں سے خالی ہے" - بات ٹھیک تھی - ظاہر ہے کہ انگوٹھی کا چھلا بیچ میں سے خالی ہوتا ہے - بادشاہ اُس کی مہارت علم پر بڑا خوش ہوا - اور کہنے لگا " ہاں بالکل ٹھیک ہے - اچھا بتاؤ وہ ہے کیا چیز" - کچھ دیر سوچنے کے بعد کہ آخر ایسی کونسی چیز ہوسکتی ہے جو درمیان میں سے خالی ہو شہزادے نے جواب دیا جناب! مرے خیال میں تو غالباً آپ کی مٹھی میں چکی کا پاٹ ہوگا" - اس عجیب رغریب جواب پر سب اراکین دربار حیران رہ گئے اور اُس کی عقل پر ہنسنے لگے - بادشاہ نے شہزادہ کے اُستاد کی طرف تعجب کی نگاہ سے دیکھا - اُستاد نے دست بستہ عرض کیا کہ "حضور! جہاں تک علم کا تعلق تھا وہاں تک تو میری تعلیم کے مطابق اُس نے ٹھیک جواب دیا مگر آگے علم نہیں بلکہ عقل کی ضرورت ہے - اور یہ میں کہاں سے لاؤں جو اِسے پڑھاؤں - سچی بات تو یہ ہے کہ یک من علم را دہ من عقل باید - بغیر عقل کے علم بالکل بے کار ہے - علم سے اُس نے اتنا تو

بتا دیا کہ مٹھی میں کس قسم کی چیز ہے - مگر اتنی سمجھہ اس میں نہ تھی کہ سوچ سکتا کہ چکی کا پاٹ مٹھی میں کس طرح بند ہوسکتا ہے - تو بس حضور اس میں میرا کیا قصور —

یک نہ شد دو شد

یہ مثل وہاں بولتے ہیں جہاں کسی نئی اور عجیب بات یا واقعہ کے بعد دوسرا ویسا ہی واقعہ ظہور پذیر ہو - اس مثل کے متعلق جو حکایت مشہور ہے بڑی دلچسپ ہے - کہتے ہیں کہ ایک کفن چور کو کوئی ایسا منتر یاد تھا کہ جب وہ کسی تازہ قبر پر جا کر اُسے پڑھتا تو مردہ کفن سمیت باہر نکل آتا - یہ کفن لے لیتا - اور دوسرا منتر پڑھتا - تو مردہ بدستور قبر میں واپس چلا جاتا - اور یہ بازار میں کفن کے کوڑے کرتا - یہی اُس کا ذریعۂ معاش تھا - کسی طرح ایک اور صاحب کو بھی جو بد قسمتی سے تلاش معاش میں سرگرداں تھے - ان حضرت کی اس کرتوت کا پتہ لگ گیا - محنت سے بچنا اور حرام خوری کی عادت کچھہ آج سے نہیں قدیم سے چلی آتی ہے - ان صاحب نے سوچا کہ چلو اس کفن کھسوٹ کی شاگردی اختیار کریں - اگر یہ فن آگیا تو پھر ساری عمر چین ہی چین ہے - کم از کم ایک کفن بھی روز حاصل ہوا تو روٹی کی طرف سے تو بے فکری ہو جائے گی - یہ خیال کرتے ہی آپ فوراً اُس کے پاس پہنچے - اور منت سماجت کے بعد اس کے شاگرد بن گئے - مدتوں اُس کی جوتیاں سیدھی کیں - مگر اُس نے یہ "پاک عمل" اپنے شاگرد رشید کو نہیں

بتایا - جب مرنے لگا تو شاگرد نے کہا اُستاد! اب مرتے ہو اور اُس عمل کو اپنے ساتھ لئے جاتے ہو - ابتو بتا دو - اُستاد نے کچھ سوچ کر وہ عمل بتا دیا - جس سے تازہ مردہ قبر میں سے باہر آجاتا تھا - مگر وہ منتر نہ بتایا جس سے مردہ واپس قبر میں چلا جائے - نہ ہی ان حضرت کو اپنی کامیابی کی خوشی میں اس کے پوچھنے کا کچھ خیال آیا - خیر تھوڑی دیر کے بعد اُستاد کا انتقال ہو گیا - اور شاگرد صاحب عمل کی صداقت آزمانے کو خوشی خوشی قبرستان پہنچے - اور ایک تازہ قبر پر کھڑے ہوکر وہی عمل پڑھا - معاً مردہ قبر میں سے نکل آیا اور کفن ان کے حوالے کیا - انہوں نے کہا - بس بھائی! تیرا شکریہ - جا تو اب واپس جا - لیکن مردہ کھڑا رہا اور ٹس سے مس نہ ہوا - اُس وقت اُن کو خیال آیا کہ اوہو میں اُستاد سے وہ عمل تو پوچھنا بھول ہی گیا - جس سے مردہ دوبارہ واپس قبر میں چلا جاتا ہے - بڑے شش و پنج میں ہوئے اور سوچنے لگے یہ تو بڑی مشکل ہوئی اب کیا کرنا چاہئے - آخر سوچتے سوچتے یہ تدبیر ذہن میں آئی کہ چل کر اُستاد سے پوچھنا چاہئے - واپس ہونے کے لئے مڑے ہی تھے کہ مردہ بھی ساتھ چل پڑا - انہوں نے ہر چند اُسے روکنا چاہا - مگر وہ بھلا کیوں رکنے لگا تھا - آخر یہ اُسی حالت میں اُستاد کی قبر پر پہنچے اور وہی عمل پڑھا - معاً استاد کا مردہ باہر آ گیا - اور کفن اتار کر ان کے حوالے کیا - انہوں نے کہا - استاد! میں کفن لینے نہیں آیا - مشکل میں پھنس گیا ہوں - میری مدد کیجئے - اور اس مصیبت سے نجات دیجئے - مگر استاد صاحب خاموش کھڑے رہے - اور کچھہ جواب نہ دیا اُس وقت شاگرد کی زبان سے یہ جملہ نکلا کہ "یک نہ شد دو شد" یعنی

ایک تو ساتھہ تھا ھی - یہ دوسرا اور گلے پڑا —

— * —

یہ تو بڑی ٹیڑھی کھیر ھے

یہ مثل ایسے کام کے لئے بولا کرتے ھیں جس کے کرنے میں مشکلات اور دقتیں ھوں اور جو آسانی کے ساتھہ بنتا نظر نہ آے - یہ مقولہ سب سے پہلے کس شخص کے منہ سے نکلا اس کے متعلق یہ قصہ ادب کی کتابوں میں لکھا ھوا ھے کہ ایک نابینا فقیر سے جو جنم کا اندھا تھا کسی نے پوچھا کہ بڑے میاں کھیر کھاؤ گے؟ فقیر بیچارے نے کھیر کھانی تو درکنار آج تک اس کا کبھی نام بھی نہیں سنا تھا - کہنے لگا " بابا! کھیر کیسی ھوتی ھے اُس نے جواب دیا " بالکل سفید ھوتی ھے" فقیر کی سمجھہ میں اب بھی خاک نہ آیا - کیونکہ اس نے سفید رنگ بھی کبھی نہیں دیکھا تھا - ناچار کہنے لگا " بابا! میں تو سفید بھی نہیں جانتا کہ کیسا ھوتا ھے؟ ذرا مجھے سمجھاؤ تو سہی - اب اس شخص نے کہا کہ " بڑے میاں! سفید رنگ کو ایسا سمجھو جیسا کہ بگلے کا پر " - بھلا اندھا کیا سمجھتا کہ بگلا کس رنگ کا اور کیسا ھوتا ھے؟ مجبوراً اُس نے پھر پوچھا " میاں! میں تو یہ بھی نہیں جانتا کہ بگلا کیسا ھوتا ھے؟ اب وہ شخص سوچنے لگا کہ میں اسے کس طرح بتاؤں کہ بگلا کیسا ھوتا ھے؟ خیر کچھہ سوچنے کے بعد اس نے اپنے ھاتھہ کو ٹیڑھا کیا اور بگلے کی کچھہ شکل سی بنا کر کہنے لگا کہ دیکھو بگلا ایسا ھوتا ھے "- فقیر نے اس کے ھاتھہ کو خوب اچھی طرح ٹٹول کر دیکھا اور پھر کہنے لگا " بابا! یہ تو بڑی ٹیڑھی کھیر ھے - مجھہ سے تو نہیں کھائی جاے گی " —

— * —

یہ منہ اور مسور کی دال

یہ مثل ایسے موقع پر بولتے ہیں جہاں طنز کے طور پر کسی شخص کے متعلق یہ بات ظاہر کرنی ہو کہ وہ اس کام کے لائق نہیں - یا یہ بات اُس کی طاقت اور ہمت سے بالاتر ہے - مندرجہ ذیل واقعہ ممکن ہے کہ اس مثل کی شاید اصلی وجہ تسمیہ نہ ہو لیکن قصہ چونکہ سچا اور دلچسپ ہے لہذا ہدیہ ناظرین ہے :-

جب اودھ کے شاہی خاندان پر انقلاب آیا اور واجد علی شاہ مٹیا بُرج کلکتہ میں نظر بند کردیے گئے تو محلات کے ہزارہا ملازمین تتر بتر ہوگئے - جس کے جہاں سینگ سمائے چلا گیا - انہی میں ایک شاہی باورچی ملّو میاں نامی بھی تھا - جس کے متعلق صرف یہ خدمت تھی کہ وہ مسور کی دال پکایا کرے اور بس اس خدمت کا معاوضہ اسے سو روپے ماہوار ملتا تھا - خیر بیچارہ باورچی تلاش معاش میں در بدر پھرتا رہا - اور پھرتا پھراتا بٹالہ پہنچا - جو پنجاب ضلع گورداسپور کا مشہور قصبہ ہے - یہاں ایک سیٹھہ صاحب سردار بھاگ سنگھہ نام رہتے تھے - جن کی امارت کے سارے قرب و جوار میں چرچے تھے - باورچی ان کی خدمت میں پیش ہوا اور نوکری کی درخواست کی - سیٹھہ صاحب نے پوچھا بھئی بیٹھہ جاؤ اور بتاؤ کہ تم کون ہو اور کہاں سے آے ہو؟ باورچی نے ساری داستان الم بیان کی اور کہا کہ حضور کا نام سن کر در دولت پر حاضر ہوا ہوں کہ شاید روٹی کا ٹھکانا حضور کی بدولت ہوجاے اور زندگی کے باقی دن اطمینان سے حضور کے زیر سایہ کٹ جائیں —

اگرچہ ملّو میاں تلاش معاش میں لکھنؤ سے نکلے تھے مگر تھے اس شان سے کہ ایک اچھے خاصے رئیس معلوم ہوتے تھے اور کیوں معلوم نہ ہوتے

آخر شاہی باورچی تھے - جسم پر ایک نہایت سفید اچکن - پاؤں میں کامدار جوتا - ایک دوپٹہ کندھے پر پڑا ہوا - ہاتھ میں ایک چھڑی - سیٹھہ صاحب نے اُن کی یہ نوابی شان دیکھی اور مسکرا کو کہا اچھا تو آپ شاہی باورچی ہیں - ملو میاں نے جواب دیا - ہاں حضور برسوں اس سرکار کا نمک کھایا اور عیش اڑایا ہے - اب جس وقت وہ زمانہ یاد آتا ہے تو کلیجہ پر سانپ سا لوٹ جاتا ہے —

سیٹھہ صاحب نے کہا - شاہی مطبخ میں تمہارے سپرد کیا خدمت تھی ؟ ملو میاں نے جواب دیا کہ حضور ! میں صرف مسور کی دال تیار کرنے پر ملازم تھا - اور کوئی خدمت میرے سپرد نہ تھی - سیٹھہ صاحب نے کہا - تب تو مسور کی دال تم نہایت اعلیٰ درجہ کی پکاتے ہوگے - ملو میاں نے جواب دیا - حضور ارشاد فرمائیں تو نموتناً ذرا سی بنا کر دکھاؤں - سیٹھہ صاحب نے کہا " بیشک "! اور یہ کہہ کر ملازم کو آواز دی - اور اسے حکم دیا کہ دیکھو ملو میاں کو جس جس چیز کی ضرورت ہو وہ ان کو لادو - اور باورچی خانہ ان کو بتادو - یہ مسور کی دال تیار کریں گے - اتنا کہہ کر سیٹھہ صاحب اپنے کام میں مصروف ہوگئے - اور ملو میاں اپنے کام میں —

کھانے کا وقت آیا تو دستر خوان پر منجملہ اور چیزوں کے ایک چھوٹی سی طشتری میں ذرا سی مسور کی دال بھی موجود تھی مگر اتنی خوشبو دار کہ سارا دستر خوان مہک رہا تھا - سیٹھہ صاحب نے تو کھانے میں ایسی خوشبو کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھی تھی بہت ہی شوق کے ساتھہ سب سے پہلے اسے ہی کھانا شروع کیا - روٹی کا پہلا ہی نوالہ منہ میں گیا تھا کہ حلق تک معطر ہوگیا - اُن کے وہم میں بھی کبھی

یہ بات نہیں گذری تھی کہ دال بھی اس قدر نفیس اور ایسی لذیذ
ہو سکتی ہے - ملو میاں کی بے حد تعریف کی - سارے کھانوں کو چھوڑ دیا
اور نہایت مزے لے لے کر دال کھانی شروع کی - اور ساتھہ ھی ساتھہ ملو میاں
کی تعریف بھی ہر نوالہ پر کرتے جاتے تھے - جو اس وقت سامنے ھی کھڑے تھے
کھاتے کھاتے کچھہ خیال آیا اور کہنے لگے کہ " ملو میاں! دال تو تم نے
آج ایسی کھلائی ہے کہ عمر بھر کبھی نہیں کھائی تھی - مگر یہ تو بتاؤ
کہ اس طشتری پر لاگت کیا آئی؟ ملو میاں نے بڑی ھی لاپروائی سے
جواب دیا کہ حضور! زیادہ لاگت نہیں لگی - ایک پائی کی دال تھی اور
اُس پر صرف چونتیس روپے خرچ کے آے ھیں - چونتیس روپے کا نام سنتے
ھی سردار بھاگ سنگھہ کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا - اور اُنھوں نے بہت ھی
گھبرا کر کہا "ھیں کیا کہا؟ چونتیس روپے - اس قدر خرچ اور صرف
ایک پائی کی دال پر !! تم نے بھی غضب کر دیا !!!" —

چونتیس روپے کا لفظ ملو میاں کے لئے تو نہایت معمولی تھا کیونکہ
انھوں نے تو وہ سرکار دیکھی تھی جہاں ہزاروں روپے کی بھی کچھہ قیمت
نہیں تھی اور سینکڑوں روپے خرچ کرنے کے بعد بھی کسی نے نہیں پوچھا
کہ کتنا خرچ ہوا؟ انھیں کیا اندازہ ھو سکتا تھا کہ چونتیس روپے کے
لفظ نے بیچارے بھاگ سنگھہ کے ساتھہ کس قدر روح فرسا برتاؤ کیا - اور
صرف دال کی ایک طشتری کی تیاری پر چونتیس روپے کا نام سن کر
اُس کی کیا حالت ھوئی - اندازہ ھونا تو در کنار - وہ تو ان الفاظ
کو بھی برداشت نہیں کرسکے جو سردار صاحب نے بڑی گھبراھٹ میں
کہے تھے - انھیں اس وقت اپنے آپ پر بڑا غصہ آرھا تھا کہ ایک بخیل
اور کنجوس کے ھاں آکر ناحق ذلیل ھوا - نہ اس کو چیز کی قدر ہے

اور نہ اس نے کبھی آنکھہ کھول کر شاهی کھانوں کی بو سونگھی هے - بندر کیا جانے ادرک کا سواد - اور شیخ کیا جانے صابن کا بھاؤ - یہ خیال آنا تھا کہ ملو میاں کو یارائے ضبط باقی نہ رها اور غصہ سے بیتاب هو کر انھوں نے فوراً جیب میں سے چونتیس روپے نکال سیٹھہ صاحب کے آگے پھینک دیے اور کہنے لگے "لو - انھیں پھر تمہارا کلیجہ پھٹا پڑتا تھا - اب تو ٹھنڈک پڑ گئی هو گی - تمہاری حیثیت مسور کی دال کھانے کی هر گز نہیں هے - یہ منہ اور مسور کی دال" —

یہ کہہ کر بغیر جواب کا انتظار کئے هوے ملو میاں سیٹھہ صاحب کے مکان سے فوراً باهر نکل آے - اور پھر کبھی بھول کر بھی اُدهر کا رخ نہیں کیا —



قاضی نذرالاسلام کی تین نظموں کے ترجمے

(قاضی نذرالاسلام بنگال کے پرجوش اور انقلابی شاعر ہیں ان کی شاعری کا خاص رنگ ہے اس کا جوش اور زور ایک تلاطم خیز طوفان کے مشابہ ہے جو بعض اوقات کہیں سے کہیں نکل جاتا ہے - ہندوستان کی کسی زبان میں اس قیامت خیز قوت کا کوئی شاعر نہیں پایا جاتا - اس کے کلام میں ایک آگ بھری ہوئی ہے جس کے سامنے عامیانہ خیالات اور ہماری شاعری کے معمولی مضامین گھاس پھوس معلوم ہوتے ہیں - ہم اختر حسین صاحب رائے پوری' ساهتیہ للنکار' بی اے کے بہت ممنون ہیں کہ انھوں نے اردو خواں اصحاب کے لئے بنگالی زبان سے اُن کی تین نظموں کا ترجمہ عنایت فرمایا ہے - شعر کا ترجمہ کرنا نہایت مشکل کام ہے بلکہ بعض اوقات محال ہوتا ہے - لیکن لایق مترجم نے بڑی کاوش اور خوبی سے ترجمہ کیا ہے جس میں اصل کی بہت کچھ قوت پائی جاتی ہے اور شاعر کا اصل رنگ پھیکا نہیں ہونے پایا ہے —

(اڈیٹر)

صور اسرافیل

تم سب انقلاب کے نعرے بلند کرو تم سب بغاوت کے گیت گاؤ —

دیکھو طوفان اور آندھیوں میں بھی سر نگوں نہ ہوکر وہ دور جدید کا پرچم لہرا رہا ہے —

قیامت کے نشہ میں متوالا ہوکر تباہی و بربادی کو اشاروں پر نچاتا ہوا وہ وحشی آپہنچا اور اس نے سمندر کے سوتوں پر نشتر لگا دیے -

اس کے مہیب اور ڈراونے چہرے پہ موت تبسم بن گئی ہے - عزرائیل

کا محشر انگیز ارادہ اوڑھے اجل سے زیادہ عمیق اندھے کنوں سے سر نکال کر مشعل برق روشن کیے جب وہ قہقہہ لگاتا ہو —

تو تم سب کیوں نہ نعرۂ انقلاب بلند کرو کیوں نہ بغاوت کے گیت گاؤ۔

جب وہ اپنی زلفوں کو پھیلا دیتا ہے تو ان میں سے شر و فساد کی چنگاریاں نکل کر آسمان میں آگ لگا دیتی ہیں —

دمدار ستارہ کی شرر بار نگاہیں اس کے لیے مشعل راہ بن جاتی ہیں۔

دنیا کے دل و جگر سے خون نکال کر وہ اپنی تلوار کو دھوتا ہے جس کی بے پناہ جھنکار سن کر سب خاکی و نوری دم بخود رہ جاتے ہیں —

جب وہ فضا کو خاموشی کے سبق پڑھاتا ہو

تو تم سب کیوں نہ نعرۂ انقلاب بلند کرو کیوں نہ بغاوت کے گیت گاؤ۔

آفتاب سوا نیزے پر آکر اپنی تمام گرمی اس کی دزدیدہ نظروں میں ڈھال دیتا اس کے پریشان بالوں میں فریادیں آ آکر چھپ جائیں گی۔

سمندر خشک ہو ہو کر اس کی آنکھوں کے آنسو بن جائیں گے —

جب خود زمین اس کے کاندھوں کا سہارا لے کر شور قیامت پر گوش بر آواز ہو جائیگی —

تو تم سب کیوں نہ نعرۂ انقلاب بلند کرو کیوں نہ بغاوت کے گیت گاؤ۔

خبردار ! ہوشیار ! اس بار قیامت برف کی سلیں دنیا کے سینہ پر رکھ دے گی —

بوڑھوں اور مردوں کے لیے اس ہنگام حشر میں کہیں جگہ نہیں —

کل جب یہ ہنگامہ فرو ہو جائے گا تو بنت نور بیوہ ہو چکی ہوگی اس کے ماتھے کا سیندور — صبح کی لالی غائب ہو چکی ہوگی - چاند کے ذرات انگارے بن کر صبر و سکون میں آگ لگا دیں گے

پھر کیوں نہ تم نعرۂ انقلاب بلند کرو کیوں نہ بغاوت کے گیت گاؤ -
وہ دیکھو دجال نے اپنا خونیں عصا سنبھالا اور قہر و غضب کے دیوتاؤں
کو آتش و باد کے کفن پہنا دیے —
اور لو برق و رعد نے طوفان اور اندھی نے اپنے ترنم سے آسمان کے
تاروں کو منتشر کر دیا —
اس کی ٹھوکروں سے ستارے ٹکرا ٹکرا کر شہاب ثاقب بن گئے اور آسمان
میں شگاف ڈالنے لگے —

زلزلوں نے کلوں کو یوں اچھال دیا کہ وہ مینار بن گئے —
اور ایسے ہی موقع پر اگر وہ رخش قہر و ستم پر سوار آ جائے
تو تم سب کیوں نہ نعرۂ انقلاب بلند کرو کیوں نہ بغاوت کے گیت گاؤ
مگر شور قیامت سے تو کیوں لرزہ بر اندام ہو رہا ہے ؟
یہ تو ایک نئی دنیا کی آفرینش کا پیغام ہے —
وہ زمانہ آرہا ہے جب کہیں کثافت اور نفرت کا نام نہ رہے گا —
قیامت کی ان بربادیوں کے باوجود جو چیز باقی رہ جائے گی وہ
جمال باری ہے جو از سر نو حسن و رنگینی کی دنیا بسائے گا —
جب ہر شے حسین و رنگین بننے والی ہے —
تو ہم کیوں نہ نعرۂ انقلاب بلند کریں کیوں نہ بغاوت کے گیت گائیں
یہ تو تعمیر و تخریب کا کھیل ہے اس سے خوف و خطر لا حاصل ہے —
دلھنوں سے کہہ دو کہ سہاگ کے گیت گائیں دوشیزاؤں سے کہہ دو کہ
چراغ جلا دیں - اب دنیائے حسن تاریکی و تباہی کا لباس پھینکنے والی ہے -
جب حسن کی تخلیق بھی بربادی کے ہاتھوں ہوتی ہے
تو ہم کیوں نہ نعرۂ انقلاب بلند کریں کیوں نہ بغاوت کے ترانے الاپیں -

پیام شباب

میں اس شباب کے گیت سناتا ہوں —

جو آج تلوار لیے ہوئے اس نا معلوم منزل کی طرف روانہ ہوا ہے

جس کی برباد کن تاریخ میں ماضی کے اوراق گم ہو جائیں گے

جس کی سانسوں کی لپٹ میں دقیانوسی کتابیں جل جائیں گی

جو ان عبادت گاہوں کو تاخت و تاراج کرتا چلتا ہے جنہیں بزدل بوڑھوں نے گناہ و معصیت کا مرکز بنا رکھا ہے —

جس کی زندگی کی روانی میں رسم و رواج کی چٹانیں بہہ جاتی ہیں قدامت کی ہڈیاں چکنا چور ہوجاتی ہیں

جو بلا خوف و خطر فریب و تزویر کی کمندوں کو تار تار کر ڈالتا ہے

جس کی جرأت رندانہ قیمت کی پابندیوں کو ٹھکرا دیتی ہے

جو گور غریباں کے ان پھولوں کو مسل ڈالتا ہے جن کے بہار زندگی آج پھلے ہوتی ہے-

یہاں میں اسی شباب کے گیت سناتا ہوں —

میں ان کے گیت گاتا ہوں

جو چوگان ہستی میں آج سب کے پیش رو ہیں —

صبح تک بھی وہ مسافر ساحل کو نہ پہنچا جس نے اس اندھیری رات کو تلاطم خیز دریا میں اپنی ناؤ ڈال دی تھی —

اسی دیوانہ کی یاد میں میں نالۂ نیم شبی میں مصروف ہوں -

چراغ کی دھندلی روشنی میں بیٹھا میں چاہتا ہوں کہ نیند کی صورت میں وہ آ جائے —

جہان نو کا وہ جویا — منزل ناتمام کا وہ مسافر جو رات کی تاریکی

میں سما گیا تھا، صبح بھی نہ لوٹا۔

جس کے خوف سے موت کا فرشتہ ہمیشہ لرزہ بہ اندام رہتا ہے۔

وہ، جو سمندر کی گہرائی میں، آسمان کی وسعت میں، زندگی کے ہیجان میں، فضا کی ہر سمت میں موت سے نبرد آزما رہتا ہے۔

وہ، جو تحت الثریٰ میں گوہر شب چراغ کی تلاش میں جا پہنچتا ہے۔

وہ، جسے ڈس کر ناگ خود زہر مار ہو جاتے ہیں۔

وہ، جس نے بادل کی بیٹیوں کو کنیز بنا رکھا ہے جو بجلی کو اپنی مٹھی میں پکڑے رکھتا ہے۔

وہ، جس کی فرمان برداری طوفان کیا کرتے ہیں۔

میں اسی کے آستانہ پر سر جھکاتا ہوں اور اسی کے گیت گاتا ہوں۔

میں اس کا ثنا خواں ہوں، اس کا حمد گو ہوں۔

پھانسی کی رسی جس کے گلو گیر ہوتی ہے

جس کے خون سے شفق سرخی حاصل کرتی ہے

قید خانہ میں جس کی خدمت کے لئے آزادی کی دیوی آتی ہے —

میں اسی کے گیت گاتا ہوں —

— * —

یاد ایام

میرے محبوب!

تجھے میں نے پہچانا بھی تو کب —

جب میرا مقصد حیات صرف یہ رہ گیا ہے کہ دھول ناگن کی طرح اپنی آنکھوں میں خاک جھونک کر دن رات ایک خونیں دایرہ میں رقص شرر کرتا پھروں —

اور اب محسوس ہوا کہ میں تو تجھے روز ازل سے جانتا ہوں —
تیرے گلے میں مچلتی اور زبان پرتھرتھراتی ہوئی اس راگنی کو
ان غلافی آنکھوں کو، اس آئینۂ جبیں کو —
اس جان جہاں آرا کو، راج ھنس کو شرمانے والی اس لغزش مستانہ کو۔
ہر ادا کو میں پہچانتا ہوں، ہاں خوب جانتا ہوں -
اسی لئے زندگی کے بے آب اور آتشیں سر چشمہ میں تیرتی ہوئی یہ
جان حزیں پیہم تجھے پکار اٹھتی ہے -
مری فریاد کی صرف ایک لے ہے - میں تجھے جانتا ہوں میں
تجھے پہچانتا ہوں -
نہ تو اقلیم محبت کی ملکہ تھی نہ گداگر - تو پریم مندر کی جوگن
اور پجارن تھی اور بس -
مجھ سنگ دل پر تو نے کس کس طرح عشق کے نقش بنائے تھے -
خود کو جلا کر میرے سیہ خانۂ دل میں محبت کی لو بھڑکائی تھی -
اپنی پوجا کے پھولوں سے اس بے برگ و ثمر پیڑ کو ہرا بھرا کر دیا تھا -
زندگی کی صبح و شام میں اور حیات و ممات کی الجھنوں میں
میں نے تجھے دیکھا ہے -
مگر تو مجھ سے جدا ہوگئی ہے - ایک اجنبی دیس میں مجھے بیچارگی
و تنہائی کے عالم میں چھوڑ کر تو رخصت ہوچکی ہے —



جب شفق آفتاب سے محروم آسمان کے خون تمنا کو نمایاں کرتی ہے،
تو میرے آنسو بھولے ہوئے افسانوں کو از سر نو زندہ کرتے ہیں -
وہ دن یاد آتا ہے —— جب بہار خزاں کی طرف حسرت و یاس

سے تک رہی تھی - اور وہ رنگینیوں میں شرابور مبارک رات میرے گھر آئی تھی جب میری آنکھیں تیرے چھلکتے ہوے پیمانوں میں ڈوب گئی تھیں - اس وقت میں جوانی کے در پر ٹھٹکا ہوا کھڑا تھا - لڑکپن کی نیم باز آنکھیں شباب کے فتنے جگا رہی تھیں - جوانی کی حرماں نصیبی شفق کی لالی کی طرح اپنا رنگ رچ رہی تھی - دور سے آتی ہوئی نغمہ کی صدا میں ڈوب جانے والی ہنسی کی طرح جوانی کی سرمستیوں میں میری معصومیت معدوم ہو رہی تھی —

گم کردہ راہ باد سموم کی مانند میں راہ بھٹک کرکس پردیس میں آپھنسا - اب میں ہوں اور وہ اشک ہاے درد آشنا جو کسی غریب الوطن کے غم گسار ہوتے ہیں -

صبح سویرے جب میں نیند سے بیدار ہوا تو تو میری طرف دیکھہ کر کس دلسوز انداز میں مسکرائی تھی -

اور اس تبسم میں میرے آنسوؤں نے چمک کر پوچھا تھا کہ تیرا آشیانہ کہاں ہے؟ کس نے تجھے اسیر بنا رکھا ہے؟ -

تیری نگاہیں کتنی نازک تھیں - میں تو سمجھا کہ میرے نغمۂ فراق میں تو ہی سوز و گداز بن کر اتر آئی ہے -

جیسے باد بہار کی نغیر سے کلیاں چٹک جاتی ہیں اور ہرنیاں راہ بھول جاتی ہیں -

پھر آدھی رات آئی اور تو رخصت ہونے لگی تو میں نے وہ ترانہ الاپا جس کے سرگم آنسوؤں میں گندھے ہوے تھے اور جس میں میری بے قراری مچل رہی تھی - کیہہ نہیں سکتا کہ ان گیتوں کی روشنی میں میں کیسے اپنے خانۂ دل میں تلاش کر رہا تھا —— وہ دل جس میں ہمیشہ تاریکی

اور ویرانی چھائی رہتی تھی —

اتنا یاد ہے کہ کچی نیند سے جاگی ہوئی تیری مخمور چشم کے گلابی ڈوروں میں میری پلکیں جھپک رہی تھیں —

یہ بھی یاد ہے کہ ان پلکوں میں حیرت و مسرت نے نمی پیدا کر دی تھی گویا یہ درد فرقت کی گھلاوٹ تھی —

جب تو میرے حال زار پر ترس کھاکر کانپ اٹھتی تو محسوس ہوتا کہ لیلائے شب نے کسی کا سوگ لیا ہے —

جان جاں! تیری آنکھوں میں محبت اور ہمدردی نے جو جوت جگائی تھی اس میں میری پیاسی آنکھیں کتنی پیاری معلوم ہو رہی تھیں —

جب میں نے ہنسی ہنسی میں تجھے پکارا تھا تو نہ معلوم کیوں تیرے غرور عشق کو ٹھیس لگی اور آنکھوں کی کشتی جذبات کے تلاطم میں بہہ نکلی۔

اور ساحل رخسار دم بھر میں آب آلودہ ہوگیا

میری پجارن بتلا تو سہی ایک ذراسی چھیڑ اور یہ محشر جذبات؟ میری خاطر یہ عز و ناز کیوں کہ تیرا کملایا ہوا چہرہ فرط شرم سے اور ننھا سا دل وارفتگیِ شوق سے تصویر درد بن گیا —

میری آواز کو سنتے ہی تیرے آنسو ان خواب آگیں دریچوں سے کیوں جھانکنے لگے؟

میں اس نامعلوم راستہ کا اجنبی مسافر تھا۔ تیری معصوم آنکھیں میری جدائی کے صدمے سے کیوں اشک فشاں ہوگئیں؟

مجھے دیکھ کر تو سب لوگ ہنسا کرتے تھے —

بد دعاؤں کے اثر سے میری سانس اتنی گرم ہوگئی تھی کہ اس سے آشیانے جل کر خس و خاشاک ہو جاتے تھے —

میری مسکراہٹ کو سانپ کا من سمجھ کر لوگ جب اٹھانا چاہتے
تو وہ زہر آموز پھن بن کر انھیں ڈس لیتی تھی —
دنیا جس سے ڈر کر گھبرا کر دور بھاگتی تھی اس بد بخت کو تو نے
کیوں گلے کا ہار بنا لیا —
اور پھر اسی وحشت زدہ کے لئے تو کیوں سینہ فگار ہو رہی ہے —
کیا تجھے اور کوئی پیار نہیں کرتا؟ اور کوئی تیرا ناز بردار نہیں
بنتا؟ کیا تو اوائل زندگی سے جوگن ہے؟
یہی ہے ورنہ آنسوؤں کا یہ دریا اور کسی کو کب میسر!......
نہیں یہ نہیں ہے دل کے اندر سے کوئی کہتا ہے کہ یہ نہیں ہو سکتا۔
بارہا طالبان دید کو محروم تماشہ دیکھا ہے۔ پھر بھی تو تشنۂ محبت
تھی اور تشنہ محبت رہی —
مگر صرف مجھے ہی شراب عشق سے سرشار کرنے کے لئے تو کیوں بضد تھی؟
میری رانی یہ راز نہ تجھے معلوم ہے اور نہ مجھے، صرف عشق کو
اور دل کو اس بھید کا پتا ہو سکتا ہے کہ یاس و حسرت بلا سبب رگ
رگ میں کس طرح ساری ہو گئے ہیں —
تجھے نہ جانتے ہوئے بھی اس روز محسوس ہوا کہ میں تجھے ہمیشہ
سے پہچانتا آیا ہوں —
تو وہ 'لیلا' ہے جو جنگل میں بھٹکنے کے لئے اکیلی چھوڑ دی گئی تھی۔
تو وہ ہے جس کی آرتی کی تھالی ہمیشہ ٹھکرا دی گئی
جس کی مالا ہمیشہ ہنسی ہنسی میں مسل دی گئی
تو وہ دیوی ہے جسے دنیا میں رہنے کی بد دعا دی گئی تھی۔ تو
خاموشی سے ان کلفتوں کو برداشت کرتی رہی —

پہلی ہی نظر میں تو سمجھ گئی کہ تو مجسمۂ شباب ہے اور میں شعر مجسم -



پھر —— پچھلے پہر میری روح تیرے نغموں میں مرتعش ہوئی تھی — ان گیتوں میں جو لاج کے مارے تھرا رہے تھے —

نہ جانے کیوں ان الفاظ کے معانی میرے لئے صرف اس جملہ میں سمٹ آے تھے — تو مجھے جانتا ہے روز ازل سے پہچانتا ہے —

متھرا پہنچ کر جب شیام' رادھا کو بھول گیا تو شاید وہ اس کی یاد میں بھی گیت گنگنایا کرتی تھی —

نل جب دمن کو جنگل میں تنہا چھوڑ کر چلا آیا تھا تو شاید وہ بھی انہیں منتشر انگیز سروں میں اس کی یاد کیا کرتی تھی ——

جنگلی پھولوں کے ہار گوندھتے ہوے جب سکنتلا کو پیتم یاد آتا تھا تو وہ بھی یہی یاس آفریں گیت گایا کرتی تھی —

پہاڑوں اور بیابانوں کی خاک چھانتے ہوے مہادیو کی یاد میں گوری نے یہی نغمہ چھیڑا تھا -

ہاں مجھے سب کچھ یاد ہے —

لیکن اس وقت شباب محو خواب تھا' تجھے دل نشیں نہ کر سکا - صرف تیری نغمہ آفرینی کو روح میں بسا کر میں دور دراز کے سفر پر چلا گیا -

دوسرے ہی دن گومتی کے نشاط افزا کناروں پر دل میں چھپی ہوئی تیری یاد نے مجھے وطن کے اس آہو کی طرح تڑپا دیا جو اپنے سینہ میں نافۂ مشک رکھ کر اس کی تلاش اپنے آس پاس کرتا ہے -

میں ڈھونڈتا پھرا کہ کس کی یاد مجھے یوں محروم قرار رکھتی ہے یہاں تک کہ میرے واویلوں نے زمین و آسمان کو فراق آشنا بنا دیا -

پھول پتیاں ' ندی اور پہاڑ سب میرے هم زبان هو کر بهاگ کے گیت گانے لگے -

ساتھ هی میرا هیتا نصیب آتش شباب میں تپ کر میرے دل کی گہرائیوں میں پیاس سے بیتاب هواتها -

یه جان حزیں جو منزل مقصود سے ناآشنا تهی چیخ چیخ اتھی که کون سا هے وہ دیس جهاں پیار کا مول لگتا هے ؟-

زندگی اُداس سی رهتی تهی ' دل ڈوبا ڈوبا سا رهتا تها -

میں سوچتا تها که جوانی کا زمانه ایک طویل آہ کے سوا کچهه نہیں -

آنکهوں کے آگے همیشه دهوپ چهانو کے پردے سے لٹکے رهتے تهے -

یه نکهت بهار کهاں سے آآکر میری روح میں سمائی جا رهی تهی -

میرا دل آهوے رمیدہ کی طرح آپ اپنے سینه میں پوشیدہ مشک کی تلاش میں حیران و سر گرداں تها —

یه خودی کا عشق کتنا عجیب و غریب تها ! اپنی محبت سے اپنی تمنا کی خلش مٹانے کی کوشش کتنی حسرتناک تهی - میری جوانی کی تشنه لبی کی انتہا نہیں - محبت کے دریا اوس کی بوندوں کے مانند اس کے هونٹوں تک آتے آتے خشک هو جاتے هیں - الهی ! اس پیاس کی کوئی حد بهی هے !

کیسے بجهے ؟ یه پیاس کیسے بجهے ؟ کهاں هے وہ ناپید اکنار دریاے عشق جو اس آگ کو تهنڈا کردے -

مجهه لاابالی رند لم یزل کی تشنگی کو کون بجها سکتا هے !-

وہ کهاں هے جسے کهوکر یه ساری دنیا میرے لئے هیچ هے جهاں سکون میرے لئے حرام هوگیا هے —

کچهه دور اور چل کر دیکهوں- اس راسته سے کئی مستانه خرام دو شیزائیں

گڈرتی ہیں - ان کے پیچھے یہ پریم پیا سا دل اندھوں کی طرح دوڑنے لگتا ہے اور اگر کوئی ایک نگاہ غلط انداز ڈال جاتی ہے تو خود داری کے احساس سے آنکھیں ڈبڈبا جاتی ہیں —

یہ دیکھ کر وہ مجھ پر ہنستی ہوئی چلی جاتی ہے - کوئی دروازے پر آکر پوچھتی ہے 'بھیک لے گا'؟

یہ سن کر دلِ بے مایہ رو رو اٹھتا ہے - درد و غرور سے میرے قیامت خیز جذبات میں آگ سی لگ جاتی ہے -

اور جب وہ چنچل لڑکی لجائی چتونوں سے بھیک کا پیالہ میری طرف بڑھاتی ہے تو میں اسے ٹھکرا دیتا ہوں -

وہ روتی ہوئی بھاگ جاتی ہے اور خوف کے مارے کوئی میرے پاس نہیں آتا -

'گوتم' کی طرح یہ جان عزیز کشکول گدائی لئے محبت کی بھیک مانگنے در در صدا لگاتی پھرتی ہے -

میری آواز سن کر کتنے آتے ہیں کتنے حیرت و تردد لے کر لوٹ جاتے ہیں -

کسی کے دل میں ٹھیس لگتی ہے' کسی کی آنکھیں چھلک جاتی ہیں -

میں بھیک میں مایۂ حیات مانگتا ہوں پھر بھلا یہ دنیا دار میرے سوال کو کیسے سمجھ سکتے ہیں —

پہلے تو وہ تمسخر اڑاتے ہیں اور پھر خود بھی پشیمان ہو کر روتے ہوئے لوٹ جاتے ہیں —

پوچھتے ہیں کہ مسافر کہہ تو سہی تو چاہتا کیا ہے؟ تیری آواز میں یہ سوز کیوں ہے؟ تیری آواز میں کس کی آتش تمنا سلگ رہی ہے!

کسی کی سمجھ میں نہیں آتا - کوئی تن من لاتا ہے' کوئی متاع حسن' کوئی دولت جمال —

کوئی مغرور راجکماری دولت کے نشہ میں چور ہوکر مجھ پر جوانی کے منتر پھونکتی ہے —

مگر ان سب کی طرف میں آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا - مایوس ہوکر میں بادیہ پیمائی میں مصروف ہوجاتا ہوں —

آہ! مری وہ پجارن کہاں ہے جوکہے کہ مرے مالک میں تیری خاطر جوگن بنی تھی - کیا تو مجھے پیار نہ کریگا؟ میرے پاس محبت کے سوا کچھ نہیں "کیا تو اس تحفہ کو قبول نہ کریگا!' —

اس ریگستان میں آبلہ پائی سے کیا حاصل جہاں یہ پیاس شدید تر ہوجاتی ہے —

سراب صحرا بن کر کوئی آنکھوں کے آگے آتا اور پھر اوجھل ہو جاتا ہے - صرف یہ ندا جرس کارواں بن کر کانوں میں آتی ہے —

'میرے مالک نہیں بھیک نہیں تجھے چاہتی ہوں - میں تجھے جانتی ہوں اور تو مجھے پہچانتا ہے -

میں سمجھ نہ سکا کہ یہ میری ہی صداے بازگشت ہے - نہ یہ دریا ہے اور نہ ساحل - یہ سراب صحرا کے سوا کچھ نہیں —

*

میں جب تیری نگری میں آیا تو میری زندگی خون آلودہ اور کانٹوں سے چھدی ہوئی تھی -

اس وقت تک مجھے خبر نہ تھی کہ میری چبھن تیرے سینہ میں پیوست ہوکر کسک بن جاتی ہے

تاہم محسوس ہوتا تھا کہ تیری مخمور کن قرابت میرے تمام مصائب کو دور کردے گی —

ہمدم ! معلوم ہوتا تھا کہ میرے دل میں تیری یہ فریاد تڑپ رہی ہے - ' مسافر ' یہ کانٹا مجھے نکالنے دے - بھلا تو سہی کہ درد کہاں ہے اور کیوں ہے ؟

بے زبانی تیری زبان تھی ' خاموشی تیری گویائی تھی ' آہ تیرا نغمہ تھی - اسی لئے یہ دل تنگ سب سن کر بھی نہ سمجھ سکا کہ اس التجا میں ناکام محبت داد طلب ہے —

اس کشمکش کے عالم میں جب اندھیری رات موسلا دھار بارش میں نہا رہی تھی ' نہ جانے کہاں سے میری ماں آئی اور مجھے گود میں اٹھا کر ان روتی ہوئی آنکھوں کو بار بار چوم لیا —

پھر نہ وہ بے راہ روی رہی نہ وہ شورش طلبی - اس کے بوسوں نے آتش غم کو سرد کر دیا - ناکامی کی تیرگی میں ماں کی مامتا جگنو کی طرح جگمگا اٹھی —

ایک عرصۂ دراز کے بعد وہ آشفتہ مزاج خانہ زاد آوارہ گردی سے تھک کر گھر لوٹ آیا - اور اسے سکون ملا تو ماں کی شفقت میں —

اس کے آوارہ ترانوں کی گونج شفقت مادری کی تیز ہواؤں میں گم ہوگئی -

---

مگر ایک بار اور میں اپنے راستہ سے بھٹکا :-

جب یہ معلوم ہوا کہ ایک شوخ حسینہ میرے در کی زنجیر کھٹکھٹا رہی ہے تو مجھے یاد نہ رہا کہ اب تک میں کس کی تلاش میں کھویا ہوا تھا یہ بھی بھول گیا کہ میں کس پوجا کے پھولوں کا طلبگار تھا - حسرت و یاس کا پتہ نہ رہا —

گویا شادیٔ مرگ سے دل کے بند بند کھل گئے ' بے اشک آنکھیں

پھر آنسوؤں سے چمک اٹھیں - کسی کی عطر بیزی سے روح مہک اٹھی -

فراق و وصل کی ہنگامہ خیزیوں میں زندگی ' بھنور میں پڑی ہوئی کشتی کی طرح ڈگمگا نے لگی —

ایک بار بچ کر یہ گل دیدہ بلبل پھر دام صیاد میں آ پھنسا ...

مندر کی مورت میرے خون میں ڈوب گئی تو بھی وہ پتھر کی مورت بیحس ہی رہی —

یوں ذلیل ہوکر غرور عشق انتقام کی آگ میں کود پڑا اور میں اشہب بغاوت پر سوار ہوکر بادلوں کو چھوتا اور نعرے لگاتا ہوا اس خدائے قہار کی طرف جھپٹ پڑا جو سارے مصایب وآلام کا خالق ہے - نقیب قیامت ستارۂ تخریب بن کر میں نے اس عالم صحرائی میں جو آب محبت سے یکسر خالی ہے خون اور آگ کے دریا بہادیے —

لیکن یہ فریب ہستی ! میرے محبوب ! بیچ بیچ میں محسوس ہوتا تھا کہ تیری بانسری کہیں دور میرے نام کی رٹ لگائے ہوے ہے -

اس نامعلوم دور افتادہ منزل کی طرف دیکھتے ہوے ان آنکھوں میں دردمندی کے آنسو تیرنے لگتے تھے جن کی پلکیں خون آلودہ تھیں -

مجھے یقین ہوگیا کہ ایک تو ہی جنگل کی وہ شہزادی ہے جو میرے لئے پھول چنا کرتی ہے اور بڑے جتن سے ایک ہار بنا کر اپنے پاس رکھہ چھوڑتی ہے - میری بھکارن ! معلوم نہیں شرم وحیا کے پھولوں میں کتنی مدت سے تیری محبت کا سدا بہار پھول کھلا ہوا ہے -

دل کے اندر موجیں مارتا ہوا دریاے اندوہ کھلکھلا کر کہتا ہے - "پہچان گیا - جسم مردہ میں پھر سے جان پڑ گئی - یہ آواز تو اس کی ہے جس کے بغیر اس وسیع دنیا میں تجھے کہیں سکون میسر نہ تھا -

مگر ساتھہ ساتھہ نالہ و شیون کی یہ روح فرسا صدائیں کیسی ؟ -
جیسے کوئی پیچھے سے پکار کر کہتا ہو دوست ! ابھی وقت نہیں آیا -
تو بھی میں نے سنی ان سنی کردی - چشم زدن میں بجلیوں پر بیٹھہ کر
تیری رگ جاں سے بھی قریب آ گیا —
نہ معلوم وہ راہ فنا ' وہ خونیں پرچم ' وہ آتشیں رتھہ کیا ہوے - اتنا
یاد ہے کہ تیرے آغوش میں سکون و اطمینان کے پھول بکھرے ہوے تھے -

---

اس کے بعد میں جو کہنا چاہتا ہوں اس کے لئے الفاظ نہیں ملتے -
اب نہ دل میں دھڑکن باقی ہے نہ آنکھوں میں آنسو اور نہ امید میں تقویت -
اب جو کچھہ کہوں گا وہ گیت نہ ہوگا - یہ وہ نوحہ ہے جسے خون دل
ناکامی کی زبان میں بیان کر رہا ہے —
تم سوچتی ہوگی کہ اس کنگال کی بے حیائی کی بھی کچھہ انتہا
ہے کہ شرف و عزت کا متمنی رہتا ہے —
دراصل یہ حقیقت کتنی حیرت انگیز ہے ! اب میں بھی ان باتوں
کے تصور سے ہنس دیتا ہوں —
مگر میرے محبوب نہ بھول کہ در در کی خاک چھان کو میں
تھکا ہارا تیرے پاس آیا تھا - سچے پیار کی جو تھوڑی بہت کائنات
رہ گئی تھی اس کا ہدیہ میں نے ڈرتے ڈرتے تیرے سامنے پیش کیا تھا -
اے ستمگر ! کس ذوق و شوق سے میں نے اپنی کم مائیگی کے احساس
کے باوجود تیری پوجا کے سامان کئے تھے —
سوچا تھا کہ جس بار کو یہ ہوسناک دنیا نہ اُٹھا سکی اسے تو خوشی
سے سنبھال لیگی - اس ازلی باغی کو تو پابند محبت بنالیگی - سوچا

تھا کہ اس سرکش و خود سر پر فتح پاکر تیرا عشق روشن ہوجاے گا۔
بعد ازاں میرے ناتواں بازوؤں میں تیرا خلوص وہ زور پیدا کردے گا
کہ میں نعرۂ بغاوت بن جاؤں گا اور تو بغاوت کی بجلی ـــ
دل میں یہ آرزو تھی اور اس کی تکمیل کی یہاں تک جرأت
تھی کہ میں دنیا کی ساری رنگینیوں کو تجھہ پر نثار کرسکتا تھا۔
لیکن آہ ! نہ وہ تو ہے نہ وہ ولولے نہ وہ خلش و تپش !
یکایک تو زمانہ کی طرح بدل گئی۔ عجب کہ تو بھی مکر و فریب
کے دام میرے لیے بچھانے لگی ـــ
میرا سینہ ہمیشہ حقیقت سے منور رہتا ہے۔ اس کی دور بین نگاہیں
خون کی ایک ایک بوند کو پرکھہ سکتی ہیں ـــ
تیری پوجا کو جس لالچ نے آج گناہ آلودہ کردیا کیا، وہ مجھہ
سے چھپی ہوئی ہے؟ آج تو اسے بھولنے کی کوشش کر رہی ہے کل تک تونے
دل و جان جس کے سپرد کر رکھا تھا ـــ
میں حیران ہوں کہ تیرے شفاف دل پر گناہ کی لکیر کس نے
کھینچ دی۔ کیا یہ ممکن ہے کہ تو بھی فریب دنیا سیکھہ جاے ـــ
اگر یہ سچ ہے تو کون فریب خوردہ نہیں کیوں نہ اس جھوتی دنیا
میں آگ لگا دی جاے ! ـــ
میں اور تو، چاند اور سورج، ارض و سما سب فریب زندگی کے شکار ہیں۔
جلا دے اے پیدا دگر اس جھوتی دنیا کو اپنی عشوہ طرازی سے جھلسا دے

ـــ * ـــ

آج جو میں تیری طرف نظر اتھاتا ہوں تو خود داری بجلی بن
بن کر دل کے آسمان میں کوندنے لگتی ہے ۔ تیری بیوفائی اور اپنی

بےحیائی کا احساس سوہان روح بن جاتا ہے - جی چاہتا ہے کہ زمین شق ہوجائے اور اپنی اس حسرت نصیب اولاد کو اپنے دامن میں سمیٹ لے

جب کبھی امید کی ایک آدھ کرن چمکتی ہے تو اس کی طرف دیکھتے ہی سارے حوصلے پست پڑ جاتے ہیں —

ہائے! کہاں ہے وہ پجارن، وہ جوگن - کیا یہی بےدرد، تند خو وہ پیکر عصمت ہے؟

میری زندگی کو اس نے کھلونا کیوں سمجھ لیا؟ میرے ارمانوں کو اس کج ادائی سے وہ کیوں کچل رہی ہے؟

ان بتوں کے آگے وفا شعاری کی کوئی قیمت نہیں - عورت کی ہوس کی انتہا نہیں - ایک کی پرستش اسے مطمئن نہیں کر سکتی - وہ ہمیشہ بہت سے چاہنے والوں کی جویا رہتی ہے - جس کے لیے میں خدا کی عبادت سے منحرف ہوگیا آج وہی یوں مجھے قعر مذلت میں گرا رہی ہے-

—— * ——

معلوم ہوتا ہے کہ اب میں اپنی منزل کو پہچان گیا - کیوں نہ اب میں موت در آغوش طوفان کا ہم سفر بن جاؤں - راستوں میں کس کی یاد میں میں فریاد کرتا پھروں؟ —

کیوں نہ اس بار آتش فشاں پہاڑ اپنے غارت گر دہانے کھول دیں؟ کیوں نہ میری گرم گفتاری بغاوت کے جھلتے لہرا دے اور موت کے فرشتے میرے ہم سخن بن جائیں؟ —

لے آؤ اپنے آتشیں رتھ اور پھونک دو ہنگام قیامت کے صور - نکالو زہر و آتش میں بجھے ہوئے تیر - برباد کردو اس دنیائے معصیت کو - ٹپکا دو یہ خونیں شراب عزرائیل کے گلے میں - تہ و بالا کردو اس عصیاں

کدہ کو اپنی ٹھوکروں سے ! —



در آں حالیکہ دل صد چاک میں غضب کی جلن ہے ' تو بھی او ظالم!
مجھے خوب یاد ہے کہ جب تک میں تجھے قابل اعتنا نہ سمجھتا تھا '
جب تک میں محبت کی ابلہ فریبیوں سے ناواقف تھا تب تک تو حریم
محبت کی گداگر تھی۔ میری بے التفاتی تیرے نازک احساسات کا افسانہ
آنسوؤں سے لکھا کرتی تھی - سہاگ کے دو چار تنکے چلنے کے لئے تو کس
طرح میرے آستانہ کی جبیں سائی کرتی تھی --

میں تیری نظر فریبیوں سے بچا رہا آج کیا تو اسی کا انتقام لے رہی ہے-

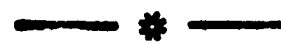
اب میں موت سے ہم آغوش ہوکر سسک رہا ہوں - بیدرد ! کیا میرا
دل اسی لئے تھا کہ یوں چور چور کر دیا جائے-

اس کرم کی نگاہ کے بعد اس کور چشمی کو میں کیوں کر برداشت کرسکتا ہوں-

عورت! اگر مرد تیرے جذبات کی یوں تحقیر کرتا تو تو اسے کیا
کیا دشنام نہ دیتی ؟ —

سوچتا ہوں کہ کیا ہر معصوم دوشیزہ کا بوسہ ایسا ہی ہوتا ہے کہ
دل میں داغ بن کر رہ جائے -

نہیں ' یہ نہیں ہے - نسیم کلی کے دل کو گدگدا کر پھول کھلاتی ہے مگر صرف
بھونرے کو معلوم ہوتا ہے کہ کیوں کر پھول کا دل چاک کیا جاتا ہے —



جب بہار کا چل چلاؤ تھا میں آہستہ خرام باد بہاری کے ساتھ
اُس دیس کو چل دیا ' جہاں نہ حیات ہے نہ موت ' ہمیشہ اندھیری
رات کا سایہ رہتا ہے -

اس دن کو یاد کرکے آج بھی میں لبریز مسرت ہو جاتا ہوں' جب میں الوداع کہہ رہا تھا اور آنکھیں فرط انبساط سے رونے لگی تھیں -

میں جب تجھے پیار نہ کر سکا تھا' تو نے ہی پہلے پہل میرے ہونٹوں سے پریم پیالہ لگایا تھا -

اب تک میرا بے تاب آغوش اُن حیات آفریں سانسوں کی لپٹ کو محسوس کرتا ہے جو دوشیزگی کی دنیا سے چلی تھیں -

اخلاص و محبت کی اُن رنگینیوں سے یہ زندگی چمک اُٹھی' اس حد تک کہ اب میں موت میں کوئی تلخی محسوس نہیں کرتا -

جب اپنی موت در کنار ہونٹوں پر تیرے حسین و جمیل بوسوں کی لرزش محسوس کرتا ہوں تو جی چاہتا ہے کہ تیرے نام کو ہزار بوسے دوں —

—— * ——

میرے محبوب! ایک آرزو یہی ہے کہ جب کبھی جوانی کی راتیں کسی دوسرے کے لئے راحت کا پیام لے کر آئیں اور تو اپنے فرقت زدہ دل میں کھٹک سی پائے - تو کوئی تجھے بتلا دے کہ وہ دکھیارا اب اس دنیا سے سدھار گیا —

کبھی یہ نہ ہوگا کہ تیرے بوسہ کی گرمی کا تصور اسے ندی نالوں کو پار کراتا یہاں تک لے آے گا -

وہ رشک و حسد کا پتلا' وہ غرض و نفس کا بندہ تو مر گیا -

اور لازوال بنا گیا اسے جو جدائی اور ناکامی میں محبت کا راز داں ہو کر شاعر بن گیا! —

—— * ——

*

ٹیگور کے ادبی مضامین

حیات شاعر

مترجمہ

(جناب پنڈت ونشی دھر صاحب ودیا النکار)

ٹینیسن شاعر کے لڑکے نے اپنے مرحوم باپ کے خطوط اور سوانح حیات کو دو ضخیم جلدوں میں شائع کیا ہے —

قدیم شعرا کی زندگی کے مفصل حالات تلاش و جستجو کے باوجود بھی نہیں ملتے - اس وقت لوگوں کو سوانح عمری لکھنے کا شوق نہیں تھا - اس کے علاوہ اس زمانے میں بڑے اور چھوٹے سبھی (اس زمانے کا لحاظ کرتے ہوئے) گمنامی کی حالت میں رہتے تھے - خطوط، اخبارات، مجلسیں، انجمنیں اور ادبی مباحثے اس قدر زیادہ نہیں تھے اس لئے غیر معمولی دل ودماغ رکھنے والے اشخاص کی زندگی کے حالات کو مختلف پہلوؤں سے مطالعہ کرنے کا موقع نہیں ملتا تھا —

بہت سے گشت کرنے والوں نے بڑے بڑے دریاؤں کے سرچشموں کی تلاش میں دشوار گزار راستے طے کئے ہیں - شاعری کے بڑے بڑے دریاؤں کے سرچشموں کا کھوج نکالنے کے لئے طبیعت میں ایک خواہش ہوتی ہے، امید ہے کہ موجودہ شاعروں کی سوانح حیات ہماری اس خواہش کو

پورا کر دے گی - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ معاشرے میں شاعر کے چھپے رہنے کے لئے اب کوئی جگہ نہیں رہی ہے - جس بلندی سے شاعری کا سرچشمہ نکلتا ہے وہاں تک ریل گاڑی جاری ہے —

اسی امید میں میں نے بڑے شوق سے کتاب کی دو ضخیم جلدوں کا مطالعہ کیا - لیکن شاعری کا سرچشمہ کس جگہ سے پھوٹ نکلا ' باوجود تلاش کے اس کا پتا نہ لگ سکا - یہ کتابیں ٹینیسن کے حالات زندگی کہی جا سکتی ہیں لیکن شاعر کی زندگی نہیں کہلا سکتیں - ہم اس کتاب کے ذریعے یہ نہ سمجھ سکے کہ شاعر کب انسانی دل کے سمندر میں جال ڈال کر اتنے علوم و جذبات باہر نکال لایا ' اور کہاں بیٹھ کر اس نے ایسے عالمگیر نغمہ کے سروں کو اپنی بانسری پر مشق کر کے بجایا —

شاعر نے جس طرح اپنی شاعری کی تخلیق کی اس طرح اپنی زندگی نہیں بنائی ' کیونکہ اس کی زندگی شاعری نہیں ہے جو میدان عمل کے مرد ہوتے ہیں وہ اپنی زندگی بھی بناتے ہیں جس طرح شاعر زبان کی دشواریوں میں سے شعر کی بحر کو پیدا کر لیتے ہیں - معمولی جذبے کو غیر معمولی جوش اور چھوٹی سی بات کو بڑے معنی دے دیتے ہیں اسی طرح میدان عمل کے مرد دنیا کی دشواریوں کے بیچ میں سے اپنی زندگی کی بحر بنا لیتے ہیں اور اپنے اطراف کی حقیر چیزوں کو بے مثل طاقت کے برتے پر اعلیٰ بنا دیتے ہیں - وہ اپنے پاس جن معمولی چیزوں کو پاتے ہیں انہیں کے ذریعے اپنی زندگی کو اور خود ان چیزوں کو بھی بڑا بنا دیتے ہیں - اُن کی زندگی کا مشغلہ ہی اُن کی شاعری ہے ' اس لئے انسان اِن کی زندگی کو نظر انداز نہیں کر سکتا —

لیکن شاعر کی زندگی سے انسان کو کیا فائدہ ہے ؟ اس میں کونسی

دوامی چیز ہے؟ شاعر کی زندگی کو اس کے نام کے ساتھ ملاکر بڑا بنانے سے چھوٹے کو بڑی جگہ بٹھاکر شرمندہ کرنا ہے - سوانح عمری بڑے لوگوں کی ہوتی ہے اور شاعری بڑے شاعروں کی —

بعض غیر معمولی ذہانت والے اشخاص شاعری اور زندگی کے کام دونوں میں اپنی ذہانت کو ترقی دے سکتے ہیں - شاعری اور کام دونوں ان کی ایک ہی ذہانت کے نتائج ہوتے ہیں - شاعری اور ان اشخاص کی زندگی کو اگر ہم ایک جا کرکے دیکھیں تو اس کے معنی وسیع تر اور جذبات زیادہ گہرے ہو جاتے ہیں۔ دانتے (Dante) کی شاعری میں دانتے کی سوانح عمری شامل ہے - اگر ہم دونوں کو یک جا کر کے پڑھیں تو اس کی زندگی اور اس کے کام کے حدود اچھی طرح نظر آتے ہیں —

ٹینیسن کی زندگی اس قسم کی نہیں ہے - وہ ایک شریف آدمی کی زندگی ضرور ہے لیکن اس کا کوئی بھی پہلو قابل تعریف اور مختلف النوع نتائج کا حامل نہیں ہے' وہ اس کی شاعری کا ہم وزن نہیں ہے لیکن اس کی شاعری کے جس پہلو میں تنگ خیالی ہے اور عالمگیر وسعت کا فقدان ہے' اس میں آج کل کے ولایتی تمدن کی دوکانوں اور کارخانوں کی تازہ بو کچھہ زیادہ مقدار میں ہے - اس کی زندگی میں ان پہلوؤں کا عکس تو پایا جاتا ہے لیکن جس پہلو میں وہ وسیع ہے' جس پہلو میں اس نے انسان کے ساتھہ انسان کو' کائنات کے ساتھہ خالق کائنات کو' ایک دلکش نغمے کی قلمرو میں ہر پہلو سے دکھایا ہے' اس کا وہ اہم پہلو اس کی زندگی میں نمایاں نہیں ہے —

ہمارے قدیم ہندوستان کے کسی شاعر کی سوانح عمری نہیں ملتی - اس کے جاننے کے لئے ہمارے دل میں خواہش ضرور رہے گی لیکن ہمیں اس کا افسوس

نہیں - والمیکی * کے بارے میں جو کہانی مشہور ہے اِسے تاریخی حیثیت سے کوئی بھی تسلیم نہیں کرے گا' لیکن ہماری رائے میں شاعر کی سچی تاریخ وہی ہے - والمیکی کے پڑھنے والے والمیکی کی شاعری سے اس کی جو زندگی تخلیق کرتے ہیں' والمیکی کی اصلی زندگی کے مقابلہ میں وہی زیادہ سچی ہے - کس چوٹ کے ذریعے والمیکی کے دل سے شاعری کی سوت پھوٹ پڑی؟ احساس درد کی چوٹ سے - رامائن احساس درد کے آنسوؤں کا سوتا ہے- مہجور کراونچ کے فراق کے تڑپا دینے والے آہ و نالے رامائن کی کہانی کے تہ میں گونج رہے ہیں- راون نے بھی صیاد کی طرح دو محبت کرنے والوں کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا ہے اور لنکا کانڈ کی جلگ' مہجور پرندے کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ ہے - راون نے جس جدائی کو پیدا کیا تھا وہ موت کی جدائی کے مقابلہ میں بھی بھیانک تھی - وصال کے بعد بھی اِس جدائی کی تلافی نہیں ہوئی —

عیش کے اسباب کس خوش اسلوبی سے فراہم ہو رہے تھے - ایک طرف تو باپ کی محبت' رعایا کی اُلفت' بھائیوں کی شفقت اور اِن سب کے بیچ میں نئے شادی شدہ رام اور سیتا کا ملاپ' اور دوسری طرف ولی عہدی

---

* والمیکی کو سنسکرت کا پہلا شاعر کہا جاتا ہے - اس کی شاعری کی ابتدا کیسے ہوئی اس کے متعلق یہ کہانی مشہور ہے کہتے ہیں کہ ایک دن والمیکی اشنان کے لئے دریا کے کنارے گئے - وہاں کراونچ (پرند کا نام) کا ایک جوڑا محبت کی کلیلوں میں مشغول تھا - اتنے میں ایک صیاد نے تیر سے ایک پرندے کو مار ڈالا - یہ دیکھ کر والمیکی کے دل پر سخت چوٹ لگی اور کہتے ہیں کہ اسی وقت ذیل کا خیال نظم میں اُن کے منہ سے نکل پڑا :-

"اے صیاد تو صدہا سال تک ذلت ہی ذلت میں بسر کرے کیوں کہ تونے ان دو پریمی پرندوں میں سے ایک کو مار ڈالا" - جوش فرو ہونے کے بعد جب انہوں نے اپنے الفاظ پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ یہ تو ایک اچھی خاصی نظم ہے - کہتے ہیں کہ اس کے بعد ہی انہوں نے رامائن نظم کرنی شروع کر دی -

کی رسم ' ان تمام مسرتوں کو کامل اور شاندار بنانے کے لئے آ موجود ہوئی تھی - ٹھیک اسی وقت صیاد نے تیر کھینچا اور نشانے پر بیٹھا جب سیتا چوری گئی- اس کے بعد آخر تک فراق کا کہیں اختتام نہیں ہوا - معاملا نا زندگی کے عیش کی ابتدا اور انجام ایک ہی تھا —

کراونچ کے جوڑے کی کہانی رامائن کے اصلی جذبات کا مختصر نمونہ ہے ' موٹی سی بات اتنی ہی ہے- لوگوں نے بلا شبہ اس حقیقت کا انکشاف کیا ہے کہ اس بڑے شاعر کی شفاف بحروں کی روانی احساس درد ہی کی گرمی سے پگھل کر بہی ہے - محبت کرنے والے جوڑے کے بے وقت دائمی فراق نے رشی کی اثر پذیر قوت شعری میں ایک تہلکہ ڈال دیا -

اور دوسری کہانی رتنا کر* (والمیکی کا پہلا نام) کی ہے- وہ ایک اور ہی جذبے کی مظہر ہے - رامائن کی شاعری کس قسم کی ہے اس کی یہ ایک دوسری تنقید ہے - اس کہانی سے ہمیں پتہ لگتا ہے کہ رام اور سیتا کے درد فراق کی بے انتہا اثر پذیری ہی رامائن کا بڑا سبب نہیں ہے ' اس کا باعث شاعر کے دل میں رامچندر جی کی زندگی کی اعلیٰ ترین عظمت کا احساس ہے - رام کی زندگی نے ایک ڈاکو کو شاعر بنا دیا ' اعتقاد کی قوت ایسی ہوتی ہے - رامائن کا رام ہندوستان کی نظروں میں کس عظمت کے ساتھہ نظر آتا ہے ' رامائن کی کہانی نے اسے اجاگر کرکے دکھا دیا ہے —

اِن دونوں کہانیوں سے پتہ لگتا ہے کہ روزانہ کی بات چیت ' خط و کتابت ' ملنا جلنا ' کام کاج اور تعلیم و تربیت ان چیزوں میں شاعری کی اصلیت نہیں ہے اس کی اصلیت ایک زبردست احساس کی تحریک

* والمیکی کا پہلا نام رتنا کر تھا اور کہتے ہیں کہ یہ ایک بڑا زبردست ڈاکو تھا -

ہے ' جو اس عالم سے بالاتر ' وقتی اور الہام کے مانند ہے اور وہ شاعر کی قابلیت سے بالاتر ہے —

کوی کلکن (ایک بنگالی شاعر) نے جو نظم لکھی ہے وہ بھی خواب میں ایک دیوی کے حکم کی بجا آوری میں اور اُسی کے اثرات کے تحت لکھی ہے —

کالی داس کے بارے میں جو کہانی مشہور ہے وہ بھی اسی قسم کی ہے - وہ ایک بے وقوف ' اُجڈ اور ایک قابل عورت کی دل لگی کا آلہ تھا - یکایک وہ ایک فیضان الہی کے سبب شاعری کے جوہر سے مالا مال ہوگیا - والمیکی ایک سنگ دل ڈاکو تھا اور کالی داس ایک اجڈ بے وقوف ' دونوں کے ایک ہی معنی ہیں - والمیکی کی تصنیف میں درد انگیز تقدیس اور کالی داس کی تحریروں میں رسیلی شوخی کی حیرت انگیز برتری کو نمایاں کرنے کی کوشش جھلکتی ہے —

لوگوں نے ان کہانیوں کو شاعر کی زندگی سے نہیں بلکہ اس کی شاعری سے انتخاب کیا ہے - اگر شاعر کی زندگی میں ایسی حقیقی باتیں ملتیں تو ان کا شاعر کی شاعری کے ساتھہ کوئی گہرا اور دوامی تعلق نہ ہوتا - والمیکی کی روزمرہ کی زندگی کا کسی طرح بھی ان کی رامائن کے ساتھہ مقابلہ نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ان کے اور سب کام وقتی اور غیر مستقل تھے - رامائن ان کی اندرونی مستقل فطرت کی فطری تخلیق ہے - وہ ایک (غیر قابل بیان) اور غیر محدود قوت کا ارتقا ہے - وہ دوسرے معمولی کاموں کی طرح ذرا سے جوش کا نتیجہ نہیں ہے —

ٹینیسن کی شاعری کی زندگی پر بھی کچھہ لکھا جاسکتا ہے - حقیقی زندگی کے تخیل کے سوا اسے حقیقی نہیں کہہ سکتے - اس سے لیڈی شیلٹ

(Lady Shaloth) اور کنگ آرتھر (King Arthor) کے زمانے کے ساتھہ وکٹوریہ (Victoria) کے عہد کا عجیب طرح سے میل ہو جائے گا - اس سے مرلن (Merlin) کا جادو اور سائنس کی ایجادات اکٹھے ہو جائیں گے - موجودہ زمانے نے بچپن ہی میں اسے سوتیلی ماں کی طرح تخیل کے جنگل میں جلا وطن کر دیا تھا وہاں اس نے قدیم زمانے کے شکستہ قلعے میں تنہا رہ کر کس طرح علاءالدین کا چراغ حاصل کر لیا ؟ کس طرح ایک شہزادی کے ساتھہ اس کی ملاقات ہو گئی ؟ کس طرح قدیم زمانے کی دولت لے کر وہ موجودہ زمانے کے اندر شاہی لباس میں داخل ہوا ؟ یہ طویل قصہ نہیں لکھا گیا - اگر یہ لکھا جاتا تو دو لکھنے والوں میں یکسانی نہ پائی جاتی اور ٹینیسن کی زندگی مختلف لوگوں کی زبانوں پر مختلف شکلیں اختیار کر لیتی -

تبصرے

تبصرے

ادب

بال جبریل

(مجموعۂ تازہ کلام اردو سر محمد اقبال مجلد
تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور سے مل سکتا ہے)

مجھے فطرت نوا پر پے بہ پے مجبور کرتی ہے
ابھی محفل میں ہے شاید کوئی درد آشنا باقی (بال جبریل)

یہ اردو زبان کی خوش نصیبی ہے کہ آج پورے ایک قرن کے بعد اقبال نے اردو کی طرف توجہ کی ہے جس کا نتیجہ ہم " بال جبریل " کی صورت میں دیکھتے ہیں - اقبال نے اردو اساتذہ کی اُس سنت کو قائم رکھا جو ابتدا سے حالی تک برابر جاری رہی - یعنی اردو زبان کے جتنے نامور شاعر ہوے ہیں ان کا کلام اردو اور فارسی دونوں میں ہے ' مثلاً مظہر جان جاں ' درد ' میر ' سودا ' مصحفی ' انشا ' مومن ' غالب ' شیفتہ ' حالی وغیرہم - ہم نے انہیں کبھی یہ الزام نہیں دیا کہ وہ فارسی میں کیوں کہتے ہیں (خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ ہمارے بعض ہم وطن انگریزی میں فکر فرماتے ہیں)

البتہ اتنی شکایت ضرور تھی کہ اردو میں کہنا کیوں چھوڑ دیا - لیکن کسی کو کیا معلوم تھا کہ فقیر کیا نکالتا اور کیا ڈالتا ہے - "بال جبریل" نے شکایت کا منہ بند کردیا اور ہم جیسے بے صبروں کو مطمئن کردیا - اقبال نے اردو کو نہیں چھوڑا اور نہ اردو اُن کو چھوڑ سکتی ہے - مانا کہ فارسی میں شیرینی، لطافت، لوچ اور نرماہٹ ہے، لیکن اردو پھر بھی اپنی زبان ہے - فارسی بنی بنائی اور سنوری سنورای ہے اور اردو کو ابھی بنانا اور سنوارنا ہے - جب بنانے اور سنوارنے والا ہی منہ موڑ لے تو پھر دوسروں سے کیا توقع ہوسکتی ہے - لیکن ہم اس کی ضرور داد دیں گے کہ وہ خاموشی سے سب شکایتیں سنتے رہے مگر چپکے چپکے اپنی زبان کی پرورش کرتے رہے - آج اس کا حال کھلا تو ہمیں بے حد مسرت ہوئی -

اردو ادب میں اقبال کی جگہ مستقل اور قائم ہے - اس نے صرف شاعری ہی میں انقلاب نہیں پیدا کیا بلکہ دلوں میں بھی انقلاب پیدا کیا ہے - آج اس کی بدولت ہم جدید رنگ اور نئے ڈھنگ دیکھتے ہیں جو آگے چل کر نئے برگ و بار لائیں گے —

جب "بال جبریل" آیا (یا آئی) تو ہم نے اُسے اس طرح کھولا جیسے کوئی مرد متقی اپنی کتابِ اوراد و وظائف کو کھولتا ہے - اس میں وہ جوش و خروش اور ہنگامہ نہیں جو بانگ درا میں ہے - مگر لے وہی ہے گو سر دھیمے ہیں - اس دھیمے پن میں دوسری قوت ہے جو ہنگامے میں نہیں - اس کے اسلوب بیان میں زیادہ سلاست اور صفائی ہے اور حکیمانہ رنگ گہرا ہے - بعض اوقات جوش و خروش وہ کام نہیں دیتا جو دھیمی بات دے جاتی ہے - فرنگی تہذیب و تمدن سے اقبال کو ہمیشہ تنفر و کراہت رہی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ حال کے سفر نے اس میں کسی قدر

تلخی اور بڑھا دی ہے —

اقبال ہندی نژاد ہے، فارسی ذوق اس کی سرشت میں ہے، عرب کا عاشق اور عربی شعرا کی طرح آزاد ہے، مغربی تعلیم حاصل کی ہے اور اس کے سرچشمہ پر پہنچ کر اس سے سیراب ہوا ہے - اس ترکیب سے یہ طبیعت بنی ہے - وہ خود کہتا ہے —

کوئی دیکھے تو میری نے نوازی نفس ہندی مقام نغمہ تازی
نگہ آلودۂ انداز افرنگ طبیعت غزنوی، قسمت ایازی

بال جبریل پرانے جوش و خروش سے بالکل خالی نہیں، کہیں کہیں یہ رنگ آگیا ہے مثلاً —

عالم نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں
میری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب
پردہ اٹھا دوں اگر چہرۂ افکار سے
لا نہ سکے گا فرنگ میرے نواؤں کی تاب
جس میں نہو انقلاب موت ہے وہ زندگی
روح امم کی حیات کشمکش انقلاب
صورت شمشیر ہے دست قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب

چند متفرق اشعار اس نئے مجموعے سے نقل کرتا ہوں، صاحب ذوق لطف حاصل کریں گے —

ترا اندیشہ افلاکی نہیں ہے تری پرواز لولاکی نہیں ہے
یہ مانا اصل شاہینی ہے تیری تری آنکھوں میں بیباکی نہیں ہے

رمزیں ہیں محبت کی گستاخی و بیباکی
ہر شوق نہیں گستاخ ہر جذب نہیں بیباک
فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا
یا اپنا گریباں چاک یا میرا گریباں چاک

ٹھہر سکا نہ ہوائے چمن میں غنچۂ گل
یہی ہے فصل بہاری ؟ یہی ہے باد مراد
قصور وار غریب الدیار ہوں لیکن
ترا خرابہ فرشتے نہ کر سکے آباد
خطر پسند طبیعت کو ساز گار نہیں
وہ گلستاں کہ جہاں گھات میں نہو صیاد

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

عقل عیار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے عشق بیچارہ نہ مُلا ہے نہ زاہد نہ حکیم

تبرک ہے مرا پیراہن چاک نہیں اہل جنوں کا یہ زمانہ

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مرد درویش جس کو حق نے دیے ہیں انداز خسروانہ

دیار عشق میں اپنا مقام پیدا کر نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر

اٹھا نہ شیشہ گران فرنگ کے احساں سفال ہند سے مینا و جام پیدا کر

آخر میں ایک نصیحت بھی سن لیجیے —

بچۂ شاہیں سے کہتا تھا عقاب سالخورد
اے ترے شہپر پہ آساں رفعت چرخ بریں
ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام
سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگبیں
جو کبوتر پر جھپٹنے میں مزا ہے اے پسر
وہ مزا شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں

منشورات

(مجموعۂ مضامین جناب پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی صاحب ۳۲۴ صفحات - قیمت ایک روپیہ بارہ آنے - انجمن ترقیء اردو اورنگ آباد دکن ' شیخ مبارک علی تاجر کتب لاہور ' الناظر بک ایجنسی لکھنؤ اور کتابستان الہ آباد سے مل سکتی ہے)

حضرت کیفی اردو کے بڑے ادیب اور محسن اور اردو زبان کے دلدادہ ہیں - ان کی زبان ٹکسالی اور دلی کی زبان ہے - ان میں جدت فکر اور جدت بیان دونوں پائے جاتے ہیں جن پر ان کے مضامین کا یہ مجموعہ جو منشورات کے نام سے شایع ہوا ہے' شاہد ہے - اس مجموعے میں بارہ مضامین ہیں جو سب کے سب ادب اور لسانیات پر ہیں اور ہر مضمون میں ان کی محققانہ کاوش نظر آتی ہے - مضامین کی تفصیل یہ ہے —

اردو لسانیات - مبادیات فصاحت - اردو کی موجودہ ضرورت -

تذکیر و تانیث - تشبیہہ - متروکات - گل ' گلاب - اردو اور لکھنؤ - نظر اور خود نظری - شمس العلما حضرت آزاد مرحوم - اردو اور پنجاب -

ان میں سے ہر مضمون ایک جدا حیثیت رکھتا ہے لیکن موضوع کے لحاظ سے ان کا ایک دوسرے سے وہی تعلق ہے جو گلدستہ کے پھولوں اور تسبیح کے دانوں کا ایک دوسرے سے ہوتا ہے - زندہ لوگوں میں بہت کم ایسے ہوں گے جنھوں نے اردو زبان پر لسانیاتی اور محققانہ پہلو سے اس طرح نظر ڈالی ہو - یہ مضامین ادیب اور طالب ادب کے لیے نہایت قابل قدر ہیں - اور اس قابل ہیں کہ جن یونیورسٹیوں میں اردو زبان کی اعلی تعلیم ہوتی ہے ' وہاں کے نصاب میں داخل کیے جائیں -

---

علم الحروف

(تالیف حکیم محمود علی خاں صاحب ماہر ' محلہ فراش خانہ ' دہلی - قیمت تین روپے)

اس تالیف کے چار حصے ہیں - حصۂ اول کے شروع میں مختصر طور پر تخلیق السنہ سے بحث کرنے کے بعد سامی زبان کا ذکر چھیڑ دیا ہے اور ایک شجرہ دیا ہے جس میں اس کی تمام شاخیں آگئی ہیں - اس کے بعد علم الکتابت کا بیان ہے جس کے ذیل میں دنیا کے مختلف قسم کے خطوں کا سرسری ذکر ہے - اس باب کے آخر میں اقوام عرب کی ابجد اور رسم الخط کا تذکرہ ہے - اس کی تاریخ اور عہد بعہد ترقی اور عربی خط کے تمام اقسام کی تفصیل درج ہے —

حصۂ دوم میں خطوط ممالک ایران کا تذکرہ ہے - قدیم خطوط کا

مختصر ذکر کرنے کے بعد عہد اسلام کے ساتوں خطوں کا ذکر کیا ہے - پھر خط نستعلیق اور اس کے اساتذہ کا حال کسی قدر تفصیل سے لکھا ہے جو بہت دلچسپ ہے - ان ممالک کا بھی ذکر کیا ہے جہاں فارسی یا عربی خط رائج ہے - اس کے تحت ہندوستان بھی آجاتا ہے - ہندوستان کی خوش نویسی اور خوشنویسوں کا ذکر تفصیل سے کیا گیا ہے ' اور بابر سے لے کر آخر تک ہر عہد کے خطاطوں کا حال اور ان کے اندازِ خط کا بیان کافی طور سے کیا ہے --

حصۂ سوم میں جو بہت مختصر ہے ' کاغذ ' قلم ' سیاہی کا بیان ہے اور ان کی تاریخی حیثیت سے بھی بحث کی گئی ہے --

حصۂ چہارم میں قدیم و جدید ابجدوں کے نقشے دیے ہیں - ان سے حرفوں کی شکلیں اور ان میں جو تغیرات ہوے ہیں صاف نظر آتے ہیں - اس باب کے آخر میں قدیم خط کوفی ' خط تعلیق ' شکستہ اور نستعلیق کے بہت اچھے نمونے درج ہیں - نستعلیق میں میر عماد ' میر علی ہروی ' آقا عبدالرشید دیلمی ' محمد موسیٰ ' محمد امیر رضوی اور میر علی تبریزی کے قطعات کے فوٹو دیے ہیں جنھیں دیکھ کر ان اساتذہ کے کمال کی داد دینی پڑتی ہے --

---

سرود زندگی

(جناب اصغر گونڈوی کا کلام - مجلد قیمت دو روپے - مصنف سے ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کے پتے سے مل سکتا ہے)

حضرت اصغر اردو کے ان چند زندہ شاعروں میں سے ہیں جنھوں نے

و غزل میں ایک خاص رنگ پیدا کیا ہے - وہ کائنات کو حکیمانہ نظر سے دیکھتے ہیں اور اسی میں ان کا تخیل اور ان کے جذبات پنہاں ہیں۔ نظر بلند اور خیال وسیع ہے، اسلوب بیان بھی پختہ ہے - لیکن ان کی شاعری خواص کے لیے ہے، عوام کے لیے نہیں - مولانا حالی کے بعد ابھی ہم میں ایسے شاعر پیدا نہیں ہوے جن کے کلام سے خواص و عوام دونوں حظ حاصل کر سکیں - اصغر صاحب کے اسلوب بیان میں بھی اب زیادہ پختگی اور صفائی پیدا ہو گئی ہے جس نے حکیمانہ رنگ کے ساتھ دلاویزی بھی پیدا کر دی ہے —

یہاں چند شعر ناظرین کے لطف سخن کے لیے نقل کیے جاتے ہیں —

یہ راز ہے میری زندگی کا		پہنے ہوے ہوں کفن خودی کا
او لفظ و بیاں میں چھپنے والے		اب قصد ہے اور خامشی کا
ہاں سینہ گلوں کی طرح کر چاک		دے مر کے ثبوت زندگی کا

ہوے جو ماجرے خلوت سرائے راز میں اس سے
نہ کفر اب تک ہوا واقف خبر اس کی نہ ایماں کو

دیکھیے اٹھتا ہے کب کوئی یہاں سے اہل درد
کعبہ و بت خانہ دونوں ہیں خدا کے سامنے
رشک صد ایماں ہے اصغر میرا طرز کافری
میں خدا کے سامنے ہوں بت خدا کے سامنے

انگریزی

اُردو

فہرستِ مضامین

بابت جولائی سنہ ۱۹۳۵ ع

ادب اور زندگی

از

(از جناب اختر حسین صاحب رائے پوری بی - اے)

ماضی کو سمجھہ ' مستقبل کا پیغام دنیا کو سنا — میرے ضمیر سے
ادب کا یہ تقاضا تھا - ماضی اور استقبال کو میں سمجھا لیکن
' آج کی ' دنیا میں میرے لئے جگہ نہیں - اب ادب کا یہ تقاضا
ہے کہ میں اپنی زندگی ختم کردوں " —

(روسی ادب جدید کے علم بردار ' میکووسکی ' کا آخری خط)

ادب کیا ہے ؟ ادب برائے ادب یا ادب برائے زندگی ؟ ادب کے مقاصد کیا ہیں ؟ — یہ سوالات اتنے ہی پرانے ہیں جتنی علم ادب کی زندگی - ارباب حل و عقد نے اس مبحث پر بڑے بڑے دفتر سیاہ کردئے اور اب اس موضوع پر از سر نو کچھہ کہنا تحصیل حاصل سمجھا جائے گا - اگر مجھے اس کا احساس نہ ہوتا کہ آج زندگی ایک نئے سانچے میں ڈھل رہی ہے سماج ایک دور تغیر سے گزر رہا ہے اور انسانیت ارتقاء بالضد (Dialectics) کے دوراہے پر آکر ہر ایمان دار ادیب سے پوچھہ رہی ہے کہ —

" دونوں میں سے کس کے موئید ہو — پیشہ ور گوشہ نشینی
یا عوام سے یگانگی ؟ جنگلوں اور پہاڑوں کی چاہت یا انسان
کی خدمت ؟ غیر ذمہ وارانہ خودسری یا خیالات کا ارتباط

قدرت یا ضمیر ؟ جبر یا اختیار ؟ تقدیر یا تدبیر ؟ قدرت کی اطاعت یا قدرت پر حکومت ؟ آرٹ آرٹ کے لئے یا آرٹ انسان کے لئے ؟ زمین یا آسمان ؟ دوئی یا یگانگی ؟ — ان میں سے ایک پر زندہ درگور دنیائے قدیم کا انحصار ہے اور دوسرے پر مستقبل کا دار و مدار — تم دونوں میں سے کس کے حامی ہو ؟ "

(زمانۂ حال کا ادب از پی - سی - کوگن)

اگر یہ مرحلہ در پیش نہ ہوتا اور ادیب سماج کا ایک فرد نہیں بلکہ کوئی بن باسی ہوتا تو مضمون کی نوعیت مجھے قلم اُٹھانے کی اجازت نہ دیتی - مگر چونکہ معاملہ اس کے برعکس ہے اور حقائق زندگی و اشارات ادب کی خلیج اس ملک میں وسیع تر ہوتی جاتی ہے اچھا ہو کہ یہ مسئلہ پھر چھیڑا جائے اور یارانِ نکتہ داں کے آگے یہ اہم سوال پیش کیا جائے —

مضمون کے پہلے حصے میں دکھایا جائے گا کہ تخلیق ادب معاشی زندگی کا ایک شعبہ ہے اور ادب زندگی کا پروردہ اور آئینہ دار ہے - پھر جب یہ تصفیہ ہوچکے گا کہ زندگی اور ادب کے مقاصد ایک ہیں تو روح مقصد کی وضاحت کے لئے ہم ہندوستانی ادب کا ایک ہلکا سا خاکہ پیش کریں گے اور دیکھیں گے کہ ہمارے ادب نے اپنے فرائض کی تکمیل کس حد تک کی ہے - میرا خیال ہے کہ ہندوستان پر برطانیہ کی فتح سامنتی (Feudal) تمدن پر حرفتی (Industrial) تمدن کی فتح تھی اور دیسی سماج کی سامنتی بنیاد جو پلاسی کی جنگ سے پہلے متزلزل ہو رہی تھی ہنگامۂ سنہ ۵۷ ع کے صدمے سے اس کا شیرازہ تیزی سے منتشر ہونے لگا - ہنگامۂ سنہ ۵۷ ع ہمارے سماج کی منزل ارتقا میں ایک حد فاصل قائم کرتا ہے - اس زاویۂ نگاہ کی روشنی میں ادب ہند کے بھی دو دور مقرر کئے جاسکتے ہیں - ایک وہ

جو اس زمانہ کے لگ بھگ انحطاط پذیر ہونے لگتا اور دوسرا وہ جو اس کے بعد رفتہ رفتہ آنکھیں کھولنے لگتا ہے - آسانی کے لئے ہم انہیں قدیم اور جدید ادب کہیئے - یہ تجزیہ خالصاً معاشی ہے -(بوسہیل تذکرہ مجھے یہ کہنے میں تکلف نہیں کہ غزل گوئی کا زوال سامنتی تہذیب کی تباہی کا پرتوَ اور نظم کی اتھان سماج کے بند پانی کی روانی کی علامت ہے جو ہنوز رسوم و اوہام کی کشمکش میں مبتلا ہے)—

کسی یونانی حکیم کا قول ہے کہ خیالات کی اینٹوں کو جذبات کے چونے سے ہی جوڑا جاسکتا ہے - انسان خیالات و جذبات کا مجموعہ ہے - سائنس خیالات میں ربط و نظم قائم کرتا اور ان کی تراش خراش کرتا ہے - آرٹ جذبات کو بناتا، سنوارتا اور نقش و نگار اشارات و الفاظ کے ذریعہ ان کی ترجمانی کرتا ہے - ادیب اپنی جذباتی کیفیات کو الفاظ کا جامہ پہناتا اور اپنی افتاد طبیعت کے مطابق اس کی کاٹ چھانٹ کرتا ہے - مدعا یہ ہے کہ ادب جذبات کی بولتی ہوئی تصویر ہے - دیکھنا یہ ہے کہ جذبات کی ترتیب و تکوین کس طرح ہوتی ہے - ظاہر ہے کہ ہر جذبہ گرد و پیش کا مطیع ہے اور حالات کے مطابق جذبات بدلتے رہتے ہیں - فضا کا ہیر پھیر کبھی آدمی کو رلاتا اور کبھی ہنساتا، کبھی آزردہ اور کبھی غضبناک بنا دیتا ہے - مثلاً 'موت' اور 'بھوک' کے مسائل ہمیشہ آدمی کو خون کے آنسو رلاتے رہے ہیں - ایک کے لئے قدرت دوسرے کے لئے سماج ذمہ وار ہے - اگر یہ دو مصیبتیں نہ ہوں تو ہمارے ادیب کی حزنیت بہت کم ہوجائے گی اور پھر فراق یار کے علاوہ بہت کم چیزیں اسے رنج دیا کریں گی- اگر سماج اور قدرت کے نظام میں ایسی تبدیلی ہوکہ یہ فضا بدل جائے تو ایسے جذبات بھی پیدا نہ ہوں گے —

اب تک ہمارے تنقید نگاروں نے یہ دکھلانے کی کوشش کی ہے کہ ادیب نے جذبات کو کس طرح ظاہر کیا ہے۔ (Form) کی اہمیت سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ ادیب جن جذبات کو آشکار کر رہا ہے وہ الہامی نہیں بلکہ ماحولی ہیں تو یہ سوال زیادہ اہم ہو جاتا ہے کہ ان جذبات کو کون اور کیوں ظاہر کر رہا ہے۔ ادیب سماج کے مطالبات اور اپنے گرد و پیش سے ہر انسان کی طرح متاثر ہوتا ہے۔ وہ جس زمانے میں جس تہذیب و تمدن کی گود میں پرورش پائے گا' جن لوگوں کے ساتھ رہے گا اور جن روایات و خیالات کا حامل ہوگا — وہ یقیناً اس کے جذبات کو رنگ روپ دیں گے' اس لیے میری ناچیز رائے میں کسی ادیب کی روح کو سمجھنے کے لئے اس فضا کو سمجھنا زیادہ ضروری ہے جس میں اُس نے پرورش پائی - جب تک اس زمانے کی زندگی نہ سمجھی جائے یہ سمجھ میں نہیں آسکتا کہ ادیب نے یہی کیوں کہا' اس کے خلاف کیوں نہیں کہا۔ اس لئے کہ ادیب اپنے جذبات کی نہیں اپنی فضا کے جذبات کی ترجمانی کر رہا ہے۔ اس کی زبان سے اجتماعی انسان بول رہا ہے —

فرض کیجئے کہ کسی شہر میں ایک کارخانہ بنایا جاتا ہے۔ اس کی تعمیر کی ظاہری صورت یہی ہے کہ ایک امیر نے سرمایہ لگایا انجنیر نے نقشہ بنایا اور مزدوروں کی محنت نے سرمایہ کھڑا کر دیا۔ لیکن واقعہ تو یہ ہے کہ جب تک اقتصادی ضروریات کا مطالبہ نہ ہوتا کہ کارخانہ بنایا جائے اس وقت تک اس کا خیال بھی کسی کے ذہن میں نہ آتا۔ کارخانے کی وجہ تعمیر کو سمجھنے کے لئے اس زمانہ کی مالیات پر غور کرنا چاہئے نہ کہ اس سیٹھ کی تھیلی کی لمبائی اور انجنیر کے نقشہ کی

ستھرائی پر - اسی طرح کسی زمانے کے ادب کا غائر مطالعہ مقتضی ہے اُس زمانے کے حالات کو سمجھنے کا، کہ اُن مخصوص جذبات کو اُن مخصوص حالات نے ہی پیدا کیا تھا - سنسکرت شاعری جن جذبات کی حامل ہے وہ قدیم ہند کے اساطیر (Myths) کے پس منظر میں ہی سمجھ میں آ سکتے ہیں - سماج اپنے عہد طفلی میں اپسراؤں* اور راکششوں کے افسانے سن اور سمجھ سکتا ہے لیکن اب اپنے زمانۂ پیری میں وہ ان رنگین خوابوں کا تانا بانا کیوں کر بُن سکتا ہے جب کہ اپسرا کی جگہ سینما کی طوائف اور راکشس کا نمبر روبٹ† (Robot) نے چھین لیا ہے اب شمع پر پروانے بھی کم آتے ہیں کہ آگ کی جگہ بجلی آگئی اور خرمن پر برق بھی کم گرتی ہے کہ اس پر برقی سلاخ نصب کردی گئی ہے! صحراؤں میں محمل کا پتا نہیں کہ موٹر چلنے لگے اور ڈولیوں کا رواج بھی کم ہو چلا کہ کہاروں کے کاندھے چھل گئے - زمانے کے رد و بدل نے سنسکرت شاعری کے پر نوچ لیے اور احساسات و جذبات کی تبدیلی کا یہ مطالبہ ہوا کہ ہندوستانی ادب کا دھارا اپنے بہاؤ کے لیے نیا میدان تلاش کرے —

اب یہ دیکھنا ہے کہ ادب کے فرائض کیا ہیں - میرا مطلب اُن کے مقصد سے نہیں ہے - طالسطائی کا یہ مقولہ بالکل صحیح ہے کہ آرٹ جذبات انسان کو متاثر کرنے کا ایک ذریعہ ہے مغنی ایک یاس انگیز نغمہ چھیڑتا ہے اور سننے والے بلا امتیاز اندوہ و الم سے چیخ اُٹھتے ہیں - شاعر طرب و نشاط کا گیت سناتا ہے تو سننے والے شادماں ہو جاتے ہیں - دستوویسکی جب "گناہ اور سزا" میں ایک روح کی کشمکش دکھاتا ہے تو ناظر کی روح میں گتھی سی پڑ جاتی ہے - ادیب کے کمال کا ایک معیار

* اپسرا - حور کا ہندو تصور - † روبٹ - مصنوعی انسان -

بھی ہو سکتا ہے کہ اپنے جذبات سے وہ دوسروں کو کس حد تک متاثر کر سکا۔ اُس کی عبارت زمان و مکاں کے امتیاز سے جتنی بالاتر ہوگی، اس کا آرٹ اتنا ہی دیرپا اور مستحسن سمجھا جائے گا۔ مگر وہ اپنے ماحول سے جدا نہیں ہو سکتا اپنے ماحول کے تاثرات کو بیان کرتا ہے یعنی اپنے ماحول سے لوگوں کو متاثر کرتا ہے۔ جب تلسی داس ایک زن مرید باپ کی اطاعت کو بیٹے کا دین و مذہب بتلاتا ہے تو اُس کے قلم سے اُس زمانے کی تہذیب بولتی ہے جس میں بیٹے کی حیثیت باپ کی غیر منقولہ جائداد سے زیادہ نہ تھی۔ آج جب ہر بیٹا اپنی انفرادیت کو شفقت پدری سے زیادہ قیمتی سمجھ رہا ہے تو اس قسم کی تعلیم رجعت اور قدامت سے تعبیر کی جائےگی۔

یہاں فوراً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آرٹ کا مقصد کیا ہے:

'ادب برائے ادب' کے علم برداروں کا خیال ہے کہ روح اور خدا کی طرح ادب بھی کوئی مافوق الفطرت (Super Organic) شئے ہے اور جس طرح حسن و حقیقت کو عام معیار پر نہیں جانچا جا سکتا اسی طرح ادب سے سرور و حظ اسی حالت میں حاصل کیا جا سکتا ہے کہ اسے سماج کی پابندیوں سے الگ رکھا جائے۔ جمالیاتی نقطۂ نظر' جس کے مؤید ہیگل، شوپین ہور، نطشے اور بہت سے انگریز ادبا اور مفکرین ہیں آرٹ کا مقصد تلاش حسن کو قرار دیتے ہیں۔ اخلاقی نقطۂ خیال جس کی تشریح طالسطائی نے کی، آرٹ کو نیکی کا آئینہ دار قرار دیتا ہے۔ معاشی اور مادی نقطۂ نگاہ سے یہ دونوں معیار مبہم اور ادھورے ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے کہ ادیب انسان ہے اور ہر انسان کی طرح ماحول سے متاثر ہوتا ہے اور اگر یہ حقیقت ہے کہ ادب نگاری بھی ایک قسم کا سماجی عمل ہے اور انسانیت اس سے اثر اندوز ہوتی ہے۔ تو ادب اور انسانیت کے مقاصد ایک ہیں۔

ادب زندگی کا ایک شعبہ ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ مادی سرزمین میں جذبات انسانی کی تشریح و تفسیر کرتے ہوے وہ روح القدس بننے اور عرش پر جا بیٹھنے کا دعویٰ کرے- زندگی کا ڈھانچا مکمل اور واحد ہے - اس میں سائنس آرٹ اور فلسفہ کے مختلف خانے نہیں ہیں کہ جس کا جی چاہے کہہ دے کہ مجھے زندگی سے کیا غرض' میں آپ اپنے لئے زندہ ہوں! اور چیزوں کی طرح فن و ادب بھی زندگی کے پروردہ اور خادم ہیں- [ادب ماضی و حال اور حال و مستقبل میں رشتہ جوڑتا ہے]- رنگ و نسل اور ملک و قوم کی بندشوں کو توڑ کر وہ بنی نوع انسان کو وحدت کا پیغام سناتا ہے؛ کوئی وجہ نہیں کہ اتنے اہم معاشی فریضے کو ایک فن کار اپنی ذاتی ملکیت سمجھے اور اس کا یہ دعویٰ تسلیم کرایا جاے- حسن کیا ہے جس کی تلاش میں مدعیانِ ادب براے ادب مدتوں سے سرگرداں ہیں؟ حسن کی تعریف نا ممکن سی ہے - والٹیر نے اپنی مشہور تصنیف (Dictionaire de Philosophie) میں ان لوگوں کا بڑا مذاق اُڑایا ہے جو حسن کا کوئی معیار قایم کرنا چاہتے ہیں- وہ لکھتا ہے کہ مینڈکی کو بھی اپنی نرم اور چمک دار جلد پر خوبصورتی کا دعویٰ ہے اور ایک حبشی حسینہ کے چہرے اور موٹے ہونٹوں پر بھی عاشقوں کا گروہ دل و جان قربان کرتا ہے - جرمنی کے کلاسکل فلسفروں کے نزدیک یہ وہ چیز نہیں ہے جو آدمی کو خوش کرتی ہے - اس کے یہ معنی ہوے کہ ادب کا مقصدِ اُولیٰ تفریحِ طبع ہے اور چونکہ دعویٰ یہ بھی ہے کہ آرٹ زندگی کا اہم ترین شعبہ ہے لہذا تفریح زندگی کی معراج ہوئی! پھر ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک آدمی جس چیز سے مسرور ہوتا ہے وہ دوسرے کے لیے اجیرن ہے - زندگی اور ادب کا یہ نظریہ اس قدر بے معنی ہے کہ اس پر کچھ لکھنا فضول ہے - پھر کیا آرٹ کا مقصد تلاش حق ہے؟ حقیقت

کہا ہے ! کیا حقیقت کی کوئی قطعی اور آخری تعریف ہوسکتی ہے جو سب کے لیے قابل قبول ہو؟ جو چیز ایک کے لیے اچھی ہے دوسرے کے لیے بُری - ادھر کے لیے جو حق ہے وہ فریب کے لیے ناحق ہے - پھر ادب کس حقیقت کا جویا ہے -

میں پھر اپنے اسی جملے کو دھراتا ہوں کہ زندگی کے مقاصد سے ہٹ کر ادب نہ اپنی منزل تلاش کرسکتا ہے اور نہ یہ ممکن ہے - زندگی کی روانی اسے اپنے ساتھ چلنے کے لیے مجبور کرتی ہے، عام اس سے کہ وہ اپنے آپ کو رموز حیات کا محرم اور حسن و عشق کا پروردگار کہتا رہے - ایک انسان اور ایک ادیب کے فرایض و مقاصد یکساں اور مشترک ہیں - فرق صرف اتنا ہے کہ ایک اپنے ماحول کی ترجمانی کرتا اور دوسرا اس سے متاثر ہوتا ہے - یہ صحیح ہے کہ دنیاے ادب میں ایسی بیسیوں مثالیں ملیں گی کہ ادیب اپنے ماحول سے بے خبر اور آزاد ہوکر آگے یا پیچھے جانا چاہتا ہے - اپنے موقع پر ایسی واردات کے اسباب پر بھی غور کیا جاے گا اور ہم دیکھیں گے کہ یہ حالات کا ہی رد عمل تھا، کوئی الہامی کیفیت نہ تھی —

اب تک ہم جن نتائج پر پہنچے وہ یہ ہیں :—

(۱) ادب زندگی کا ایک شعبہ اور اپنے ماحول کا ترجمان ہے —

(۲) زندگی اور ادب کے مقاصد ایک ہیں —

زندگی کے مقاصد کو سمجھنے کے لیے سرسری طور پر ہمیں سماج کی بنیاد کا جائیزہ لینا اور یہ دیکھنا ہوگا کہ سماج کیوں بنتا اور بگڑتا ہے اور یہ تبدیلیاں اسے کس منزل کی طرف لے جا رہی ہیں -

سماج ایسے افراد کا مجموعہ ہے جو اشتراک عمل کے لیے یک جا ہوتے ہیں - اشتراک اور تعاون کے لیے ان افراد کا مقصد یکساں ہونا ناگزیر ہے - ہر فرد کی مادی ضروریات کم و بیش ایک سی ہوتی ہیں اور سماج کی

ابتدا اس فرض سے ہوتی ہے کہ ضروریات زندگی کے حصول [illegible]
آسانی ہے - یعنی سماج کا سنگ بنیاد انسان کی مالی ضروریات کی پیداوار
اور تقسیم پر ہے اور افراد کا رشتۂ باہمی اس پیچ و خم کے ساتھ ساتھ
بدلتا رہتا ہے - سماج کی ترقی سے مراد یہ ہے کہ اس کے افراد کا رشتہ
مستحکم ہوتا جاتا ہے یعنی ضروریات زندگی کی بہم رسانی آسان ہوتی
جاتی ہے جس سے انہیں اپنی خواہشوں کی تکمیل کا موقع ملتا ہے -
پیداوار کے ذرائع جتنے وسیع اور کارآمد ہوں گے اور مال کا طریقۂ تقسیم
اکثریت کے لیے جتنا قابل قبول ہوگا اسی اعتبار سے نظام معاشی کی
عمر دراز ہوگی - سماج کے ارتقا سے مراد دراصل پیداوار کے انہیں ذرائع کے
ارتقا سے ہے - دور وحشت سے گزر کر انسان دور حرفت میں کیسے پہنچ گیا،
اسے سمجھنے کے لئے یہ دیکھنا ہوگا کہ کلہاڑی نے ترکٹر کی شکل کس
طرح اختیار کرلی اور نیزہ مشین گن کیسے بن گیا - پیداوار کے ذرائع دو
حصوں میں منقسم کئے جاسکتے ہیں - ایک طرف تو قدرتی ذرائع و عناصر ہیں
جنہیں حسب ضرورت کارآمد بنانا ہے اور دوسری طرف وہ انسانی محنت
ہے جو یہ فرض انجام دیتی ہے - زمین کان اور خام اشیا کی دوسری
قدرتی رسد گاہیں جیسی پہلے تھیں ویسی ہی اب بھی ہیں - ان میں
فرق نہیں آتا - سماج کا ارتقا و تغیر محتاج ہے انسانی محنت کا، جو ان
اشیا کو قابل استعمال بناتی ہے - جس کھیت میں کاشتکاری کے فرسودہ
طریقوں سے دس من غلہ پیدا ہوتا تھا آج وہاں مشینوں سے سیکڑوں من
اناج پیدا ہوتا ہے - یہ پیداوار کے ذرائع کی ترقی ہے جسے ہم سماج
کی ترقی سے تعبیر کرتے ہیں - پہلے یہ کہا جا چکا ہے کہ نظام معاشی کا
بنیادی پتھر، ضروریات زندگی کی پیداوار پر رکھا گیا ہے اور سماج اسی

وقت تک قایم ہے جب تک اس کے افراد کا رشتۂ باہمی مستحکم ہے جس کی ضمانت ہر فرد کی ضروریات کی تکمیل ہے۔ اس سے یہ لازم آیا کہ پیدا وار اور تقسیم کے طریقے ایسے ہونے چاہئیں کہ ہر فرد اپنی بساط کے مطابق محنت کرکے اپنی ضروریات حاصل کرسکے۔ یعنی پیداوار اور تقسیم کا ارتباط رشتۂ افراد کے استحکام کا ضامن ہوسکے۔ ہر فلسفۂ زندگی کا منشا یہی ہے کہ ہر فرد بشر کو روحانی، ذہنی و جسمانی نشو و نما کا موقع مل سکے۔ مگر انسان کا مادّی وجود اس کا مقتضی ہے کہ سب سے پہلے اس کی جسمانی ضروریات کا انتظام ہو۔ سرمایہ دولت یا امارت سے وہی لوگ بہرہ مند ہوتے ہیں جو پیداوار کے ذرائع پر کسی نہ کسی طرح قابض ہوتے ہیں۔ غریب و فقیر وہ لوگ ہیں جو ان کی ملکیت سے محروم ہیں۔ اگر کبھی ایسا ہوسکے کہ پیداوار کے ذرائع پر کوئی ایک طبقہ نہیں بلکہ پورا سماج قابض ہو اور مال کی تقسیم اس طرح ہو کہ ہر محنت کش فکر روزگار سے آزاد ہوجائے اور آئندہ نسل کی تربیت و پرورش کی کفالت و تحفظ سماج کرسکے، تو یہ سماج کی مادی ترقی کی انتہا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ ذہنی و تمدنی اعتبار سے بھی انسانیت کو مرتبہ بلند کی طرف لے جاسکے گا، اور اس وقت روح الاجتماع خدا وند بن جائے گی اور کثرت و وحدت میں کوئی تنازع نہ رہے گا۔ یہ زندگی کا مقصد اولی ہے اور اس کا تقاضا ہے کہ اس کا ہر شعبہ اس کے حصول کے لئے کوشاں ہو۔

اسی چیز کو مدنظر رکھکر ادب جدید کا پیغمبر 'میکسم گورکی' کہتا ہے: "ادب انسانیت کا نقاد ہے۔ وہ اس کی کجروی کو ظاہر کرتا اور اس کی خامکاریوں کو بے نقاب کرتا ہے۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انسان کی حیات مستعار کو دائم و قائم بنائے۔ ادب کی بھلائی

اور تڑپ اس لئے ہے کہ آدمی کو سمجھائے کہ وہ حالات کا غلام نہیں ہے بلکہ حالات اس کے غلام ہیں - وہ آدمی کو بتلانا چاہتا ہے کہ وہ آپ اپنی زندگی کا مالک ہے اور اسے جس روش پر چاہے لے جا سکتا ہے - اس لحاظ سے ادب تغیر پسند قدامت شکن اور دور جدید کا پیش رو ہے - "

ادب زندگی کے اس سوال کا جواب ہے کہ انسان کس سے محبت اور کس سے نفرت کرے اور کس طرح زندہ رہے - یہ سچ ہے کہ تدریسیت سے اسے کوئی واسطہ نہیں - روگی انسانیت کو وہ پند و نصیحت کی کڑوی دوا نہیں پلاتا بلکہ ہلکے اور میٹھے سروں سے اس کی عیادت کرتا ہے - اس میں شبہ نہیں کہ ادب کے ماخذ ماضی و حال ہیں لیکن وہ مستقبل کا جویا ہے - وہ پیچھے یا دائیں بائیں طرف اس غرض سے دیکھ لیتا ہے کہ منزل حیات کے نشیب و فراز کو دیکھ سکے اور آگے بڑھ سکے - تاریخ کے محاذ میں اس کی جگہ صف آخر میں نہیں بلکہ پیش پیش ہے - لہذا ادب کا یہ مقصد ہے کہ زمان و مکان کی حد بندیوں سے بالاتر ہوتے ہوئے بھی اپنے گرد و پیش کا آئینہ دار ہوتا کہ اس کے حسن و قبح سے آگاہ ہوکر انسانیت ترقی کے زینوں پر گامزن ہو - علم اور ادب میں وہی فرق ہے جو استاد کی دھمکیوں اور ماں کی لوریوں میں - ادب وہ استاد ہے جو کہانیوں اور گیتوں میں انسانیت کو رموز حیات سمجھاتا ہے - ادب کا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ وہ ان جذبات کی ترجمانی کرے جو دنیا کو ترقی کی راہ دکھائیں ان جذبات پر نفرین کرے جو دنیا کو آگے نہیں بڑھنے دیتے اور پھر وہ انداز بیان اختیار کرے جو زیادہ سے زیادہ لوگوں کی سمجھ میں آسکے - کیونکہ بہر حال زندگی کا مقصد یہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کا زیادہ سے زیادہ بھلا ہوسکے -

ادب ھند کا ایک خاکہ پیش کرکے ہم یہ دیکھینگے کہ وہ کہاں تک مذکورہ مقصد کا حامل رہا ھے کیا وہ زندگی کے حقائق اور مقاصد کی ترجمانی کرتا رہا ھے اور کیا وہ انسانیت کا مصلح ' ور پیشوا کہا جاسکتا ھے - ابھی صرف یہ دیکھنا ھے کہ ھمارے ادیب عموماً کس ماحول میں رھتے آے ھیں کیونکہ ھمارے تجزیہ کے مطابق اُن کے جذبات کی شکل اسی ماحول میں ھوئی - کیا یہ ماحول اور یہ جذبات زندگی کے لئے چراغ راہ بن سکتے ھیں ؟ اب زندگی کو کس طرف جانا چاھئے اور ھمارا ادب کس طرف جارھا ھے ؟

زمانۂ قدیم اور عہد وسطیٰ بلکہ گزشتہ صدی کے اواخر تک علم وادب پر دو قسم کے لوگوں کا اجارہ رھا ھے - ایک وہ جو بیراگی یا صوفی تھے اور دوسرے وہ جو طبقۂ امرا سے تعلق رکھتے تھے اور زندگی کی تگ ودو سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا - آشرموں یا حجروں میں اور درباروں یا امیروں کی ڈیوڑھیوں میں پڑے ھوے یہ عالم اور ادیب زندگی کے مسائل کو سمجھنے سمجھانے کی کوشش کیا کرتے تھے - وہ ایک ایسے ماحول میں رھتے تھے جو یا تو زندگی سے دور تھا اور یا جھوٹی زندگی کا عکاس تھا - سوچیئے کہ دربار یا آشرم میں رہ کر انسان کِن جذبات کی ترجمانی کن کی زبان میں کرے گا - ایک محدود دائرے میں رہ کر جہاں ایک سے لوگ ایک قسم کی زندگی بسر کرتے ھیں ' جہاں حزنیت یا منافقت کا دور دورہ ھے — وھاں کسی ادیب کی حالت کیا ھوگی ! اس لحاظ سے ھمارے ادب قدیم کے تین نقائص اتنے نمایاں ھیں کہ حاشا تشریح طلب نہیں :

۱ - موضوعات ادب بہت ھی فرسودہ اور محدود ھیں -

۲ - لطف بیان اور زیب داستاں پر معنی و مقصد قربان کئے جاتے ھیں -

۳ - ادب کو لوگ پیشہ کی حیثیت سے اختیار کرتے ہیں -

تاریخ بتاتی ہے کہ اس ملک کا ادب ہر دور میں طبقۂ امرا کا خادم اور منت پذیر رہا ہے - کچھہ صوفی شاعر اور عہد وسطیٰ کی ' بھکتی تحریک ' کے علم بردار ادیب ایسے ضرور ہوے ہیں جو امیروں کے دست نگر نہ تھے لیکن ان میں سے اکثر دنیا سے بیزار اور بے نیاز تھے جس کی جھلک ان کے کلام میں موجود ہے - کبیر داس اور نظیر اکبرآبادی جیسے شاعر خال خال ہی ہوے ہیں جو گھوم پھر کر آپ اپنی روٹیاں کماتے ' اور زندگی کو کوچۂ یار میں رہ کر نہیں بلکہ قدرت کے نگار خانے میں رہ کر سمجھنے کی کوشش کرتے تھے - ان درباری بھاٹوں اور بے غیرت عاشقوں کے متعلق طالسطائی کہتا ہے :

" کیونکہ ان کا پیشہ امیروں کی خوشنودی ہے اس لئے ان میں خودداری کا احساس باقی ہی نہیں رہتا - قبول عام کی ہوس میں یہ اندھے ہوجاتے اور مدح و ثنا پر اپنا دین و ایمان نثار کردیتے ہیں - یہ دیکھہ کر کتنا افسوس ہوتا ہے کہ آرٹ کی خاطر یہ زندگی کے لئے بیکار تو ہو ہی جاتے ہیں لیکن یہ بہ ایں ہمہ آرٹ کو فائدہ کیا الٹا نقصان پہنچاتے ہیں - علاوہ بریں یہ لوگ امیروں کی غیر فطری زندگی کو اس قابل بنا دیتے ہیں کہ وہ بیزار ہوکر مر نہیں جاتے بلکہ حسن و عشق کی دنیا میں اپنی روح کو تلاش کرنے کا دلچسپ مشغلہ اختیار کرتے ہیں - امیروں کو آرٹ یہ تلقین کرتا ہے کہ انسان نیکی کے لئے نہیں بلکہ حسن پرستی یعنی عیاشی کے لئے زندہ ہے - امیروں کے زیر سایہ جو غریب رہتے ہیں وہ بھی ان مکروہ جذبات سے

اثر پذیر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے جن کی ترجمانی آرٹ کر رہا ہے۔ چنانچہ لوگوں میں وطن پرستی اور اوباشی کے اثرات سرعت سے پھیلتے جاتے ہیں - یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ہمارے زمانے کے آرٹ کا وہی حشر ہوا جو ایک عشوہ فروش ہرجائی کا ہوتا ہے - آرٹسٹ فصاحت و بلاغت، عبارت آرائی اور رنگین بیانی میں اپنی ضمیر فروشی اور نفس پروری کو چھپاتا ہے، طوائف روغن و غازہ سے اپنی بدصورتی پر پردہ ڈالتی ہے - غرض کہ ہمارے زمانے اور ہمارے طبقے کے آرٹ اور کسی کسبی میں ذرا فرق نہیں - یہ تشبیہ لفظ بہ لفظ صحیح ہے — آرٹ اتنا ہی خود فروش، سیاہ باطن اور فریب کار ہے !"

یہ باتیں ہندوستان کے قدیم اور جدید ادب کے لئے زیادہ سچائی کے ساتھ کہی جاسکتی ہیں۔ دوسرے ممالک میں بھی ادیب اور فن کار ہرزہ سرائی کرتے رہے ہیں لیکن ہم دیکھیں گے کہ ہمارے ادب کی حالت اور بھی ناگفتہ بہ رہی ہے۔ زمانۂ حال کا سحر طراز ادیب رومان رولاں ادب کے اس رویہ کے خلاف احتجاج کرتا ہوا کہتا ہے - "پچھلی صدی کے ادیبوں اور فن کاروں نے سماج کے ضمیر کو سلا دیا ہے - سماج کی ذمہ داری سے بچنے کے لئے انہوں نے لوگوں کو نئے نئے بہانے سکھا دئے ہیں اور حقیقت سے بچنے کے لئے نئے نئے بت خانے کھڑے کئے ہیں۔ ان کی تاویلوں کے بعد ہر شخص کے لئے یہ کہنے کی گنجائش پیدا ہوگئی ہے کہ سماج کے مظالم اور ستم خیزیوں کے لئے میں ہرگز ذمہ وار نہیں ہوں !"

آج ادیبوں کی حالت کیا ہے - جو پیشہ ور ہیں وہ فلم کمپنیوں، جاہل کتب فروشوں اور تن آسان ناظروں کے ساتھ خود کو بیچ رہے ہیں -

جو شوقیہ لکھتے ہیں وہ نہ زندگی کو سمجھتے ہیں اور نہ سمجھ سکتے ہیں - زندگی کھیتوں اور کارخانوں میں ہے نہ کہ آرام کرسیوں اور آراستہ ایوانوں میں - پھر جب کبھی ان سے کہا جاتا ہے کہ تمہارے فرائض و مقاصد کم از کم ایک معمولی انسان جیسے تو نہیں انہیں ان خوش گوار حالات کو بدلنے کی کوشش کرنی چاہئے تو یہ بندگان خدا 'ادب برائے ادب' کی دھائی دینے لگتے ہیں - مطلب یہ ہے کہ ہم اپنے لیے زندہ ہیں! ٹوپیوں اور جوتیوں کی طرح بازار کی ضرورت کے لحاظ سے کتابیں لکھتے ہوے اور مشاعروں کی تحسین و آفرین اور امیروں کے مہر و کرم کے خیال سے تک بندی کرتے ہوے بھی یہ لوگ بیباکی سے کہتے ہیں کہ آرٹ صرف انفرادی آزادی کی فضا میں پنپ سکتا ہے - انہیں مخاطب کرکے 'لینن' اپنے اخبار نوواژیزن میں ایک جگہ لکھتا ہے : " ہم ادب کو کامل طور پر آزاد کرنا چاہتے ہیں - صرف سیاسی بندشوں سے ہی نہیں بلکہ دولت اور خود غرضی کی پابندیوں سے بھی ہم اسے آزاد کردیں گے - یہی نہیں بلکہ ہم اسے سرمایہ دارانہ انفرادیت کا خادم بھی نہ رہنے دیں گے —

یہ آخری الفاظ ناظرین کو متضاد معلوم ہوں گے - ممکن ہے کہ کوئی آزادی کا پرستار ادیب چیخ اُٹھے کہ تم سماج کی چکی میں آرٹ کو پیسنا چاہتے ہو، تم اس تخلیقی صلاحیت کو معدوم کرنا چاہتے ہو جو مکمل انفرادی آزادی کی فضا میں ہی پروان چڑھ سکتی ہے - میں کہتا ہوں کہ یہ لمبے چوڑے دعوے تمہاری منافقت کے ثبوت ہیں - جس سماج کی بنیاد کیسۂ زر پر رکھی گئی ہے، جہاں معدودے چند سیٹھ، عیش اور مزدور فاقہ کشی کرتے ہیں، وہاں آزادی کا ذکر تک مضحکہ خیز ہے - میں مصنفوں سے پوچھتا ہوں کہ کیا وہ سرمایہ دار پبلشروں کے دست نگر نہیں ہیں ؟

کیا وہ عیاش طبع ناظرین کے زیر احساں نہیں ہیں جو ننگی تصویروں کے دلدادہ ہیں کیا ان کی خاطر 'ادب برائے ادب' میں طوائفوں کا ذکر مسعود نہیں کرنا پڑتا ؟ سماج میں رہتے ہوئے آپ سماج سے الگ نہیں ہوسکتے - کسی سرمایہ دار مصنف ' آرٹسٹ اور ایکٹر کا دعوئی آزادی — اُس کی جہالت کا پردہ ہے ! "

صحیح ادب کا معیار یہ ہے کہ وہ انسانیت کے مقصد کی ترجمانی اس طریقے سے کرے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اُس سے اثر قبول کرسکیں - اس کے لئے دل میں خدمت خلق کا جذبہ پہلے ہونا چاہئے کیونکہ ادب پیغمبری کی طرح خودگزاری کا مقتضی ہے نہ کہ مُلّائیت کی طرح پیشہ ور! ماضی ' حال اور مستقبل کو سمجھنا ادیب کے لئے ضروری ہے تاکہ اس کی دردمندی رائیگاں نہ جائے اور وہ تاریخ کے اشاروں کو سمجھا سکے - پھر زندگی کو اسی وقت سمجھا جاسکتا ہے جب اس کی آگ میں تپا جائے اور اس کے ھنگاموں میں حصہ لیا جائے - اس کی تگ ودو سے الگ رہ کر اس کے رموز کو سمجھنے کی کوشش ویسی ہی ہے جیسے ساحل پر کھڑے ہوکر دریا کی گہرائی کا اندازہ لگانا - اس صورت میں نہ ادیب زیادہ لوگوں کے احساسات کو سمجھ سکتا ہے اور نہ اپنی زبان اور پیام اُن تک پہنچا سکتا ہے - یہ معیار بہت بلند اور مشکل معلوم ہوگا اس لئے کہ اب تک ادب پر اس جماعت کا قبضہ رہا ہے جو کسی راجہ کے مشہور درباری کی طرح ندی کی لہریں گننے کی تنخواہ لیا کرتا تھا —

پوچھا جائے گا کہ ادبا و شعرا کون سی راہ اختیار کریں - اپنے تخئیل اور تخلیق کی باگ کس طرف موڑیں کہ زندگی کی شاہراہ سے آملیں جس سے ھنوز وہ بہت دور رہے ہیں - روس کا مشہور مفکر ' پرنس کروپاٹکن '

جواب میں کہتا ہے : " اگر تمہارے دل میں بنی نوع انسان کا درد ہے ' تمہارے جذبات کا رباب اُن کے دکھہ سکھہ کے ساتھہ ہم آہنگ ہوتا ہے اور اگر ایک حساس انسان کی طرح تم زندگی کے پیغام کو سن سکتے ہو — تو تم ہر قسم کے ظلم کے مخالف ہوجاؤ گے ! جب تم کروڑوں آدمیوں کی فاقہ کشی پر غور کروگے ' جب تم میدان جنگ میں لاکھوں بے گناہوں کے لاشے تڑپتے دیکھوگے ' جب تمہارے بھائی بند قید و بند اور دار و رسن کے مصائب جھیلتے نظر آئیں گے ' اور جب تمہاری آنکھوں کے آگے دلیری کے مقابلے میں بزدلی اور نیکی کے مقابلے میں بدی فتح یاب ہوگی — تو ادیبو اور شاعرو ' اگر تم انسان ہو تو ضرور آگے آوگے ! تم ہرگز خاموش نہیں رہ سکتے - تم مظلوموں کی طرف داری کروگے کیونکہ حق و صداقت کی حمایت ہر انسان کا فرض ہے - "

ہر ایمان دار اور صادق ادیب کا مشرب یہ ہے کہ قوم و ملت اور رسم و آئین کی پابندیوں کو ہٹاکر زندگی کی یگانگی اور انسانیت کی وحدت کا پیغام سنائے - اُسے رنگ و نسل اور قومیت و وطنیت کے جذبات کی مخالفت اور اخوت و مساوات کی حمایت کرنی چاہئے اور ان تمام عناصر کے خلاف جہاد کا پرچم بلند کرنا چاہیے جو دریائے زندگی کو چھوٹے چھوٹے بچوں میں بند کرنا چاہتے ہیں - کیا زمانۂ حال کا ادیب یہ کرے گا ؟ اب تک وہ قدامت اور رجعت ' خود پرستی اور ظلم پروری کا ساتھہ دیتا رہا ہے جس کی مثالیں ہم نے مضمون کے دوسرے باب میں پیش کی ہیں - گو یہ تبصرہ مختصر ہے تاہم مجھے یقین ہے کہ غور و فکر کے لیے تھوڑا سا سامان ضرور مہیا کرے گا —

قدیم ادب ہند کا معاشی تجزیہ

پلاسی کی لڑائی سامنتی اور حرفتی تہذیبوں کی ٹکر تھی - اس کے بعد پورے ایک سو سال تک ہندوستانی سماج کا شیرازہ منتشر ہوتا رہا اور سنہ ۵۷ ع کی آخری کشمکش کے بعد سامنتی تمدن نے ہتھیار ڈال دیے - اور یہ معلوم ہوگیا کہ کرگھوں اور ہلوں کے دن گئے اور مشینوں کا زمانہ آگیا - تاہم حرفتی تمدن کا اثر سنہ ۵۷ ع کے بعد زیادہ نمایاں ہوا جس کی گونج پہلے راجہ رام موہن رائے کی مغرب دوستی اور بعد ازاں سر سید کی انگریز پروری میں سنائی دی - ہندوستان کی زندگی میں انقلاب سا آگیا جس کی رو میں پرانی روشنی کے چراغ گل ہونے لگے - جیسا کہ عرض کرچکا ہوں میں نے اسی اعتبار سے ادب ہند کے دو دور مقرر کیے ہیں - کیونکہ اس سے پہلے ہزاروں سال تک ہمارے سماج کی حالت یکساں رہی - پیداوار کے ذرائع ایک سے رہے اور تقسیم کے اصولوں میں بھی کوئی فرق نہ آیا - مقامی حالات میں عارضی طور پر خیرات یا قحط کی وجہ سے یونہی سی تبدیلی ہوجاتی تھی ورنہ وہی آسمان تھا اور وہی زمین —

دنیا کے ہر گوشے میں سامنتی تمدن طبقۂ امرا پر رزم اور بزم کے نقوش چھوڑ جاتا ہے - اس کی پوری زندگی خون آشامیوں یا رنگ رلیوں میں گزر جاتی ہے - ہند قدیم کی تہذیب عوام اور امرا کو مذہبی اعتبار سے بھی دو طبقوں میں بانٹتی اور علم و ادب * کو صرف برہمنوں کا

* علم و ادب —— Knowledge & Literature

اجارہ قرار دیتی ہے - رفتہ رفتہ کشتریوں اور ویشیوں میں بھی علم و فن کے چرچے ہونے لگتے ہیں لیکن عوام الناس یعنی شودروں کو نہ اتنی حاصل کرنے کی فرصت ہے نہ اجازت - بیچارگی سے قناعت اور اس سے قسمت پرستی عبارت ہے اور پچھلے جنم کے ناکردہ گناہوں کے لیے شرمساری اور اگلے جنم کی کامرانیوں کا خیال خام ان میں رس جاتا ہے - پوری سنسکرت اور ہندی شاعری کو چھان ڈالیے ' اساطیر اور افسانوں کا ورق ورق الٹ جائیے ' شاذ و نادر ہی کہیں عوام کا ذکر آتا ہے اور وہ بھی نفرت و حقارت کے ساتھ - البتہ راجاؤں کو رعایا پروری اور عدل گستری کی تعلیم دی جاتی ہے کیونکہ رعایا کی خوشنودی ہی قیام حکومت کی ضامن ہے - سنسکرت کے قواعد ادب اسے لازم قرار دیتے ہیں کہ ہر ادبی تصنیف دیوتاؤں کے علاوہ حکومت اور برہمن جماعت کی دعاے خیر کے ساتھ شروع ہو - برہمنوں کی خداداد برتری اور کشتریوں کے اختیار حکومت کو بار بار دوہرایا جاتا اور ان سے سرکشی کرنے والوں کو جہنمی اور لعنتی قرار دیا جاتا ہے - شودروں کو بار بار ٹوکا جاتا ہے کہ اونچی جاتیوں کی خدمت ان کا فرض منصبی اور دین و ایمان ہے - منیوں اور دیوتاؤں کی نگۂ کرم ہمیشہ روح اور جسم کے خداوندوں کے لیے مخصوص ہے اور ہندو ادب ان کی مدح و ثنا سے لبریز ہے - ' شرنگار رس ' اور ' شانت رس ' سنسکرت شاعری پر چھاے ہوے ہیں کیونکہ ایک ابھروں کے صنفی رجحان کو پرچاتا اور دوسرا بوڑھوں کے احساس گناہ کو کم کرتا ہے - خود فریبی کا یہ عالم ہے کہ فضا ٹریجیڈی کے تذکرے تک کی متحمل نہیں اور اسے منحوس سمجھتی ہے ' چنانچہ ہر سنسکرت ٹریجیڈی خواہ مخواہ کامیڈی میں منتقل کردی جاتی ہے !

اس سماج کا یہ طبقہ کس حد تک عیش و طرب میں ڈوبا ہوا بزم کی رنگینیوں کی داد دے رہا تھا، اس کا اندازہ لگانے کے لیے اس زمانے کے ادب کو دیکھیے - اکثر سنسکرت افسانے مثلاً 'دش کمار چرتر' بیتال پنچشت (بیتال پچیسی) اور 'مرچھہ کٹکا' (مٹی کی گاڑی) وغیرہ ڈرامے بد اخلاقی' اوباشی اور قابل نفرت جنسی فساد سے بھرے پڑے ہیں - شاعر اور ادیب انھیں یوں مزے لے لے کر بیان کرتا ہے گویا زندگی کے فرائض یہیں ختم ہو جاتے ہیں - عشقیہ شاعری کے لیے جو ہم معنی لفظ 'شرنگار' ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ محبت اور بوالہوسی میں کوئی امتیاز نہ تھا - ہندو اصناف سخن میں 'نائیکہ بھید' اور نکھ شکھ ورنن یعنی اقسام معشوق کی شرح اور معشوقہ کے سراپا کو جو مرتبہ و مقبولیت حاصل ہے وہ اس کی شہوت پرست ذہنیت کا پرتو ہے - نائیکہ بھید میں جس تجسس اور انہماک سے صرف کنواری ہی نہیں بلکہ شادی شدہ عورتوں کی بدکاریوں کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ ظاہر کرتا ہے کہ اس فضا کا اخلاقی معیار کیا تھا - شعر و ادب اس فضا کے لیے قوت باہ کی گولیوں کا کام انجام دیتے تھے - اس زمانے میں طبقۂ امرا کی حالت کیا تھی اس کا اندازہ لگانے کے لیے مہابھارت کے کچھ واقعات پر غور کرنا دور از مبحث نہ ہوگا ـــ

جب ارجن نے کرشن جی کی بہن سبھدرا سے بیاہ کیا تو انھیں جہیز میں ایک ہزار حسین و جمیل دوشیزائیں دی گئیں! یودھشٹر نے جب 'راجسویہ یگیہ' کیا تو انھیں راجاؤں نے ایک لاکھ حسیناؤں کے پارسل بھیجے! کرشن جی کی ۱۶ ہزار گوپیوں کا قصہ ممکن ہے کہ مبالغہ ہو لیکن مہابھارت اور بھاگوت میں ایسے صدہا واقعات موجود ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے حرم میں ہزاروں عورتیں رہتی تھیں - یہی نہیں یودھشٹر کے

'دھرم راج' میں ۸۸ ہزار طلبا کی ضروریات حکومت کی طرف سے مہیا کی جاتی تھیں اور ان میں سے ایک اہم جنس یہ تھی کہ ہر طالب العلم کی خدمت کے لئے ۳۰ دو شہزادیں مقرر تھیں - لطف یہ ہے کہ مہابھارت کا مصنف کہیں اشارتاً بھی اس شہوانی گرم بازاری کے خلاف ایک لفظ نہیں کہتا - یہ تو مشتے نمونہ از خروارے ہے ورنہ عہد قدیم اس قسم کی بزم آفرینیوں سے جگمگا رہا ہے ! اس زمانے کے لوگ تاریخ نویسی سے بے بہرہ تھے' شعر و ادب میں ہی راوی نے چٹخارے بھر بھر کر یہ کہانیاں سنائی ہیں - یہ اس زمانے کی زندگی کا بزمیہ پہلو اور عشقیہ شاعری میں اس کا عکس ہے - اب ششوپال ودہ راماین وغیرہ رزمیہ نظموں کو دیکھیے - قتل و غارتگری کا کوئی اثر قسم کھانے کے لیے شاعر پر نہیں ہوتا - حتیٰ کہ والمیک اور تلسی داس تک لنکا کی تباہی اور لاکھوں انسانوں کے تہ تیغ ہونے پر اظہار تاسف نہیں کرسکے بلکہ بیواؤں کی آہ اور یتیموں کی فریاد پر یہ لوگ خندہ زن ہیں !

ملک کی آبادی کا ۹۵ فی صدی حصہ کسانوں پر مشتمل ہے لیکن میں نے آج تک کسی قدیم سنسکرت یا ہندی تصنیف میں ان کے حالات نہیں دیکھے - جابجا درندوں اور پرندوں کے رنج و راحت کا حال ہے لیکن کسانوں کا نام تک کہیں نہ ملے گا - کبھی کوئی نیک طینت وزیر راجا کے آگے "پرجا" کی تکالیف کا دکھڑا روتا ہے یا کوئی راجا خیرات کرتا ہے تو احساس ہوتا ہے کہ اس ملک میں 'رعایا' نام بھی کوئی چیز تھی - ورنہ 'ماہیوں' 'راجاؤں' بنیوں اور حسینوں کے تذکرے اس کثرت سے ملینگے کہ یقین سا ہوجاتا ہے کہ اس جنت نشان میں ان کے علاوہ اور کوئی نہیں رہتا تھا !

کالیداس اس عہد کا مایۂ ناز ادیب اور شاعر ہے - اس کی سحر طرازی اور جادو بیانی کا لوہا مشرق و مغرب میں سب نے مانا ہے - منظر کشی اور تصویر نگاری میں وہ اپنا مقابل نہیں رکھتا - ایشیا کے شاعروں پر بجا طور پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ان کا پیمانۂ کلام تناسب سے دور ہوتا ہے - ایک کالیداس ہے جس کا ایک ایک لفظ نگینے کی طرح جہاں جم گیا وہاں سے اُٹھ نہیں سکتا - کالیداس کی یہ حیثیت ہمیشہ قائم رہے گی - لیکن ماحول کا جیسا اثر جذبات پر پڑتا ہے اس کی سبق آموز مثال بھی شاعر ہے ہمتا ہے - اس کے آگے انسانیت کا مقصد اگر کچھ ہے تو محض یہ کہ نیک دیوتاؤں، رحم دل راجاؤں اور ہٹ دھرم رشیوں کی پوجا کرے - شکنتلا میں جا بجا برہمنوں کی عظمت کا اعلان کیا گیا ہے 'رگھوونش' میں رام چندر جی کے اجداد کی فوج کشی اور بزم آرائی کا ذکر ہے - قدرت کے استبداد اور سماج کے مظالم کے خلاف وہ بھی کچھ نہیں کہتا اور اس کے کردار ایک ہی طبقے میں رہتے اور ایک ہی ماحول میں پرورش پاتے ہیں —

کیونکہ 'ویدک' عہد میں آرام و آسائش کے سامان کم تھے اس لیے اس زمانے کی شاعری بھی تصنع سے پاک ہے - رفتہ رفتہ جاہ و حشمت کے طلسم کھڑے ہوتے اور عیش و طرب کے نئے نئے سامان مہیا کیے جاتے ہیں - ادب و شعر اس عروج یا زوال کی جو تصویر کھینچتے ہیں اس میں معنی آفرینی کی جگہ ندرت بیان اور لفظی بندشیں لے لیتی ہیں - یہ امر قابل غور ہے کہ علم بیان و معانی کے لیے سنسکرت میں 'النکار' کا لفظ ہے جو 'زیور' کا ہم معنی ہے - عبارت آرائی و رنگین بیانی کو اتنی اہمیت دی جاتی ہے کہ ادب آخر میں پہیلیاں بجھوانے لگتا ہے - چنانچہ 'بان بھٹ' کا کمال یہ ہے کہ الفاظ کو یوں ترکیب دیتا ہے کہ ایک ایک لفظ ۲۶-۲۹

سطروں تک پھیل جاتا ہے اور تشبیہ و استعارے کے بیان میں اتنی بلند پروازی کرتا ہے کہ مطالب چیستاں بن کر رہ جاتے ہیں - ایک خاص صنف سخن 'بھرمر چھند' ہے جس کی مثال مہا بھارت اور سورداس وغیرہ کے ہندی کلام میں ملے گی - اب تک سخن سنجوں میں یہ بحث ہوتی ہے کہ ان سے شاعر کی مراد کیا ہے - غرض ایسے لفظی تکلفات سے وہ تمام شاعری بھری پڑی ہے اور ہونا بھی یہی چاہیے تھا - شاعر کے مشاہدات اور احساسات اسے آگے بڑھنے کی اجازت کیوں کر دیتے - ایک خاص بات یہ ہے کہ اس زمانے میں شاعر روح اور جسم میں کوئی امتیاز نہیں کرسکتا اور نہ دوئی کے پردے کو چاک کرنے کی سعئی رائیگاں میں وقت گنواتا ہے - وہ اس زندگی اور اس کی لذتوں کے لیے زندہ ہے اور اسی وجہ سے 'بھرتھری' جیسے دو چار بیراگیوں کو چھوڑ کر حزنیاتی رنگ کم ملے گا اور تصوف کا تو کوسوں پتا نہیں ہے !

'پنچ تنتر' 'ہتوپدیش' اور 'مدرا راکشس' وغیرہ میں ہمارے لیے ایک جہان عبرت پنہاں ہے کیونکہ ان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد کے طبقۂ امرا اور علماے سو کا اخلاق کتنا پست اور انسانیت سوز تھا - مگر افسوس تو اس پر ہوتا ہے کہ شاعروں اور ادیبوں نے اپنے ذمے یہ خدمت لے لی تھی کہ ان بدعنوانیوں کو ایسی ساحرانہ رنگ آمیزی سے بیان کریں کہ دیکھنے والا نفرین کے بدلے آفرین کہے اور کفِ حسرت ملے کہ ہم ان محفلوں میں کیوں نہ شریک ہوسکے !

مسلمانوں کی فتوحات کے بعد ہندو سماج کی ذہنیت جس طرح بدلی اُس کے دو بین اثرات ہندی شاعری میں موجود ہیں - ایک تو رزمیہ اور جوشیلی نظموں کی مقبولیت - 'پرتھوی راج راسو' 'همیر راسو

اور "آلہا اودل" وغیرہ اس زمانے کی نظمیں ہیں - بعد میں اورنگ زیب عالمگیر کے عہد حکومت میں جب ہندوؤں کے خفتہ جذبۂ قومیت میں ہیجان پیدا ہوا تو شیواجی اور درگاداس جیسے سورماؤں کے ساتھ 'بھوشن' اور "رام داس جیسے شاعر بھی پیدا ہوے جنھوں نے مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں میں بڑا اشتعال پھیلایا - پچھلے دنوں جب اس ملک میں ہندو مسلم فساد کی آندھی امنڈی تھی تو یہ دونوں فرقہ پرست شاعر قبر میں کروٹ بدلنے لگے تھے —

ہندو مذہبی پیشواؤں کے آگے یہ مسئلہ بھی پیش تھا کہ اسلام کے نرغے سے ہندو عوام کو کس طرح بچایا جاے جو برہمنوں اور پنڈتوں کی دست برد سے عاجز تھے - اس جد و جہد کا اظہار شاعری میں کبیر داس 'دادو دیال' اور تکارام وغیرہ بھگت شاعروں نے کیا - انہوں نے روزمرہ کی زبان میں سمجھایا کہ سارے فساد مذہبی دلالوں کی وجہ سے شروع ہوتے ہیں اور بھگوان کی نظر میں سب انسان برابر ہیں - کبیر داس ہندوستانی جنتا (Masses) کا پہلا اور سب سے بڑا شاعر تھا جس نے امیروں اور پنڈتوں سے بے نیاز ہوکر عوام میں خودداری اور خود احساسی کے جذبات پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی - کیونکہ وہ اور اس کے معاصرین امیروں کی نہیں بلکہ غریبوں کی زبان میں گفتگو کرتے ہیں' اس لیے ان کا کلام ہر طرح کے الٹے تللوں سے پاک ہے - یہ صحیح ہے کہ گوشہ نشین اور سادھو منش ہونے کی وجہ سے یہ شعرا موت کو زندگی پر ترجیح دیتے اور لوگوں کو زندگی کی تگ و دو سے الگ رہنے اور جسمانی تفکرات سے بے پروا رہنے کی نصیحت کرتے ہیں - چنانچہ کبیر داس ایک جگہ مارتن لوتھر سے ہمنوا ہوکر کہتا ہے کہ پرجا راجا بن جاے تو دنیا کا کام کیسے چلے گا؟

روحانی تسکین کے لیے وہ جسمانی تسکین کو ضروری نہیں سمجھتا —

عشقیہ شاعری کا عنصر هندو ادب پر اب بھی اتنا هی غالب هے جتنا عهد قدیم میں - بنگال میں 'چنڈی داس' بہار میں ودیا پتی اور برج بھاشا میں بہاری 'دیو' متی رام وغیرہ سماج کی اس بے حرکتی اور بے حسی کے نقاش هیں جو مسلمانوں کے آنے اور یہاں جم جانے کے بعد پیدا هوگئی تھی - پھر بھی ان میں سے اکثر فطرت اور عوام کے قریب رهتے هیں' اردو شاعروں کی طرح نوابوں اور معشوقوں کے در پر نہیں پڑے رهتے' لہذا ان کا عشق ایسا بیہودہ نہیں جیسا ان کے مسلمان متاخرین کا - تاهم کوئی نصب العین اور مسلک نہ هونے کی وجہ سے یہ لوگ بھی' کرشن' اور گوپیوں کے تذکرے سے آگے نہیں بڑھتے جس سے ان کا محدود زاویۂ نگاہ ظاهر هوتا هے - میرا خیال هے کہ اگر 'کرشن جی' پیدا نہ هوتے تو شاید قدیم هندی شاعری کا بڑا حصہ نہ لکھا جاتا - یہ هندو طبقۂ امرا کی ذهنیت کا اظہار هے جسے بڑھاپے میں اپنے بچپن کے افسانے سننے میں لطف آتا هے - رام اور کرشن کی فتوحات میں یہ لوگ ظالموں کی شکست کا خواب دیکھہ رهے هیں —

اردو ادب کے دور قدیم پر کچھہ کہنے سے پہلے دو تین باتیں یاد رکھنی ضروری هیں - ایک یہ کہ اردو ادب کا پیش منظر ایرانی هے - عروض' بیان' معانی' تشبیہ و استعارات اور اساطیر هی نہیں تقریباً تمام اردو شعرا کی ذهنیت بھی غیر ملکی هے - معلوم هوتا هے کہ کوئی ایرانی دس سال عرب میں رهنے کے بعد هندوستان آیا اور یہاں کی زبان میں شاعری کرنے لگا - وجہ ظاهر هے - مسلمان حکمراں طبقے اور عوام کے مابین ایک سد سکندری قائم تھی - حضرات شعرا میں سے کم ایسے

ہوے ہیں جو دیہاتوں اور جنگل پہاڑوں کی سیر کرچکے ہوں - شہروں میں اور وہ بھی محبوب کی گلیوں اور نوابوں کے آستانوں میں ان کی عمریں گزر جاتی ہیں - 'درد' اور 'نظیر' جیسے شاعر کم ہوے کہ جنھوں نے شاعری کو اپنا پیشہ نہ بنا لیا ہو - جب شاعری ایک جنس سمجھہ لی جاے تو اُسے بازار کے خرید و فروخت کے اصولوں کے ماتحت رہنا پڑتا ہے اور چونکہ اس کے خریدار صرف دولت مند ہوتے ہیں لہذا ان کے ذوق و طبیعت کا پاس لازمی ہے ورنہ میر تقی میر کی سی حالت ہوجاے - اب درد جیسے صوفیوں کو دیکھیے کہ دنیا سے الگ رہتے اور نظم میں عبادت کرتے ہیں - ممکن ہے کہ حیات بعدالموت کے مسائل کے لیے اُن کی راہبانہ شاعری مفید ہو ورنہ جہاں تک اس زندگی اور اس کے ارتقا کا سوال ہے ' اس قسم کی شاعری 'کرم' اور 'قسمت' کے اصولوں کی طرح عوام کے لیے مضر اور جوش عمل کے حق میں نشہ آور ہے —

اردو شاعری کا ایک بڑا حصہ قصائد پر مشتمل ہے جن پر کچھہ کہنا لا حاصل ہے - قصیدہ خواں شاعر ایک ایسا مصاحب ہے جو مقفیٰ تک بندی کرلیتا ہے - غزل گوئی میں اظہار واردات کا دائرہ اتنا محدود رہ جاتا ہے اور قافیہ و ردیف کے ساتھہ کیفیت کی یک رنگی کا وہ عالم ہوتا ہے جیسے کوئی مشین ایک رفتار سے ایک سی آواز کرتی چلی جاتی ہے - اب ان معمول اور متوسط طبقوں کے ماحول کو دیکھیے جس میں لوگ روز ایک ہی طرح کے کام کرتے ہیں - ان کے مشاغل اور دلچسپیوں میں کبھی فرق نہیں آتا تھا - آمد و رفت کے ذرائع کم ہونے کی وجہ سے سفر کی نوبت بھی کم آتی تھی - نہ اخبارات شائع ہوتے تھے اور نہ خطوط آسانی سے آجاسکتے تھے تاکہ باہر کے حالات معلوم ہوسکیں - اس بے رنگ و بو

زندگی کی جھلک غزل کی مقبولیت کی صورت میں نمایاں ہوئی۔ معشوق سے ہم کلام ہونا ــ یہ دوسری بات ہے کہ وہ عرش آشیاں تھا یا فرش نشیں ــ اردو شاعر کا سب سے اہم فریضہ تھا! بجز مثنوی اور مرثیے کے دوسرے اصناف سخن کی زبوں حالی اس طبقے کی کم نگہی اور محدود خیالی کی دلیل اور اس بات کا ثبوت ہے کہ اس زمانے کی اردو شاعری امیروں کی تفریح کے سوا کوئی کام انجام نہ دے سکی۔ اس میں دو رجحانات زیادہ واضح ہیں۔ ایک تو 'معشوق حقیقی' سے خطاب اور جسم کی قید سے آزادی کے لیے روح کی بے کلی۔ یہ صوفیوں کی ترجمانی ہے جو نام نہاد مسلمان امرا کی عیش کوشی اور منافقت سے تنگ آکر دنیا سے بیزار ہوگئے اور ایک جہان نو کی طرح ڈالنے لگے۔ غربت اور افلاس کی وجہ سے جن شاعروں کی پہنچ محفل جاناں میں نہ ہوسکتی تھی' انہیں بھی اچھا بہانہ ہاتھ آیا اور وہ جمال باری کے آئینے میں جلوۂ یار دیکھنے لگے!

فتح ہند کے بعد ہی مسلمان امرا اور علما میں تنازع شروع ہوگیا تھا۔ مذہبی جماعت امور سلطنت میں دست اندازی کی متواتر کوشش کرتی رہی جس میں اسے سخت ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ مولویوں نے رئیسوں کو احتساب کی تلقین کی بلکہ کئی مرتبہ مے خانوں پر پہرے بھی لگادیے' جس کی وجہ سے عیش پسند اور رند مشرب ان سے سخت ناراض رہنے لگے۔ چنانچہ فارسی اور اردو شاعری میں عام طور پر محتسب' زاہد اور شیخ کی جس بری طرح خبر لی گئی ہے شاید بوالہوس شاعروں نے سرمایہ دار معشوقوں کو بھی اتنا نکو نہ بنایا ہوگا۔ در اصل یہ اس ماحول کی رند روشی اور احتساب و شریعت کی پابندی سے بیزاری کا اظہار ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ عہد وسطیٰ میں عموماً اور اورنگ زیب کے بعد خصوصاً

مسلمانوں کے زوال کے ساتھہ سماج میں ایسی ابتری پھیل گئی جس کی مثال نہیں ملتی - دلی اجڑنے لگی اور لکھنؤ کی چمن بندی شروع ہوئی - نادر شاہ ابدالی اور مرہٹوں کے حملوں نے دلی کو جیسا خستہ و خراب کیا اس کا اضمحلالی اثر میر درد اور دلی اسکول کے دوسرے شاعروں پر کم و بیش نمایاں ہے - لکھنؤ کی خوشحالی اور خوش باشی کا اثر وہاں کے شاعروں پر جیسا کچھہ پڑا اس کے آئینہ دار 'امانت' 'رشک' 'رند' اور جان صاحب' وغیرہ ہیں - 'آتش' ان سے کسی قدر الگ ہے کیونکہ دوسرے لکھنوی شاعروں سے اس کی زندگی مختلف ہے —

تمام ہندوستانی شعرا زندگی سے کتنے بے خبر اور بے پروا تھے' ان کے جذبات کتنے اوچھے اور احساسات کتنے بے حقیقت تھے' اس کا اندازہ لگانے کے لیے چشم عبرت کی ضرورت ہے - پلاسی کی لڑائی کتنا بڑا قومی سانحہ تھا' پانی پت کی تیسری لڑائی ہندو طاقت کے لیے پیام موت تھی' ٹیپو سلطان کی شکست مسلمانوں اور ہندوستانیوں کے تنزل کا اعلان تھا - اور ان سب سے اہم سنہ ۵۷ ع کا سانحہ تو ہندوستانی سماج کی بربادی کا پیش خیمہ تھا - کتنے شاعروں نے ان خونچکاں واقعات کو نظم کیا؟ کتنے نوحے لکھے گئے؟ کہاں تھے وہ رجز گو مرثیہ خواں جن کی جادو بیانی سے محرم کی ہر محفل ماتم کدہ بن جاتی تھی؟ کسی بڑے شاعر نے پلاسی کی لڑائی * پر ایک نوحہ نہ لکھا - واقعۂ سنہ ۵۷ع پر داغ کا شہر آشوب اور غالب کے خطوط پڑھیے اور سر پیٹ لیجیے کہ جب پورے ملک کی قسمت

* گذشتہ صدی کے آخر میں جب بنگالیوں میں قومیت کا احساس پیدا ہونے لگا تو اس سانحے پر ان کے شیریں مقال شاعر نوین چندر سین نے ایک ولولہ انگیز نظم بعنوان " پلاسیر یودھ " لکھی - اسی طرح اس موضوع پر بنگال کے مشہور شاعر نذر الاسلام نے بھی ایک نظم قلمبند کی ہے واقعہ سنہ ۵۷ ع پر منیر شکوہ آبادی کے کچھہ کلام اور شاہ ظفر کی کچھہ غزلوں کو مستثنی سمجھنا چاہئے -

کا فیصلہ ہو رہا تھا، یہ حضرات اپنی روٹیوں کے سوا کچھ نہ سوچ سکتے تھے اور سوچتے تھے تو ایسے بزلادنہ اور رجعت پرورانہ طریقوں سے جو زندگی اور شاعری کے لیے باعث ننگ ہیں —

اس ادب کی مثال امربیل سے دی جاسکتی ہے جو اسی درخت کو فنا کرتی ہے، جس پر پرورش پاتی ہے - کیونکہ عہد قدیم کے تمام شاعر پیشہ ور تھے اور نوابوں اور راجاؤں کے منت کش تھے لہذا امیروں کے مفاد سے اُن کا اثر پزیر ہونا لازمی تھا - اُن کی خوشنودی کے لیے اُن کی زبان میں بولنا بھی ضروری تھا اور بعد میں تو زبان دانوں کے معرکے بٹیروں کی پالی کی طرح عام ہو گئے - اردو زبان میں بال کی کھال جس طرح نکالی گئی شاید اس کی مثال دنیا میں اور کہیں نہ ملے گی - معنی پر زبان کو ترجیح دینا، اس طبقے اور اس کے لگے لپٹوں کے جھوٹے نظریۂ زندگی کا ثبوت ہے جو نظام زندگی پر سانپ کی کینچلی کی طرح چھائے ہوئے تھے - اس صورت حال کو دیکھ کر طالسطائی کے اس خیال سے اتفاق کرنا پڑتا ہے کہ "ہمارے سماج میں لوگ اکثر کہا کرتے ہیں کہ اگر کوئی آرٹسٹ فکر معاش سے آزاد ہو جائے تو زیادہ بہتر کام کر سکتا ہے - یہ خیال میرے اس دعوے کی پرزور تائید کرتا ہے کہ ہم جس چیز کو آرٹ سمجھتے ہیں وہ ہرگز آرٹ نہیں بلکہ اس کی پرچھائیں ہے! آرٹ اور صنعت میں بڑا فرق ہے - آرٹ فن کار کے ہیجانات کو دوسروں تک منتقل کرنے کا ایک ذریعہ ہے - ہیجان اسی آدمی میں پیدا ہوگا جو ایک معمولی انسان کی طرح اپنی فطری زندگی کے ہر پہلو کو نشو و نما حاصل کرنے کا موقع دیتا ہے - اگر فن کاروں کو مفت کی روٹیاں ملیں تو ان کی تخلیقی قوت برباد ہو جائے گی - کیونکہ پھر قدرت اور سماج سے خود حفاظتی کے لیے وہ کیسے لڑیں گے

اور ان مصائب کو کیوں کر سمجھیں گے جن سے فکر معاش میں ہر فرد بشر کو دوچار ہونا پڑتا ہے - اس طرح وہ سب سے اہم ہیجانات سے محروم رہ جاتے ہیں جو ہر آدمی میں کم و بیش موجود ہیں اور انفرادیت کے ارتقاء کے لئے ناگزیر ہیں - آج ہمارے سماج میں آرٹسٹ جس عیش و اطمینان کی زندگی بسر کرتا ہے ' اس سے زیادہ مضر ماحول کسی فنی تخلیق کے لئے ہو نہیں سکتا —

اردو شاعروں میں 'درد' اور 'نظیر' جیسے معدودے چند لوگوں کو چھوڑ کر باقی سب لوگ وظیفہ خوار تھے - 'درد' دنیا سے بیگانہ اور 'میر' اپنی ناکامیوں کی وجہ سے زندگی سے بیزار ! اس لحاظ سے دونوں زندگی کے لیے ضروری جذبات کے اظہار سے اجتناب برتتے ہیں - افسردگی ' رہبانیت اور حزنیت کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے' بد نصیبی اور ناکامی کے گلے ہیں ' حسرت و یاس کے افسانے ہیں - زندگی کی کش مکش سے الگ رہنے اور فطرت سے محظوظ نہ ہو سکنے کی وجہ سے ان حضرات کو برائیوں کے سوا کہیں کچھہ نہیں دکھائی دیتا - چونکہ میں اظہار جذبات کو جذبات پر ترجیح نہیں دیتا ' اس لئے پہلے یہ دیکھتا ہوں کہ شاعر کہتا کیا ہے ' کیسے کہتا ہے کا سوال بعد میں آتا ہے -' نظیر ' کے یہاں حسن بیان کی کمی اور عامیانہ جذبات کی زیادتی ضرور ہے جس کی وجہہ اس کی آوارہ اور خانہ بدوش زندگی ہے - لیکن پورے اردو ادب میں وہی ایک ایسا شاعر ہے جو عوام کے ساتھہ رہتا ' انہیں سمجھتا اور اُن کے تاثرات کو انہیں کی زبان میں بیان کرتا ہے - اس زمانے کی زندگی کا معیار اتنا جاہلانہ تھا کہ ادیب سے زیادہ توقع نہیں کی جا سکتی - اگر وہ اپنے زمانے کی صحیح تصویر پیش کردے اور ساتھہ ہی قلب میں جذبۂ درد مندی رکھتا ہو تو

بہت ہے - اس لحاظ سے نظیر تلسی داس اور کبیر داس سے پیچھے ہے - تاہم وہ ایک عام شہری کی نظر سے دنیا کو دیکھتا اور اپنے آئینۂ زندگی میں وہ تمام خرابیاں دکھاتا ہے جو اسے نظر آتی ہیں - طور اور نجد کے تذکرے اُس کے کلام میں ناپید ہیں - وہ بوڑھوں ' غریبوں اور فقیروں کے ساتھہ رہتا اور انہیں قوت گویائی بخشتا ہے - افسوس کہ نظیر محنت کش نہ تھا ورنہ اس کا زاویۂ نگاہ بلند ہوتا - اپنی تمام برائیوں کے باوجود ہندوستان کے ادب قدیم میں اسے ایک خاص مرتبہ حاصل ہے - کبیر عوام کا مصلح ہے تو نظیر ان کا یار غار ہے - کاش یہ دونوں فقیر نہ ہوتے!

چند صفحات میں ہزاروں سال کے ادب کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا - ہم نے اپنے تجزیہ کے مطابق یہ اصول قایم کیا تھا کہ ادب جذبات کا اظہار ہے اور جذبات ماحول سے متاثر ہوتے ہیں - اچھے جذبات اچھے ماحول کے محتاج ہیں - پھر یہ بھی دیکھا کہ زندگی ارتقا بالضد کے زینوں سے شاہراہ ترقی پر گامزن ہے اور ادب اس وقت تک زندگی کا آئینہ دار نہیں ہو سکتا جب تک اس کا ہمدوش نہ ہو - ادیب کا فرض ہے کہ ماضی کے عیوب سے حال کو باخبر کرے اور حال کی تصویریں کھینچے کہ اس میں مستقبل کے لیے اشارات پنہاں ہوں - جب ہم نے اس روشنی میں ہندوستانی ادب کو دیکھا تو مایوسی اور شرمساری کے ساتھہ ہم گورکی سے ہم آہنگ ہو کر چیخ اٹھے کہ " ماضی کے بت کو پوجنے والے شاعرو حال کی برائیوں کو چھپانے والے ادیبو اور مستقبل پر تاریکی کا پردہ ڈالنے والے افسانہ نگارو مت جاؤ ورنہ تاریخ تمہیں مٹا دے گی ! "

اردو شاعری کے عیوب کے لیے کئی اسباب ذمہ وار تھے - ایک یہ کہ وہ اس زمانے میں پھولی پھلی جو مسلمانوں کی حکومت اور سامنتی تمدن

کے زوال کا دور تھا - جس طبقے نے اسے گود لیا وہ خود قعر مذلت میں پڑا ہوا تیزی سے بربادی کی طرف چلا جا رہا تھا - پھر اس کی تربیت ایسے ہاتھوں سے ہوئی جنھوں نے نان بائی کی دکان کی طرح اسے اپنی روٹی کمانے کا وسیلہ بنا لیا - یہ تو تھا ہی ساتھ ساتھ ایک تنگ نظر سوسائٹی میں پرورش پاکر اس نے اپنے لیے عرصہ حیات تنگ کر لیا - سماج کے دباؤ اور اپنی کوتاہ بینی کی وجہ سے شاعر بہت کم موضوعات پر لکھ سکتا تھا - ادب کا پودا آزادی کی ہوا میں ہی پروان چڑھے گا - پھر یہ بھی ہے کہ پودے کی بیجا سختی اور جنسی تشدد کی وجہ سے گلوے تغزل میں پھانسی کا پھندا سا پڑگیا - اردو شاعری کی معشوقہ — اگر ایسی کوئی چیز ہے تو — ایک ہرجائی طوایف ہے اور سوچئے کہ اس سے کسی قسم کا لگاؤ شاعری کی نازک روح پہ کس قدر گراں ثابت ہوگا —

اس تجزیہ سے کسی کی تنقیص یا تضحیک مقصود نہیں - اس بحث کا ماحصل صرف یہ ہے کہ زندگی کی حفاظت اور ترقی کا مسئلہ سب سے زیادہ اہم ہے اور کسی چیز کو اس پر فوقیت اور برتری نہیں دی جا سکتی - ادب زندگی سے عبارت ہے نہ کہ زندگی ادب سے - ادب کے نام پر جو چیز انسان کو زندگی سے بیزار ہونے کی تعلیم دیتی ہے انسان کو فوراً اس سے بیزار ہوجانا چاہیے - سچ پوچھا جاے تو اس دور کے تقریباً تمام آرٹسٹ ضائع ہوے ہیں - اس وقت تک صحیح معنوں میں آرٹ کا ارتقا ہوا ہی نہیں - کالیداس، کبیر، نظیر اور غالب وغیرہ کے سوا شاید کوئی ایسا شاعر نہیں جسے مستقبل کا انسان عزت سے یاد کرے گا —

ہندوستانی ادب کے دور جدید کا معاشی تجزیہ



ہندوستانی ادب کے دور جدید پر ہم زیادہ تفصیلی نظر ڈالیں گے کیونکہ اس کا براہ راست ہماری نسل سے تعلق ہے اور اس کی ترکیب و تدوین ہمارے ہاتھوں ہو رہی ہے —

اشاروں اشاروں میں پہلے ہم یہ دکھلا چکے ہیں کہ سماج کی بنیاد افراد کے اقتصادی تعلقات پر منحصر ہے اور ان کے رشتۂ مادی کے اعتبار ہی سے کسی دور کی ذہنی و روحانی تحریکات کو سمجھا جا سکتا ہے - علاوہ بریں، ادب اب تک تعلیم یافتہ طبقے کا اجارہ رہا ہے اور اس کی گہرائیوں تک پہنچنے کے لیے اس طبقے کے رجحانات کو پہچاننا بے حد ضروری ہے - سچ پوچھو تو ہمارے ادب کے سر چشمہ سے جو نئی نئی نہریں کٹ رہی ہیں وہ دراصل متوسط طبقے کی حالت کا پتا دیتی اور اس ذہنی رد عمل کو ظاہر کرتی ہیں جو ایک طرف تو حرفتی اور سامنتی تمدن کی کش مکش اور دوسری طرف ہندوستانی قومیت یعنی دیسی حرفت اور غیر ملکی ملوکیت کے تصادم کی وجہ سے ان میں پیدا ہو گئی ہے —

سنہ ۱۸۵۷ کے بعد انیسویں صدی کے اواخر تک ہندوستانیوں کی ذہنیت میں سرعت سے ایک انقلاب ہوتا رہا کیونکہ انسان جب اپنے مادی

حالات میں رد و بدل کے لیے مجبور ہوتا ہے تو ان کے قبول کرنے کے لیے تاویلیں بھی پیدا کرلیتا ہے۔ مسلمان حکمراں طبقہ جو ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت سے برسرپیکار رہ کر انحطاط پذیر ہوچکا تھا اب اس کی پذیرائی کے لیے مجبور ہوا۔ چنانچہ علی گڑھ تحریک در حقیقت نئی تہذیب کی فتح کا اعتراف تھی۔ پچاس سال پہلے راجہ رام موہن رائے نے بنگال میں جو تحریک شروع کی تھی سرسید نے اب اس کی تجدید مسلمانوں میں کی اور دونوں کا رد عمل قومی زندگی پر تقریباً ایک سا ہوا۔ جب نئی تہذیب کے نشے میں سرشار ہوکر ایک دو نسلیں بنگال میں نکل چکیں تو وہاں کے اکابر کو یکایک محسوس ہوا کہ انگریزی زبان اُن کی زندگی میں ناسور ڈال رہی ہے، درآں حالیکہ ناسور پہلے سے موجود تھا جسے یہ مغربی نشتر اب ابھار کر دکھا رہا تھا۔ سرکاری نوکریوں میں فرقہ وارانہ تمیز کی وجہ سے آہستہ آہستہ ہندو مسلم کی تفریق بڑھتی گئی۔ ادھر زندگی کے نئے نظریوں نے قدامت کا قلع قمع شروع کیا اور ضرورت ہوئی کہ پرانی شراب نئی بوتلوں میں ڈھالی جائے اور اس پر جدت کی چھینٹیں چھڑکائی جائیں۔ فرقہ وارانہ تفریق کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ دونوں قومیں اپنی برتری ثابت کرنے کے لیے اپنی اپنی معاشرت اور تاریخ کے تاریک پہلو کو چھپائیں، اپنے ماضی کو بڑھا چڑھا کر دکھائیں اور ساتھ ساتھ نئی روشنی کے حملوں سے بچنے کے لیے جدید کو اپنے مشق ستم کا ہدف اور 'قدیم' کو تمام خوبیوں کا منبع ثابت کریں ـــ

چھکن اور گھٹنے کے ساتھ مسلمان متوسط طبقے نے طلسم ہوشربا اور اندرسبھا کا بانا بھی چھوڑا اور نئے خیالات کے اظہار کے لیے نئے پیرائے نکالے۔ انگریزی تعلیم کی مقبولیت نے ان کے آگے قدرت کے نئے مناظر پیش

گئے اور سماج کے ساتھہ ادب کو بھی پابندیوں سے آزاد کرنے کی کوشش ہونے لگی - نظام حکومت کی تبدیلی نے اس طبقے کو مجبور کر دیا کہ تحفظ حیات کے لیے اپنی ذہنیت کو مادی ضروریات کے لحاظ سے بدلے اور پھر تو اسے یکا یک معلوم ہونا بھی چاہئے تھا کہ مذہب کا وہ تصور غلط ہے جو اسے حرفتی تمدن کے ساتھہ چلنے سے روکتا ہے - زندہ رہنے کے لیے قبل از غدر کی رومانی اور داخلی (Subjective) فضا سے نکل کر واقعیاتی نقطۂ نظر پر آنا ضروری تھا اور اب ادب و زندگی میں بے ربطی اس طبقے کے لئے مضرت رساں تھی - قعر مذلت میں پڑے ہوے مسلمانوں کے جگانے کے لیے بھانیہ اور خطیبانہ انداز اختیار کرنا ضروری تھا - نظم کا عروج اور غزل کا زوال خود فریبی پر خود تنقیدی' تصور پر عقل اور پابندی پر آزادی کی فتح یابی کا ثبوت ہے - نئے جذبات اپنے لیے نئے اصناف تلاش کرلیتے ہیں - ادھر بنگال میں ٹیگور نے پیش پا افتادہ اور پامال بحروں کو چھوڑ کر اپنے لیے ایک نئی طرز کی طرح ڈالی - اس کاوش میں اسے عہد وسطیٰ کے ویشنو شاعروں سے بڑی مدد ملی جو سماج کی پابندیوں کے ساتھہ سنسکرت چھندوں کی قید سے بھی آزاد تھے اور اپنی تیز رفتاری کے لیے نئی راہیں تلاش کرتے تھے - ہندی پر ان دوتحریکوں کا گہرا اثر ہوا اور برج بھاشا کو چھوڑ کر لوگوں نے کھڑی بولی کو اپنایا جو میرے خیال میں سنسکرت آمیز اردو ہے - اسی طرح گجراتی اور مرہٹی میں بھی شاعری نے نیا رنگ روپ اختیار کیا - غرض زندگی کے ساتھہ شاعری کا ظاہر بھی بدلا - اب یہ دیکھیے کہ زندگی کی مختلف النوع تبدیلیوں کے ساتھہ ادب کے موضوعات اور رجحانات بھی کیسے بدل رہے ہیں —

'سرشار' اور 'مولوی نذیر احمد' کے ناول سامنتی تمدن کی پستی کے

دور کا نقشہ کھینچتے ھیں جو اب اتنی نمایاں تھی کہ چشم پوشی سے کام نہ چل سکتا تھا - یہ دونوں حضرات لکھنؤ اور دلی کی زندگی سے خوب آشنا تھے اور ظاھر ھے کہ یہ دونوں شہر مسلمان حکمراں طبقے کے نقش آخر اور اب ان کے انتہائی تنزل کے آثار تھے - سجاد حسین کا اخبار ایک چھوٹے پیمانے پر وھی کر رھا تھا جو 'مولیر نے فرانس میں اور 'سروونٹس' نے اسپین میں صدھا سال پہلے کیا تھا - یہ دونوں سامنتی تمدن کے دور انحطاط میں پیدا ھوتے اور اپنے طنز کے تیروں سے اس کی زندگی دوبھر کر دیتے ھیں - سجاد حسین اور سرشار نے اپنی بساط کے مطابق یہی کیا -

ادھر ھندؤوں اور مسلمانوں کی تفریق نے ان میں فرقہ پرستی کے بیج بو دیئے اور اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ ادب پر مردہ پرستی کی مہر لگ جاے اور دونوں قوموں کے اھل قلم ایک دوسرے پر چشمک زنی شروع کریں - ادب کی زندگی کا نیا دور انگریزی زبان کی رومانی تحریک سے متاثر تھا اور اس جذبۂ قومیت کے اظہار کے لیے رومانی ناول سب سے زیادہ مناسب تھے - چنانچہ بنگال میں 'بنکم چندر' اردو میں مولانا شرر اور مرھٹی میں آپٹے نے ناول نگاری کو نئے طریقے سے چمکایا - بنگال میں انگریزوں کے خلاف نسلی تعصب کے جذبات پھیل رھے تھے اور اس طرح بنکم چندر کے ناولوں میں مسلمانوں کے ساتھ انگریزوں کے مظالم کی بھی داستان ھم پڑھتے ھیں - تعجب کا مقام ھے کہ اس زمانے کا یہ سرکاری عہدہ دار اور خطاب یافتہ مصنف دل میں وہ ولولۂ قومی رکھتا تھا کہ اس کا ایک ناول 'آنند متھہ' بنگال میں نراج (Anarchism) کا محرک اور اس کا گیت بندے ماترم قومی تحریک کا ترانہ بن گیا - 'شرر' اسلامی فتوحات کا قصہ گو ھے لیکن بنکم چندر کی تحریروں سے پیچ و تاب

کھا کر 'منصور موھنا' جیسے ناولوں میں اپنے معاصر کی 'چنچل کماری' کا جواب دیتا ھے - شکر ھے کہ ادب کے سر سے یہ آسیب جلد اتر گیا اور بعد میں صرف اخباری نظموں اور 'افسانہ' کے نام سے منسوب کی جانے والی چیزوں میں اس کا اثر باقی رہ گیا —

حالی کی مسدس نے شاعری میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا اور ان کے ہم عصر اردو اور ھندی کے شاعروں نے اس قسم کی شاعری کو خیالات کی تبلیغ کے لیے بہت موزوں سمجھا - موجودہ دور کے ھندی شاعروں میں 'بابو میتھلی شرن گپتا' کا رتبہ بہت بلند ھے - مسدس سے متاثر ھوکر انہوں نے 'بھارت بھارتی' نامی نظم لکھی جو ھندی میں بے حد مقبول ھوئی - موضوع دونوں کا ایک ھے، دونوں کا رنامۂ اسلاف سنا کر زمانۂ حال کی زبوں حالی کی تصویر کھینچتے اور اپنی اپنی قوم کو پیام عمل سناتے ھیں - مسدس جس کی نقالی ھندی اور اردو دونوں زبانوں میں کی گئی، ادبی انقلاب اور قومی بیداری کی خبر دیتی ھے - اس کے چند سال بعد ھی انڈین نیشنل کانگرس وجود میں آتی ھے اور کچھہ عرصے بعد بنگال سودیشی تحریک شروع ھوتی ھے - یہ قومی اور سیاسی تحریکیں بیداری کے آثار ھیں - ان کے محرک اور موید ایک تو وہ لوگ تھے جو سیاسیات اور حکومت میں شرکت کے طالب تھے یا وہ لوگ جو قومی حقوق یعنی دیسی صنعت و حرفت کی توسیع کا مطالبہ کررھے تھے - ھندوؤں میں عموماً اور بنگال میں خصوصاً قومی خودداری کا احساس بڑھتا جاتا تھا اور سیاسی بیداری کے ساتھہ ادب میں بھی جوش و ولولہ کے اثرات پیدا ھونے لگے تھے - گذشتہ صدی کے اواخر میں جب نیل کی کاشت کے انگریز اجارہ داروں کے مظالم حد سے تجاوز کرچکے تو ایک

بنگالی مصنف کا ڈراما موسومہ 'نیل درپن' ہی تھا جس نے ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک احتجاج کا علم بلند کر دیا اور بالآخر حکومت کو ان شکایتوں کو رفع کرنا پڑا - 'نوین چندر سین' نے پلاشیر جدھ (پلاسی کی لڑائی) کے عنوان سے ایک عدیم النظیر رزمیہ نظم لکھ کر بنگال کو اس خوں چکاں واقعے کی یاد دلائی اور مشہور ڈراماتسٹ ڈی - ایل - رائے نے کئی قومی گیت لکھے جو آج بھی بنگال کے بچے بچے کی زبان پر ہیں —

نئی روشنی اور پرانی روشنی کا تنازع در اصل ہندوستانی سماج کی اس کش مکش کو ظاہر کرتا ہے جو مشینوں کے عروج اور دست کاری کے زوال کی وجہ سے پیدا ہوگئی تھی - ہمارے تعلقات کی نوعیت بدل رہی تھی جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ نظریۂ زندگی بھی بدل جائے - یہ ایک نفسیاتی نکتہ ہے کہ مستقبل کی تاریکی انسان میں ماضی کی پرستش کا جذبہ پیدا کردیتی ہے چاہے وہ بذات خود کتنا ہی تلخ کیوں نہ ہو - جس طرح بوڑھا عہد پیری میں اپنے بچپن کو یاد کرتا ہے درآں حالیکہ یہ یاد بے سود ہے' اسی طرح جب کوئی تہذیب غارت ہوتی ہے تو اس کے نام لیوا زمانۂ قدیم کی مدح سرائی کی صورت میں اپنی شکست کا اعتراف کرتے ہیں - روس میں سامنتی دور کے انحطاط اور سرمایہ داری کی اُٹھان کے ساتھ 'طالسطائی' پیدا ہوتا ہے' انگلستان میں 'رسکن' اور 'کارلائیل' مشینوں کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں' فرانس میں 'روسو' رجعت قہقری کی حمایت کرتا ہے - اس دور کے ہندوستانی ادیبوں میں بھی بڑی حد تک یہ ذہنیت کام کررہی ہے - چونکہ ہندو اور اسلامی تمدنوں کا امتیاز متوسط طبقے میں رہتا آیا ہے اور یہی لوگ ہنوز قومی زندگی کے نگہبان اور علم و ادب کے پاسبان رہے ہیں' اس لیے اپنی اپنی

روایتوں کے لحاظ سے یہ اس جذبۂ شکست کا اظہار کرتے ہیں - 'طالسطائی' جس قسم کے نراج کی تبلیغ کرتا ہے وہ ہندو تمدن کے عہد زریں کی تصویر ہے - عدم تشدد، رہبانیت، مشینوں کا ناس اور اس قسم کی چیزیں ہندو تمدن کے عناصر میں سے ہیں اور ان کے لئے قابل قبول ہیں - اسی وجہ سے 'طالسطائی' کے اصول' 'ٹیگور' کے ادب اور 'گاندھی جی' کی تحریکوں پر ایک گہرا نقش چھوڑ گئے ہیں، حالانکہ میرے خیال میں 'ٹیگور' اس روسی ادیب سے قریب تر ہے - مسلمان ادبا بھی دور حرفت اور مشینوں سے منحرف ہیں لیکن ان کی برائیوں کا حل وہ اسلامی روایتوں کے مطابق تلاش کرتے ہیں - تاہم دور حرفت اور سائنس سے کلیتاً بغاوت اور ماضی کی پرستش اس دور کے ادب کی بڑی خصوصیتیں ہیں - 'اکبر الہ آبادی' 'اقبال' اور 'ٹیگور' جابجا مغربیت کے خلاف مشرقی معاشرت کی طرف سے صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں - خصوصاً 'اکبر' کو ہر پرانی چیز اچھی اور ہر نئی چیز بری معلوم ہوتی ہے - لیکن چونکہ وہ کوئی مفکر نہیں اس لیے اپنے باقی دونوں معاصروں کی طرح موجودہ مسائل کا کوئی حل پیش نہیں کرسکتا —

ادب ہند کے موجودہ رجحانات کو سمجھنے کے لیے سرسری طور پر یہ دیکھ لینا چاہئے کہ انیسویں صدی کے اواخر سے ملک میں کیسی کیسی تحریکیں بنتی اور بگڑتی رہی ہیں —

دیسی سرمایہ داروں کی تحریک بنگال کی سودیشی تحریک سے شروع ہوکر سنہ ۲۲-۲۰ ع کے عدم تعاون میں اپنے حد عروج کو پہنچتی اور پھر رفتہ رفتہ کم زور ہونے لگتی ہے اور گزشتہ تحریکوں کے بعد پر شکستہ ہو جاتی ہے - قومی تحریکوں کی وسعت کے ساتھ ہندو مسلم اتحاد کا صور پھونکا

جاتا ہے اور ہندی اور اردو کو ملانے کی کوشش ہونے لگتی ہے - عربی فارسی اور سنسکرت کے الفاظ کا استعمال کم کرنے کی سعی بھی کی جاتی ہے اور ہندی میں اردو اور اردو میں ہندی الفاظ مقبول ہونے لگتے ہیں - مسلمان متوسط طبقے پر چونکہ حجاز و شیراز کا رنگ چڑھا رہا ہے لہذا ان کی تہذیب میں بھی غیر ملکی عنصر پایا جاتا ہے - یہ ایک عجیب بات ہے کہ وطن پرستی کے نقطۂ نظر سے اردو نے جو سب سے بڑا شاعر پیدا کیا وہ کوئی مسلمان نہیں بلکہ ایک ہندو یعنی 'برج نارائن چکبست' آنجہانی تھے - ہندو متوسط طبقہ ان تحریکوں میں پیش پیش رہا ہے اور اسی لیے اس کا ادب زیادہ قوم پرورانہ ہوتا جاتا ہے - ادھر قبل از جنگ اور دوران جنگ کی پان اسلامی تحریکیں اور سنہ ۲۱ - ۲۰ ع کی تحریک خلافت سے اردو شاعری بے حد متاثر ہوتی ہے اور 'اقبال' کی سرکردگی میں اسلامی قومیت کے سپاہی اردو ادب پر چڑھ آتے ہیں - با ایں ہمہ مسلمان نوجوانوں کا ایک طبقہ ملکی تحریکوں کا ہمدرد اور موئید ہے اور 'جوش ملیح آبادی' سیماب اکبرآبادی' اور 'ساغر نظامی' وغیرہ ان جذبات سے متاثر ہوے ہیں - عدم تعاون کی ناکامیابی کے بعد ملک میں کئی سال تک جمود کی سی کیفیت رہتی ہے - نوجوانوں کا ایک طبقہ مستقبل سے ہراساں ہوکر یا توانگریزوں پر بم پھینکنا چاہتا ہے یا طرب و نشاط میں اپنی کلفتوں کو بھول جانا چاہتا ہے - اس دور کی بعض ہنگامی تصنیفیں اور اردو اور ہندی شاعری کی رومانی تحریکیں اس جذبۂ شکست کو ظاہر کرتی ہیں - گاندھی جی کے عدم تشدد اور انقلاب پروروں کے نظریۂ تشدد میں تصادم ہو رہا ہے جس کا عکس ہم ایک طرف کناڑی کے مشہور شاعر 'اناگولا' اور گجرات کے سحر طراز قومی

شاعر "اردہ شیر خبردار" کی سنہا گرھی نظموں اور دوسری طرف شاعر انقلاب "قاضی نذرالاسلام" کے ہنگامہ پرور کلام میں دیکھہ سکتے ھیں -
سنہ ۲۵ ع کے بعد سے عوام کی خفتہ روح بھی جاگ رھی ھے اور مزدوروں اور کسانوں نے سیاسی جد و جہد میں حصہ لینا شروع کردیا ھے - متوسط طبقے کے کچھہ لوگ ان کے حقوق اور مطالبات کی تائید کررھے ھیں اور اسی طرح دور جدید کے ادب میں صرف یہی نہیں کہ ان کی حالت کیا ھے بلکہ کہیں کہیں یہ بھی دکھلانے کی کوشش کی جارھی ھے کہ انہیں کیا کرنا چاھیے - "پنڈت دیوندر ستھارتھی" نے بہت بڑے پیمانے پر دیہاتی گیتوں کو جمع کرنے کا کام شروع کر رکھا ہے - ادھر "ٹیگور" "شرت چندر چٹر جی" اور "پریم چند" ان برائیوں کا حل "اصلاح" کو سمجھتے ھیں اور سرمایہ داروں اور زمیںداروں سے رحم و کرم کی توقع رکھتے ھیں تاکہ وہ کسانوں اور مزدوروں کے ساتھہ ایک ھی گھاٹ پانی پی سکیں - کچھہ عرصے سے اشتراکیت اور انقلاب کی تحریکوں کی مقبولیت اور اصلاحی جد و جہد کی ناکامی نے ھر زبان میں ایسے ادیب پیدا کردیے ھیں جو نظام معاشی کی صحت کے لیے سرمایہ داری کی تباھی کو ضروری سمجھتے ھیں - اس ضمن میں ھم مرھٹی کی چندر لوک (چاند کی دنیا) اور بنگلہ کی "شرمک گان" (مزدوروں کا گیت مصنفہ منصور احمد) کے نام لے سکتے ھیں —

بہرحال یہ تو ظاھر ھے کہ دور جدید کا ادب بڑی حد تک زندگی کا ترجمان ھے اور غزل جیسی داخلی صنف کا زوال اور نظم جیسی واقعاتی صنف کی مقبولیت اس بات کی دلیل ھے کہ اردو کا ادیب جذبات و خیالات میں ارتباط قایم رکھنا اور ادب کے ذریعے زندگی کی خدمت کرنا چاھتا ھے - اب دیکھنا یہ ھے کہ ادب کے یہ نئے رجحانات زندگی کو منزل

مقصود کی طرف لے جا رہے ہیں یا نہیں اور اگر ان میں کمی ہے تو وہ کس طرح دور ہو سکتی ہے - ہم اپنی سہولیت کے لیے اس دور کے کچھہ بڑے شاعروں اور ادیبوں پر زیادہ وضاحت سے نظر ڈالیں گے اس اعتبار سے کہ یہ لوگ کن مختلف ادبی تحریکوں کے پیشوا ہیں —

رجعت اور ٹیگور حرفتی تہذیب پرانی بنیادوں کو تہ و بالا کر کے زندگی میں خلا پیدا کر دیتی ہے - خاندان کا شیرازہ منتشر ہو تا جا تا ہے' دیہاتوں کی خود اطمینانی ختم ہوتی اور شہروں کی ہنگامہ پروری ان پر حاوی ہوتی جاتی ہے - سرمایہ داری پرانے بندھنوں کو توڑ کر نئی راہوں کو بھی بند کر دیتی ہے - بچہ اگر بڑھ کر بالغ ہوگیا تو اس کی پوشش کے لیے نئے کپڑوں کی ضرورت ہے - پرانی تھگاہوں میں لپیٹا گیا تو یا تو اس کا دم گھٹ جائے گا یا کپڑا پھٹ جائے گا - لیکن سادہ لوح والدین اس کش مکش سے گھبرا کر کپڑوں کی قید سے اسے آزاد کرنے کو ہی مصلحت وقت سمجھتے ہیں - یہی حالت ان مفکرین کی ہے جو راہ ترقی کی دشواریوں سے بچنے کے لیے رجعت کی کلہاڑی سے دنیا کے پیر کاٹنا چاہتے ہیں —

طالسطائی پر تنقید کرتے ہوے 'لینن' ایک جگہ لکھتا ہے کہ " اس کی قوت تخلیقی اور جدت طبع بظاہر سرمایہ داری کے مظالم پر نکتہ چینی کرتی ہے - حکومت کے استبداد اور عدالت کی انصاف کشی پر اس کا دل غم و غصہ سے لبریز ہے - تہذیب کی فتوحات کے ساتھہ جس طرح غریبوں کے خون سے دولت کے ایوان کھڑے ہوتے ہیں وہ ان سب کا جائزہ لیتا ہے - لیکن ان سب سے بڑھ کر وہ بانگ دہل ہے جو یہ مجذوب تشدد کے مقابلے میں عدم تشدد کی حمایت میں بلند کرتا ہے - طالسطائی میں مظالم کے خلاف نفرت ہے' کسی روشن مستقبل کی تمنا ہے 'ماضی' کی پابندیوں سے

آزاد ہونے کی جد و جہد ہے لیکن ساتھ ساتھ اس کا تصور ابھی خام ہے، شعور سیاسی کی کمی ہے اور تغیر پسندی سے جھجک ہے" —

قبل از انقلاب - فرانس اور روس کے ادبا اور مفکرین نظام زندگی کی بد علوانیوں کی عقدہ کشائی کرتے رہے لیکن جب کسی نے آگے بڑھ کر اس کے عملی سد باب کی تدبیر بتائی تو یہ حواس باختہ ہوکر تصوف اور روحانیت کے حجروں میں جا چھپے - ہندوستان میں بھی یہی ہو رہا ہے اور ٹیگور کو ہم اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کر سکتے ہیں -

شاعر سوال کرتا ہے کہ "کوی کی کائیے' کی شنایے ؟ - شاعر تو کہا گائیے کا کہا سنائیے کا ؟ اور خود ہی جواب دیتا ہے : " دنیا میں جب سب لوگ بر سر کار تھے ' اکیلا تو آوارہ لڑکوں کی طرح بھاگ کر میدان میں آیا اور بھری دوپہر میں غم دیدہ درختوں کے سایے میں بیٹھ کر دن بھر بانسری بجاتا رہا - للہ اب تو اٹھ جا -

آگ کہاں لگی ہے ؟ دنیا کو بیدار کرنے کے لیے کون صور پھونک رہا ہے - کسی کی فریاد سے فضا گونج رہی ہے ؟ کس قید خانے میں پا بہ زنجیر دکھیاری مدد کی طلب گار ہے ؟

لا تعداد بے بسو کے سینوں کا خون توہین انسانی کو غسل دے رہا ہے - خود غرضی درد انسانی پر ہنس رہی ہے - وہ بے زبان جو سرنگوں کھڑا ہے - جس کے اترے ہوئے چہرے پر صدیوں کے مظالم کی داستان کندہ ہے، جو جیتے جی ہر قسم کے بار کو اٹھائے چلتا ہے اور پشت در پشت اس بار مصائب کو ورثے میں چھوڑ جاتا ہے — وہ قسمت کا گلہ گزار نہیں ہے ' نہ دیوتاؤں کو کوستا ہے اور نہ انسان کی شکایت کرتا ہے - جو کام کرنے کے لیے زندہ رہتا ہے اور زندہ رہنے کے لیے دو مٹھی اناج کے سوا کچھ نہیں

چاہتا اور جب اس مایۂ حیات کو بھی کوئی چھین لیتا ہے' جب کوئی فرعون اس کے اس اثاثہ پر بھی دست درازی کرتا ہے تو وہ بد بخت غریبوں کے خدا کو پکار کر جان دے دیتا ہے —

اسی حسرت نصیب کو قوت گویائی بخشتا ہے - اس کے ٹوٹے ہوئے دل میں امید کا دیا جلاتا ہے - اسے پکار کر کہتا ہے کہ چشم زدن کے لیے سر بلند ہوجا اور پھر دیکھ کہ جس ظالم کے خوف سے تو لرزہ بر اندام ہے وہ تجھ سے کہیں زیادہ بزدل ہے - جیسے ہی تو جاگے گا وہ راہ فرار اختیار کرے گا - تیرے سامنے آتے ہی وہ راستے کے کتے کی طرح دم ہلانے لگے گا - خدا اس کا دشمن ہے' وہ بے یار ومددگار ہے' اس کی چرب زبانی پر نہ جا - وہ دل ہی دل میں اپنی ذات پر نادم ہے —

اے شاعر' اگر تیرے دل میں ذرا بھی احساس ہے تو اسے اپنا ہمنوا بنا اور اپنی زندگی اس پر قربان کر - غم و اندوہ کی انتہا نہیں اور اس سیاہ خانے کی تاریکی اور الم نصیبی کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے - روٹی' زندگی اور روشنی کی ضرورت ہے - صحت' غم اور آزادی سے دنیا کو مالا مال کرتا ہے - اے شاعر' افلاس کی طغیانی میں ایک مرتبہ جنت کے ہوشربا نظاروں کے دروازے کھول دے -" (ماخوذ از چترا)

سرمایہ دارانہ تمدن کے خلاف اپنی مشہور نظم 'وسوندھر' (زمین) میں کہتا ہے :—

"یہ حیاسوز خون کی پیاسی بربریت کسی دین و آئین کی قائل نہیں اور نہ کسی رسم و رواج کی پابند ہے - اسے فکر فردا ہے اور نہ فکر امروز - اس کی زندگی سمت و ساحل سے بے خبر ہوکر دیوانہ وار بھاگ رہی ہے - نہ وہ ماضی کی طرف دیکھتی

ہے اور نہ مستقبل کی پروا کرتی ہے - 'آج' کی موجوں پر آوارگی اور حباب آسا مسرتوں کو نچاتی ہوئی وہ اس بے حقیقت ناؤ کی طرح رواں ہے جو اپنا ہر بادباں کھولے کسی راہ بے منزل کی طرف جا رہی ہو' —

لیکن بجاے اس کے کہ وہ ان تعلقات کی بربادی کا آرزو مند ہو جو انسان کے لیے آتش زیر پا بن گئے ہیں وہ پیداوار کے تمام جدید ذرائع کو مٹا کر دور وحشت کی طرف لوٹ جانا چاہتا ہے - تہذیب سے خطاب' نامی نظم میں کہتا ہے : "اے نئی تہذیب' مجھے وہ پرانے دشت و جبل لوٹا دے اور اپنے اس شہر کو — اس لوہے' پتھر اور لکڑی کے مقبرے کو واپس لے لے - اے انسانیت سوز تہذیب لئیم' ایک بار پھر وہ عبادت گاہ مجھے لوٹا دے جس کا سایۂ عاطفت نیکی کا گھر رہ تھا ... میں آزادی چاہتا ہوں' اپنے بازوؤں کو پوری طرح پھیلانا چاہتا ہوں - اپنے سینے میں پھر ان کھوے ہوے جذبات کو جگہہ دینا چاہتا ہوں اور تمام پابندیوں کو توڑ کو اپنے دل کو اس دنیا کا آئینہ بنانا چاہتا ہوں" —

ٹیگور کا کوئی ادبی کارنامہ حال اور ماضی کے اس تنازع سے خالی نہیں ہے - زمانۂ حال سے اسے سخت نفرت ہے' سرمایہ دارانہ تمدن کا وہ گلہ گزار ہے - یہ تمدن مادی مطالبات سے روح کو گراں بار ہی نہیں کر رہا ہے بلکہ اس کے وجود سے انسان کو بے پروا بنا رہا ہے - زندگی ابد تک وسیع کیا ہوتی بلکہ 'آج' اور 'ابھی' کی ایک ساعت میں سمٹ رہی ہے - 'ٹیگور' یہ خوب سمجھتا ہے کہ نظام معاشی کی افراتفری نے ہی یہ ستم برپا کیا ہے - روس کی سیاحت کے اثنا میں وہ پروفیسر پیٹروف کو لکھہ چکا ہے کہ روس کی اس ترقی کا راز یہ ہے کہ وہاں دولت پر کسی ایک

طبقے کا نہیں بلکہ پورے سماج کا قبضہ ہے - تاہم اپنے ملک کے مسائل کا کوئی حل اس کی سمجھ میں نہیں آتا سوا اس کے کہ لوگ جنگلوں اور پہاڑوں میں تصوف کی الجھنوں کو سلجھاتے رہیں - امید و بیم کے دو متضاد جذبات اس کے کلام میں جا بجا ملیں گے - انسانیت کے مستقبل پر اس کا ایمان ہے لیکن تغیر کب اور کیسے ہوگا یہ وہ نہیں بتا سکتا - یہ رنگ عمر کے ساتھ زیادہ نمایاں ہوتا جاتا ہے اور 'سونار تری' (سنہری کشتی) میں جس نا معلوم منزل کا پتا دریافت کیا گیا تھا شاعر اپنے آخری مجموعہ 'بلاکا' میں بھی اسی کی تلاش میں سرگرداں ہے: "جو دریاے زندگی میں اتر چکا وہ ساحل کی پروا کیوں کرے؟ کشتی کا آسرا کیوں ڈھونڈے؟ ناخدا کا احسان کیوں اٹھاے؟ اس کارواں کی کوئی منزل مقصود نہیں، نہ وہ کہیں ٹھیرتا ہے، اور نہ کہیں آرام لیتا ہے - راہ میں کہیں دم بھر آرام لیے بغیر وہ اس راستے پر چلتا رہتا ہے جس کا اور چھور نہیں ملتا" —

اس کی اکثر نظمیں اس فقدان مقصد کو ظاہر کرتی ہیں مثلاً:
"انسان کی وہ آوازیں میرے کان میں گونج رہی ہیں جو کہر آلود ماضی سے نکل کر بعید از فہم ابد کی طرف کسی نا معلوم رستے سے سفر کرتی جا رہی ہیں - اور اپنے دل میں اس آشیاں بدر پرندے کی فریاد سنتا ہوں جو لاتعداد پرندوں کے ساتھ اس دھوپ چھانو سے نکل کر معلوم نہیں کہاں سے کہاں جا رہا ہے - اس کا یہ نغمہ فضا کو مترنم کر دیتا ہے کہ یہاں نہیں 'کہیں اور' کہیں اور 'کسی دوسری جگہ — "

راہ نہ معلوم ہونے کی وجہ سے شاعر کی جستجو ناکام رہ جاتی ہے اور وہ تصوف کے الجھیڑے میں الجھ کر انجام کار حزنیت کا شکار ہو جاتا

ہے - چنانچہ اس کی پچھلی نظموں میں سے اکثر موت 'عدم' فنا اور پیری کا نوحہ سناتی ہیں - وہ ٹیگور جس نے بنگال کی سودیشی تحریک سے متاثر ہوکر لکھا تھا کہ "اگر تیری پکار سن کر کوئی نہیں آتا تو نہ سہی تو اکیلا ہی بڑھا چل" — جس کے ولولہ انگیز نغمے نے انقلاب پروروں کو دار و رسن پر امید کا چراغ دکھلایا تھا — "اگر رات اندھیری ہے اور کوئی راستہ نہیں دکھاتا تو اپنے سینے کی ہڈیوں کو مشعل راہ بنا اور اکیلے ہی چلا چل" — اس کا جسم ہی نہیں روح بھی بوڑی ہوچکی اور اس کا پچھلا مجموعۂ کلام اس کی بے راہ روی کا افسانہ ہے —

کاھے کاھے ٹیگور رفارمر کی صورت میں بھی نظر آتا ہے - "گورا" اور "کمدنی" نامی ناولوں میں سماج کی ناپاکیوں کو دکھانے کے بعد وہ تعلیم یافتہ طبقے سے انصاف اور اصلاح کی اپیل کرنے لگتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس نظام میں بنیادی تبدیلیوں کے بغیر برائیاں دور ہوسکتی ہیں —

غریبوں میں وہ نمک حلالی اور ایمان داری کے جذبات پیدا کرنا چاھتا ہے اور امیروں کو رحم دلی اور انصاف پروری کی تلقین کرتا ہے - اپنی ایک نظم "بوڑھا نوکر" میں اس ملازم کا تذکرہ رو رو کر کرتا ہے جو لاکھہ تکلیفیں جھیل کر بھی اُف نہیں کرتا اور مالک کو خدا مانتا ہوا اس کی چوکھٹ پر مر جاتا ہے -

بہر نوع جہاں تک استعمار کا سوال ہے 'ٹیگور' اس کا مخالف ہے ۔ بعد از آں اس کے پیغام میں ثنویت (Dualism) پیدا ہو جاتی ہے- سرمایہ دارانہ تمدن کو وہ سرمایہ دارانہ نظام کا نہیں بلکہ مشینوں کے رواج کا لازمی نتیجہ سمجھہ کر اس سوچ میں پڑجاتا ہے کہ آگے چلوں یا پیچھے بھاگوں ۔ اور جب ملوکیت کو فنا کرنے کے لیے اس سے عملی تدبیریں دریافت کی

جاتی ہیں تو وہ اصلاح، عدم تشدد اور تصوف کی تبلیغ کرنے لگتا ہے - تاہم ٹیگور کے کلام کا بڑا حصہ ادب جدید کے لیے قابل قبول ہے اور یہ خیال بڑی حد تک غلط ہے کہ وہ عمل کا دشمن ہے - ٹیگور ہر گام پر پیام عمل سناتا ہے اور اس لحاظ سے اپنے معاصرین سے کہیں بلند اور قابل احترام ہے کہ اس کا پیغام کسی خاص دور یا مخصوص جماعت کے لیے نہیں ہے - اس کا نقطۂ نظر بین الاقوامی اور زمان و مکان سے بالاتر ہے —

اکبر الہ آبادی مرحوم رجعت اور قدامت کے سب سے بڑے علم بردار گزرے ہیں اور ان کا طنز از آغاز تا انتہا مغرب پرستی کے ماتم سے بھرا پڑا ہے - یہ ان بوڑھے والدین کے شاعر ہیں جن کا تمدن دیسی جوتی، پگڑی اور اچکن تک محدود ہے اور جن کا مذہب چھکڑوں پر چل سکتا ہے، ریل گاڑی سے اسے بعد ہے ! یہ سامنتی تمدن کا شدید احتجاج تھا جو طنزیہ تک بندی میں کفر کے فتوے صادر کر رہا تھا - یہ کہنا لا حاصل ہے کہ یہ ادبی رجحان عام تھا جو نئی روشنی اور پرانی روشی کے اس تنازع کا پر تو ہے جو اب بھی ہر ہندوستانی خصوصاً ہر مسلمان خاندان میں شد و مد کے ساتھ جاری ہے - سامنتی تمدن مغربیت کے نرغے سے نکلنے کے لیے نئی نئی ترکیبیں سوچتا ہے - کبھی وہ انگریزی تعلیم کا یک لخت مخالف ہو جاتا ہے اور کبھی ملازمتوں کی لالچ سے یہ نظریہ پیش کرتا ہے کہ مغرب سے اچھی اچھی چیزیں لے لی جائیں - چنانچہ ہمارے ادبا کا ایک گروہ اب اس حد تک صلح کرنے پر تیار ہے کہ مشرق و مغرب یعنی سامنتی اور حرفتی تہذیبوں میں میل کرا دیا جائے - اس لچر نظریہ کی مقبولیت کا سبب یہ ہے کہ ہنوز ہمارے ملک میں سامنتیت کے کھنڈر باقی ہیں اور صنعت و حرفت کو وہ فروغ نصیب نہیں ہوا جو ملوکیت سے آزاد ہوکر ہی حاصل

ہو سکتا ہے - بہر حال ، ٹیگور ، اقبال ؛ جوش اور اردشیر خبردار جیسے استعمار دشمن شاعروں نے بھی ' مشین ' اور ' مشین کے مالک ' کے امتیاز کے سمجھنے میں غلطی کی ہے اور تقسیم کی بے عنوانی سے تنگ آکر پیداوار کے ذرایع کو مٹا دینا چاہتے ہیں - جو غلطی سیاسی میدان میں گاندھی جی اور دوسرے سامنتی رہنما کر رہے ہیں ، اس کا اعادہ دنیائے ادب کے یہ اکابر بھی کر رہے ہیں - ظاہر ہے کہ ان جذبات کی مقبولیت مادی اعتبار سے دنیا کو پیچھے لے جائیگی کیونکہ تہذیب کے مستقبل کا انحصار قدرت اور انسان کی جنگ کے نتیجے پر ہے - اس لیے یہ نظریہ انسان کی شکست اور پسپائی کا اعلان ہے —

فاسزم (fascism) اور اقبال —

اقبال کا نظریۂ زندگی بڑی حد تک اس تحریک سے متاثر ہے جس کے بانی ' جمال الدین افغانی ' تھے - مشرق نے مغربی استعمار کی چیرہ دستیوں کے خلاف جو احتجاج شروع کیا اور یورپ میں نیشٹا ، برگساں اور میزنی نے حرفتی تہذیب پر جو اعتراضات کیے اقبال ان سے بھی اثر پزیر ہوا - وہ اسلام کے نام پر ایک تصور عالم پیش کر رہا ہے اور اس کی رائے میں مسائل زندگی کا واحد حل یہ ہے کہ دنیا اس تصور کو عملی جامہ پہنائے - یہاں میں صرف یہ دکھانے کی کوشش کروں گا کہ اقبال فاسطیت کا ترجمان ہے اور یہ درحقیقت زمانۂ حال کی جدید سرمایہ داری (neo-capitalism) کے سوا کچھہ نہیں ہے - ظاہر ہے کہ فاسزم پر کوئی جامع بحث اس مضمون کے احاطے سے باہر ہے لیکن اگر ضرورت ہوئی تو اپنے تجزیہ کی تائید میں بعد از آں ثبوت پیش کروں گا —

سلطنت (State) بجائے خود کوئی منتہا نہیں بلکہ سماج کے تعلقات انسانی کی محافظت کا ایک آلہ ہے اور چونکہ ان تعلقات کا انحصار ذرائع پیداوار کی ملکیت

پر ہے اور وہی طبقہ سماج میں برسر اقتدار ہوتا ہے جس کے ہاتھہ میں کلید ملکیت ہے لہذا سلطنت ' تہی دست طبقے کی پامالی کے لئے ' طبقۂ غالب ' کی انجمن کارساز ہے - ارتقائے انسانی کے لئے ضروری ہے کہ زمام سلطنت اس طبقے کے ہاتھہ میں رہے جو پیداوار کے ذرائع کو زیادہ سے زیادہ ترقی دے سکے - سرمایہ دارانہ نظام نے یہ فایدہ ضرور پہنچایا کہ سامنتی سماج کی بنیاد کو فنا کر کے مشینوں کے رواج کو عام کر دیا - لیکن اس کی عمر طبعی اسی روز ختم ہوگئی جب وہ پیداوار اور اس کی تقسیم میں ارتباط قائم نہ کرسکا - کیونکہ دور حرفت اجتماعی پیداوار کا زمانہ ہے اس لئے ضروری ہوگیا کہ پیداوار کے ذرایع پر چند لوگوں کی ملکیت نہ ہو بلکہ پورا سماج اس کا مالک اور منتظم ہو - یہ تبھی ممکن ہے جب وہ محنت کش طبقہ سلطنت کی باگ ڈور اپنے ہاتھہ میں لے جو اقتصادی قالب کو اس طریقے سے بدل سکتا ہے - سرمایہ داری انحطاط پزیر ہوتی جاتی ہے اور اپنے کو زندہ رکھنے کے لیے وہ نئے حیلے تراشتی اور نئے معاونین تلاش کرتی ہے -

مشین نے معاشیات کو قوم و ملک کی حدود سے نکال کر بین الاقوامی بنا دیا ہے اور اب اس کے فروغ کے لیے ضروری ہے کہ قومی حکومت کی پابندیاں توڑدی جائیں اور مالیات و سیاسیات میں امتزاج پیدا ہوجائے - لیکن وطنی سرمایہ داروں کی جماعتیں یوں خودکشی نہیں کرسکتیں - بین اقوامیت کے چڑھتے ہوئے دریا کو روکنے کے لئے وہ نئی دیواریں باندھنے لگتے ہیں - وہ کہنے لگتے ہیں کہ ہمارا ملک یا ہماری قوم یا ہمارا مذہب یا ہماری نسل دنیا میں سب سے زیادہ افضل اور اکمل ہے - اطالیہ قدرت کی طرف سے دنیا کے نام ایک خاص پیغام لایا ہے ! جاپانی برگزیدہ بندے ہیں ' جرمن خدا کی بہترین مخلوق ہیں ! وہ اپنا فرض اسی حالت

میں ادا کرسکتے ہیں کہ آپس کی خانہ جنگیاں بند ہوں - رعایا کا ہر فرد عام اس سے کہ وہ سرمایہ دار ہے یا مزدور صرف ایک حاکم کا اطاعت گزار ہے - ہیگل اور اس کے جرمن متاخرین سلطنت کو اس تصور (Idea) کی تعبیر بتاتے ہیں جس کے حصول کے لیے سماج ارتقا بالضد کی سیڑھیوں پر چڑھ رہا ہے - پارلیمینٹری نظام حکومت صرف اس حالت میں قابل قبول تھا جب تک مالیات میں عدم مداخلت (laissefaire) کے اصول پر عمل ہوسکتا تھا - لیکن اب مزدوروں کی تحریک کو کچلنے اور ساتھ ساتھ سلطنت میں یک جہتی رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ جمہوریت کو فنا کر کے ڈکٹیٹری قائم کی جائے - ڈکٹیٹر ایک انسان برتر ہے جو ہر طبقے کے ساتھ انصاف کرتا ہے جو ہر قسم کے طبقاتی اور نسلی تعصب سے بالا ہے - وہ سرمایہ داری کی سرکوبی کرتا ہے اور مزدوروں کو ' انتہا پسندی ' کی طرف نہیں جانے دیتا ! پھر اس کا وطن دنیا کا پیشوا ہوگا ' اس لئے وہ قومی اور وطنی تہذیب کا نگہبان بھی ہے ! اشتراکیت میں وطنیت ' قومیت اور روحانیت کے لئے جگہہ نہیں ہے اور چونکہ متوسط طبقے کو ان چیزوں سے بڑی دلچسپی ہوتی ہے ' اس لیے وہ ہمیشہ ان کی دوہائی دیا کرتا ہے - اس طبقے کے نوجوان پرنا سیست حکومت کے پشت پناہ ہیں —

اقبال ایک قوم کو ہی نہیں بلکہ اس قوم کے ایک خاص طبقے کو مخاطب کرتا ہے - یہ طبقہ نوجوانوں کا ہے - تاریخ اسلام کا ماضی اسے بہت روشن اور شاندار معلوم ہوتا ہے - اس کا خیال ہے کہ مسلمانوں کا دور فتوحات اسلام کے عروج کی دلیل ہے اور ان کا زوال یہ بتلاتا ہے کہ مسلمان اسلام سے منحرف ہو رہے ہیں - حالانکہ یہ ثابت کرنا مشکل ہے کہ اسلام کی ابتدائی فتوحات عرب ملوکیت کی فتوحات نہیں تھیں -

اور تاریخ کے کسی دور میں کبھی اسلامی تصور زندگی پر عمل بھی ہوا تھا۔ بعد از آں، مسلمانوں نے جو کچھ کیا وہ قطعاً غیر اسلامی تھا - اور ممکن ہے کہ وہ روحانی اعتبار سے مسلمان ہوں لیکن اسلام کے سماجی تصور سے انہیں کچھ زیادہ واسطہ نہ تھا - بہر حال، وطنیت کا مخالف ہوتے ہوے بھی 'اقبال' قومیت کا اس طرح قائل ہے جس طرح 'مسولینی' - اگر فرق ہے تو صرف اتنا کہ ایک کے نزدیک قوم کا مفہوم نسلی ہے اور دوسرے کے نزدیک مذہبی - فاسسٹوں کی طرح وہ بھی جمہور کو حقیر سمجھتا ہے :

متاعِ معنئی بیگانہ از دوں فطرتاں جوئی
زِموراں شوخیِ طبعِ سلیمانی نمی آید
گریز از طرزِ جمہوری غلامِ پختہ کارے شو
کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانی نمی آید

(جمہوریت از پیام مشرق)

فاسزم اور اشتراکیت میں ایک فرق یہ بھی ہے، کہ جہاں اول الذکر عوام کو پیدایشی خر بتاتا ہے، وہاں اشتراکیت ان کی کم فہمی کو ماحولی سمجھتی ہے اور بنابریں اس ماحول کو بدلنے کی ضرورت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ فاسزم کا ہمنوا ہوکر وہ اشتراکیت اور ملوکیت دونوں کی مخالفت کرتا ہے۔

ہر دو را جانِ ناصبور و ناشکیب ہر دو یزداں ناشناس، آدم فریب
زندگی ایں را خروج، آں را خراج درمیانِ ایں دو سنگ آدم زجاج
فرق دیدم ہر دو را در آب و گل ہر دو را تن روشن و تاریک دل

(اشتراکیت و ملوکیت از جاوید نامہ)

ملوکیت و سرمایہ داری کا وہ اس حد تک دشمن ہے جس حد تک متوسط طبقے کا ایک آدمی ہوسکتا ہے - بندہ اور بندہ نواز کی تفریق

بظاہر مٹ جائے اور محمود و ایاز ایک صف میں کھڑے ہو کر نماز پڑھ لیں!
مشینوں کا رواج انسانیت کے لیے مضرت رساں ہے:

ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

درآں حالیکہ آلات خود کچھ نہیں کرتے، بلکہ وہ مخصوص حالات مروت کو کچل دیتے ہیں جن میں ان سے کام لیا جاتا ہے - آلات تو مال پیدا کر دیتے ہیں، اب یہ انسان کا کام ہے کہ اس کی تقسیم مناسب طریقے سے کرے - 'اقبال' مزدوروں کی حکومت کو چنداں پسند نہیں کرتا —

زمامِ کار اگر مزدوروں کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا
طریقِ کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

ہوس اندر دل آدم نہ میرد همان آتش میانِ مرزغن هست
عروس اقتدار سحر فن را همان پیچاک زلف پرشکن هست
نماند ناز شیریں بے خریدار اگر خسرو نباشد کوہکن هست

(از پیام مشرق)

سرمایہ داری اور ملوکیت کی موجودہ بنیادوں کو مٹا کر نظام معاشی کو از سر نو قائم کرنے کے لیے 'اقبال' ایک تصور عالم پیش کرتا ہے - لیکن ایک بین اقوامی تصور کا عامل اس کے نزدیک ایک بین اقوامی طبقہ نہیں بلکہ ایک قوم ہے جس میں ایک بہت بڑا گروہ ایسے لوگوں کا بھی ہے جو 'اقبال' کی نظر میں بھی مسلم نما کافر ہیں اور اس کی تحریک کے سب سے بڑے مخالف یہی لوگ ہوں گے - اپنے خواب کی تعبیر اطالوی فاسسٹ میں دیکھ کر وہ جوش سے کہتا ہے:

رومتہ الکبرا! دگرگوں ہوگیا تیرا ضمیر
اینکہ می بینم بہ بیداریست یارب یا بخواب

چشمِ پیرانِ کہن میں زندگانی کا فروغ
نوجواں ہیں تیرے سوز آرزو سے سینہ تاب
یہ محبت کی حرارت! یہ تمنا! یہ نمود!
فصلِ گل میں پھول رہ سکتے نہیں زیرِ حجاب
نغمہ ہائے شوق سے تیری فضا معمور ہے
زخمہ ور کا منتظر تھا تیری فطرت کا رباب
فیض یہ کس کی نظر کا ہے؟ کرامت کس کی ہے؟
وہ کہ ہے جس کی نگہ مثلِ شعاعِ آفتاب

(مسولینی از بالِ جبرئیل)

یہ فیض 'مسولینی' کا ہے جو اطالیہ کی بہبودی کے لیے ساری دنیا کو فنا کرسکتا ہے، جو اطالیہ کے سرمایہ داروں کا سپہ سالار ہے، جو جنگ کو انسانیت کے لیے شیرِ مادر بتاتا ہے - 'اقبال' ایسے ڈکٹیٹر کو ہی اسلامی پاکستان کے استحکام کا ضامن سمجھتا ہے - خلافت کا تصور اس کے نظریے کی تائید کرتا ہے حالانکہ 'خرانِ جمہور' میں وہ 'طبع سلمانی' کہاں جو اس ڈکٹیٹر کو 'مشورہ' دے سکے —

مختصر یہ کہ 'اقبال' اسلامی فاسیت ہے اور اس کا ردعمل بھائی پرمانند اور ڈاکٹر منجے کے ہندو فاسزم کی صورت میں ظہور پزیر ہو رہا ہے جن کے نزدیک ویدک عہد کی تہذیب انسانیت کی معراج، اور ذات پات کی تقسیم' تقسیم عمل کا بہترین نمونہ ہے!

ادب اور قومیت

ہندو مسلم نفاق در اصل دو مختلف تہذیبوں کی کش مکش ہے اور ہم دیکھ چکے کہ کس طرح 'ٹیگور' اور 'اقبال' اپنا تصور عالم پیش کرکے ان متضاد رجحانوں کو ظاہر

کررہے ہیں - سیاسی اغراض کی خاطر ہر دو قوم کے متوسط طبقوں میں باہم اتحاد اور امتزاج کی جو تحریک شروع ہوئی تھی وہ بھی ادب ہند پر ایک نقش چھوڑ گئی ہے اور دونوں قوموں کے کئی ادیب خالص وطنی اور قومی جذبات سے متاثر نظر آتے ہیں - وہ ہندوستانیوں کو ترغیب دیتے ہیں کہ خانہ جنگیوں کو بند کرکے غیر ملکی حکومت کے خلاف اپنا متحاذ قائم کریں - ان کے نزدیک وطن سب کچھہ ہے - وہ یہ بھی نہیں سوچنا چاہتے کہ آئندہ حکومت کا دستور کیا ہوگا - بس انگریزوں کے جاتے ہی کوئی جادو کی چھڑی ہر معاملے کو درست کردے گی گویا سماج کی تمام برائیاں صرف ان سے وابستہ ہیں - ظاہر ہے کہ اب تک جو سیاسی تحریکیں اس ملک میں اُٹھہ اُٹھہ کر گرتی رہیں وہ اس قوم پرورانہ جذبے سے متاثر تھیں جس کے پیچھے دیسی سرمایہ دارانہ مفاد کام کررہے تھے - اردو میں 'چکبست' 'جوش' اور 'ساغر نظامی' ہندی میں 'نوین' ایک 'بھارتیہ آتما' اور 'بابو میتھلی شرن گپتا' انگریزی میں 'سروجنی نائیڈو' اور 'ہرین چٹرجی' گجراتی میں 'اردشیر خبردار' اور دکن میں 'اناگولا' اس قومی رجحان کے ترجمان ہیں - ہندو مسلم تفریق کو مٹاکر ایک قوم کو جنم دینے اور ہندی اور اردو کی آمیزش سے ایک زبان وضع کرنے کا بھی سامان ہورہا ہے - چنانچہ صرف نثر میں ہی نہیں بلکہ نظم میں بھی اردو والے ہندی کے اور ہندی والے اردو کے بکثرت الفاظ مستعمل کرنے لگے ہیں - تحریک اتحاد کے بعد ہی اردو میں ہندی گیتوں کی مقبولیت ہوئی اور ہندی میں مشہور شاعر 'ہری اودھ' کی تہمت ہندی کو قبول عام میسر آیا - ان کے چوپدے پڑھیے تو بہ اعتبار زبان وہی لطف آتا ہے جو 'آرزو لکھنوی' کی خالص اردو میں —

قومی تحریک کا سب سے بڑا شاعر شاید 'اردشیر خبردار' ہے - گجرات میں آج اس کا وہی مرتبہ ہے جو اردو میں اقبال کا اور بنگالہ میں 'ٹیگور' کا - وہ کوئی ہنگامی شاعر نہیں بلکہ قومیت کے نظریے کی تہہ تک پہنچتا ہے اور اس کا مجموعۂ کلام 'درشنکا' (فلسفہ) بمبئی یونیورسٹی کے نصاب میں داخل ہے - اس کا ترانہ 'گلونتی گجرات' اقبال کے ترانے یا ڈی - ایل - رائے کے 'بنگ آمار لچھمی بھومی' سے کم مقبول نہیں ہے - وہ سخت قسم کا وطن پرست اور قوم پرور ہے - اپنی ایک نظم میں کہتا ہے —

"اے مادر وطن! روز آفرینش سے جس کے خوابوں کا ہار تیرے تاروں سے گوندھا گیا ہے —

جو مرتے دم تک تیرے ہی نام کو بوسے دیتا ہے -
اے ماں، اُس نے تجھے پہچان کر اپنی خودی کو سمجھا ہے -

جب میں مرجاؤں تو تیری خاک پاک سے دوبارہ جنم لوں تاکہ تجھ پر دوبارہ قربان ہوسکوں - تیری مٹی میرے لیے مایۂ حیات ہے ' کیونکہ خالق کے پرستار کی مٹھی میں تمام مخلوق ہے" —

ایک دوسری نظم میں ستیاگرہ کی تبلیغ یوں کرتا ہے : "آج اپنے ساتھ کیا کیا لوگے ؟ جرأت تلوار میں نہیں دل میں رہتی ہے - کاٹ تمہاری ہمت مردانہ میں ہے ورنہ ہر تلوار بے آب ہے - ان کند ہتھیاروں کو پھینک کر دل کو جنگ کے لیے مستعد بناؤ - ہمیں کسی کا خون نہیں بہانا ہے - حریف کے خون جگر سے ہم اپنے دل کے دیوتا کو کیوں کر ناپاک کریں - جس فتح کی تاریخ انسان کے خون سے لکھی جاتی ہے وہ بے پایاں ہے —"

ادب اور تحریک اصلاح

مغربیت نے اتنا فائدہ ضرور پہنچایا کہ ہمارے ارباب حل و عقد اپنی آنکھوں کے شہتیر کو دیکھنے

لگے - یہ محسوس کیا جانے لگا کہ ان کی موجودہ زندگی کسی نہ کسی حد تک بے ربط ضرور ہے - چنانچہ ہندوؤں میں سماج سدھار' کی تحریک زور شور سے چل پڑی - سوشل معاملات میں کم عمری کی شادی' بیواؤں کی بدحالی اور مردوں کی تماش بینی کے خلاف آوازیں بلند ہونے لگیں - گجرات میں گووندرام نے اور بنگال میں 'ٹیگور' اور 'شرت چند' نے اس تحریک کی حمایت میں افسانے لکھے - ادھر مسلمانوں کی ہر برائی بھی چونکہ برگزیدہ ہے اس لیے 'قاضی سرفراز حسین' اور 'راشدالخیری' نے چند پیش پا افتادہ مسائل پر اکتفا کیا اور ایک عرصے تک کسی کو جرات نہ ہوئی کہ ایک تیز نشتر لے کر اس ناسور کو دکھاے جس نے سماج کے رگ و پے میں زہر ساری کر دیا ہے - اس طرف دو کتابیں ایسی شائع ہوئیں جو قابل توجہ ہیں اور مسلمان تعلیم یافتہ جماعت میں ایک نئے رجحان کا پتا دیتی ہیں - انگارے' افسانوں کا ایک مجموعہ ہے جو اب ضبط ہو چکا - یہ افسانے ہماری جنسی زندگی کا مرقع تھے اور حالانکہ ان کا انداز تحریر جنسی تشدد سے متاثر تھا اور اس ذہنیت کا آئینہ دار تھا جو روح یا پیٹ کی طرح محض جنس ہی کو واحد شعبۂ زندگی قرار دیتی ہے' تاہم اردو افسانہ نگاری میں یہ پہلی مثال ہے کہ ادب نے منافقانہ پابندیوں پر اپنے فرائض کو ترجیح دی ہو - دوسری کتاب 'لیلیٰ کے خطوط' ہے - افسوس کہ اس کے مصنف نے مظلوم نسوانیت کا ترجمان ایک شاہد بازاری کو بنا کر اس مسئلہ کو محدود بنا دیا اور شہری زندگی میں طوایف کی ناگزیریت کو نظر انداز کر دیا ورنہ اس کتاب کا شمار ہندوستان میں دور جدید کی اچھی تصنیفوں میں ہوتا - تاہم اس کی مقبولیت یہ ظاہر کرتی ہے کہ اس طبقے کے کچھ لوگ محض

اصلاح کو ہی کافی نہیں سمجھتے اور یہ بھی دیکھنے لگے ہیں کہ ان برائیوں کو دور کرنے کے لیے نظام زندگی میں بنیادی تبدیلی کرنی ضروری ہے -

اقتصادی مسایل میں طبقاتی تصادم (Class-war) کا مطلع صاف ہوتا جاتا ہے اور واقعیت نگار ادیب اس طرف بھی متوجہ ہونے لگے ہیں - 'پریم چندر' کے تقریباً سبھی کردار اصلاح پسند (Reformist) ہیں - اس کے سامنے ایسے خوش حال زمین داروں کی مثالیں ہیں جو 'طالسطائی' کے 'ڈسیٹری' (Resurrection) کی طرح کسانوں میں اپنی جائداد تقسیم کر کے اپنی زندگی کو خدمت خلق کے لیے وقف کر دیتے ہیں - عورتیں اپنے ڈربوں سے نکل کر مردوں کے دوش بدوش قومی زندگی کی تدوین میں حصہ لے رہی ہیں - 'سجان سنگھہ' 'پریم شنکر' اور 'ونیے کمار' اسی قسم کے نوجوان ہیں - 'سمن' 'گایتری' اور 'صوفیہ' ایسی ہی عورتیں ہیں - لیکن جب ایسے زمین دار مستثنیات میں شمار ہوتے ہیں اور اس کلیہ کو ثابت کرتے ہیں کہ اپنے حقوق سے کوئی طبقہ برضا و رغبت دست بردار نہیں ہوتا تو پریم چندر سوچ میں پڑ جاتا ہے اور راہ انقلاب کی آتش اندوزیوں سے اس کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں - طالسطائی اور ٹیگور کے نقش قدم پر چلتے ہوے وہ انقلاب اور رجعت کے دوراہے پر ایک ٹھنڈی سانس بھر کر یہ کہتا ہوا بیٹھہ جاتا ہے کہ اے کاش اس رستے پر چلے بغیر ہم وہاں پہنچ جاتے ! -

اصلاح کی ہر تحریک نیک نیتی لیکن تنگ نظری پر مبنی ہے - زندگی اور موت میں اتحاد نہیں ہو سکتا اور نہ ظالم و مظلوم کو ایک لڑی میں گوندھا جا سکتا ہے - اسی طرح تعلقات جنسی میں اس وقت تک توازن، استحکام و صحت کی گنجائش نہیں جب تک زندگی کے دوسرے

مسائل سے هم اسے الگ کرکے دیکھنے کی عادت نہ چھوڑ دیں اور ترغیبات جلسی کو شیطان کا فاعہ نہیں بلکہ ایک فطری جبلت (instinct) نہ سمجھنے لگیں —

ادب اور فقدان مقصد

پل صراط کی طرح انقلاب کا رستہ بھی بڑا دشوار گزار ہے - بہت سے لوگ راہ میں تھک تھک کر رہ جاتے اور تصوف کی خلدق یا نراج کی گھاتی میں گر پڑتے هیں - هندوستان ایک دورِ تغیر سے گزر رها ہے اور تعلیم یافتہ طبقے کا ایک گروہ لازمی طور پر داخلی کش مکش میں مبتلا ہے - اس کے لیے زندگی کی حقیقت ایک رقص شرر سے زیادہ نہیں ہے - اس کی زندگی کا کوئی معیار یا مسلک نہیں ہے - ماضی اس کے لیے بے معنی اور مستقبل لا یعنی ہے - جو کچھہ ہے 'ابھی' اور 'آج' کی مسرتوں میں ہے - شراب و شباب کا یہ فلسفہ پہلے بھی اس ملک میں مقبول تھا لیکن هر جام کے ساتھہ توبہ تھی اور هر معصیت کے ساتھہ احساسِ گناہ اور عفو گناہ کی امید - لیکن اب مستقبل کی تاریکی خودکشی کے رجحان کو بڑھاتی جاتی ہے اور باهمت بے راہ رَو بم پھینک کر' کم همت لوگ آپ اپنی جان لے کر اور آزاد منش 'خیام' 'بائرن' اور 'آسکر وائلڈ' کی قسمیں کھا کر اس نراجی ذهنیت کا ثبوت دے رہے هیں - دنیاے ادب میں اس کا پرتَو رومانیت اور 'ادب براے ادب' کی صورت میں آشکار هوتا ہے - حقائق کی تلخ کامیوں سے گھبرا کر انگلستان میں 'بائیرن' اور 'کیٹس' وغیرہ نے سامنتیت کے زوال کے زمانے میں اور اب یٹس (Yeats) اور ڈی - ایچ لارنس وغیرہ نے حرفت کے زوال کے وقت اسی جذبۂ شکست کا اظہار کیا ہے - همارے ملک میں بھی متوسط طبقہ میدانِ کارزار سے گھبرا کر تصوف اور رومانیت کی آڑ پکڑنے لگتا ہے - هندوستان

کا سب سے بڑا ناول نگار ' شرت چندر چٹرجی اپنے ناول چرترھین ' بداخلاق) شیش پرشن (آخری سوال) اور 'شری کانت ' میں ایسے ھی لوگوں کی تصویر کھینچتا ھے - بنگلہ اور ھندی میں رومانیت اور ٹیگور سے اثر انداز ھوکر شاعری میں ' چھایہ واد ' یعنی اشاریت (Symlolism کی تحریک شروع ھوئی اور حقیقت پرستوں کو ایک عرصے تک ان رجحانات کے خلاف برسرپیکار رھنا پڑا - اردو کے نوجوان شاعروں میں بھی یہ ذھنیت عام ھوگئی ھے اور یہ اصحاب حسن و عشق کے علاوہ دنیا کی ھر چیز سے بے نیاز نظر آتے ھیں' حالانکہ نہ ان کا عشق بوالھوسی سے علحدہ کیا جاسکتا ھے اور نہ ان کا معیار حسن عالم دوشیزگی سے آگے بڑھتا ھے - ان کی حب نسوانیت دوشیزہ پرستی تک محدود ھے اور اس کی وجہ شاید یہ ھے کہ جس طرح ھمارے نظام زندگی میں عورت اپنی مالی ضروریات کے لئے مرد کی دست نگر ھے اسی طرح مرد اپنی شھوانی ترغیبات کے لیے اس کا غلام بن گیا ھے -

زندگی میں حسن و عشق کے لئے بڑی جگہہ ھے اور شراب و شباب کے لیے بھی - لیکن ان کے نام پر زندگی کے مطالبات سے بے پروا ھونے کی کوششیں رجعت پرورانہ اور لائق تعزیر ھیں —

نذرالاسلام پورے ھندوستانی ادب میں صرف ایک ایسا شاعر ھے جو میکسم گورکی کی کسوٹی پر کھرا اترتا ھے - جو انقلاب پرور ' قدامت شکن اور تغیر پسند ھے - جب ادب کا کام صرف یہ رہ گیا ھے کہ انسان کو رلائے یا سلائے اور یا گمراہ کرے تو اُفق بنگال پر ایک ستارے کا طلوع ھوتا ھے جو صراط مستقیم کا نشان ھے - مختصراً نذرالاسلام کا فلسفۂ زندگی یہ ھے کہ زندگی دایم و قایم ھے اور انسان لاشریک لہ اس کا مالک ھے - انسان اور قدرت کی کش مکش کا نام تہذیب ھے اور انسانیت کی ترقی

کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے کس حد تک قدرت پر فتح حاصل کرلی ہے - انسان سب سے افضل اور اکمل ہے - دین حق کا مطلب ہے ہر قسم کے ظلم کا سدباب اور اخوت و مساوات کا قیام - قومیت ' سرمایہ داری ' تمیز رنگ و نسل اور تفریق مذاہب کو وہ انسانیت کے لیے سم قاتل سمجھتا ہے - اس کے خیال میں ایک نسل کو دوسری نسل کی قسمت کا فیصلہ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے - ہر آنے والی نسل زندگی کی محافظ اور ضامن ہے —

اس لحاظ سے ' نذرالاسلام ' کو روحانیت نوازی اور داخلیت سے قطعاً کوئی واسطہ نہیں - جب دنیا حیات و ممات کی کش مکش میں ہے تو وہ ایسے وقت میں فلسفۂ قدرت پر غور و خوض کو غیر ضروری اور مضر مانتا ہے - اس وقت فلسفۂ قدور (Philosophy of Values) کی فکر کہیں زیادہ اہم اور مفید ہے - جب رجعت اور انقلاب بر سر پیکار ہوں تو ادب فصیل پر بیٹھ کر واقعیت (Realism) کے کیمرے سے فوٹو نہیں لے سکتا - یا تو وہ رجعت کے قلعے میں جا چھپے گا یا انقلاب کے میدان میں ہوگا اور یا تصوف و داخلیت کے خندق میں جا گرے گا - طبیعتاً وہ باغی اور سرکش ہے - حسن و عشق کی وادیوں میں گرفتار ہو کر بھی اپنی منزل کو نہیں بھولتا " پچارن ' میں عشق کی ناکامیوں کا رد عمل یوں بیان کرتا ہے : " معلوم ہوتا ہے کہ اب میں اپنی منزل کو پہچان گیا - کیوں نہ اب میں موت در آغوش طوفان کا ہم سفر بن جاؤں - راستے میں کس کی یاد میں فریاد کرتا پھروں ؟ کیوں نہ آتش فشاں پہاڑ اس مرتبہ اپنے غارتگر دہانے کھول دیں ؟ کیوں نہ میری گرم گفتاری بغاوت کے جھنڈے لہرا دے اور موت کے ترانے میرے ہم سخن بن جائیں - لے آؤ اپنے آتشیں رتھ اور پھونک دو

ھنگام قیامت کے صور! برساؤ زھر و آتش میں بجھے ھوے تیر! برباد کردو اِس دنیاے معصیت کو! ٹپکاؤ یہ خونیں شراب عزرائیل کے گلے میں!"

نذرالاسلام کے نزدیک دنیا ھمیشہ دو طبقوں میں بٹی رھی ھے - اور اس ظالم و مظلوم کی تفریق کو اقبال چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی کی ستیزہ کاری بتاتا ھے - لیکن جہاں ایک "خود گزاری" و "نالۂ نیم شبی" اور 'گنبد نیلوفری' کے تماشوں کا آسرا ڈھونڈتا ھے' دوسرا مظلوموں کو اتحاد و انقلاب کا درس دیتا ھے:

"میں اس روز مطمئن ھونگا جب مظلوموں کی فریاد فضاے آسمانی میں نہ گونجے گی - اور جب میدان جنگ میں تلوار اور خنجر کے خوفناک ترانے نہ سنائی دیں گے - وہ جو ازلی باغی اور میدان جنگ سے نالاں ھے' صرف اسی روز خاموش ھوگا -" (باغی)

"وہ جو سمندر کی گہرائی میں' آسمان کی وسعت میں' زندگی کے ھیجان میں 'فضا' کی ہر سمت میں موت سے نبرد آزما رھتا ھے — وہ جس نے بادل کی بیٹیوں کو کنیز بنا رکھا ھے کہ جو بجلی کو اپنی مٹھی میں پکڑے رکھتا ھے میں اسی کے آستانے پر سر جھکاتا اور اسی کے گیت گاتا ھوں -"

(پیام شباب)

اپنے عزم راسخ کے لیے وہ کسی معاوضے کی تمنا نہیں کرتا - وہ حال کی ترجمانی کر رھا ھے تاکہ انسانیت کا مستقبل روشن ھو زمانہ اُسے یاد کرے گا یا نہیں اسے اس کی پروا نہیں ھے:

"میں زمانۂ حال کا شاعر ھوں' مستقبل کا پیغمبر نہیں ھوں —

کوئی کہتا ہے کہ اگلے زمانے میں تجھے کون یاد کرے گا۔ کوئی کہتا ہے کہ شاعر کو قید و بند سے کیا نسبت! کسی کا مشورہ ہے کہ تو دوبارہ جیل جا کہ وہیں خوب لکھہ سکتا ہے - مولوی میرے چہرے پر اسلام کی علامت (ڈاڑھی) نہ پاکر مایوسی سے اپنی ڈاڑھی کھجانے لگتا ہے- ہندو کہتے ہیں کہ اس نے ہندو لڑکی سے شادی کر کے اپنی فرقہ پرستی کا ثبوت دیا ہے - گاندھی جی مجھہ پر تشدد پسندی کا الزام لگاتے ہیں - عورتیں کہتی ہیں کہ یہ دشمنِ نسواں ہے اور مرد مجھے عورت پرست بتاتے ہیں- غرض کہ میری جان ضیق میں ہے —

لوگو ' سنو کہ یہ دل انتقام اور درد کی آگ سے پھلکا جارہا ہے - تن تنہا خون نہیں بہا سکتا ' اس لیے اپنے خون سے یہ نظمیں لکھہ رہا ہوں-

مجھے اس کی پروا نہیں کہ مستقبل مجھے یاد کرے گا یا نہیں-

تمنا صرف یہ ہے کہ جو لوگ خلق خدا کو بھوکوں تڑپا رہے ہیں میری خونچکاں تحریر ان کے لیے پیام موت ثابت ہو!" سرمایہ اور محنت کے تصادم کے انجام پر سماج کی قسمت کا انحصار ہے - وہ طبقۂ محنت کش ہی ہے جو تقسیم کی بے انصافیوں کو دور کرکے پیداوار کے ذرایع کو انتہاے عروج پر لے جا سکتا ہے - شاعر اس کی فتح یابی کا ترانہ یوں گاتا ہے :

" وہ مبارک ساعت آپہنچی -

ہتوڑی اور کدالی لیے جو پہاڑوں کو کاٹ کر رکھہ دیتا ہے '

راستے کے دونوں طرف جس کی ہڈیاں بکھری پڑی ہیں '

تمہاری خدمت کے لیے جس نے قلی اور مزدور کا روپ لیا ہے '

تمہارا بارِ گناہ اٹھانے کے لیے جو ہمیشہ خاک آلود رہتا ہے '

وہی — صرف وہی مزدور مکمل انسان ہے - میں اسی کے گیت گاتا ہوں-

اس کا ٹوٹتا ہوا دل ایک نئی دنیا کی تعمیر کرے گا-

اونچی عمارتوں میں رہ کر اب یہ توقع نہ کرو کہ یہ خاک نشیں ہمیشہ تمہارے آگے سر بسجود رہے گا —

جو لوگ فرط احترام سے مادر گیتی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بناتے ہیں وہ انہیں ہی اپنا وارث بنائےگی -

میں ان پیروں کو بوسہ دیتا ہوں جن سے لپٹ کر مٹی اپنی یگانگی کے اعلان کرتی ہے -

آج بےکسوں اور مظلوموں کے خون سے رنگ کر بطن گیتی سے آفتاب تازہ پیدا ہوا ہے - اب تمام پابندیوں اور بندھنوں کو توڑ کر پھینک دو -

فلک کج رفتار کو چاہیے کہ پاش پاش ہو کر ہمارے آشیانے پر گر پڑے -

ہمارے سروں پر آفتاب وماہتاب اور ستارے پھول بن کر برسیں کہ ہم نے ایک جہان نو کی داغ بیل ڈالی ہے —

مزدوروں کی جمعیت کو مژدہ ہو کہ ہم سب ایک ہی کارواں کے مسافر ہیں - ایک کا دکھہ سب کے لیے موجب اندوہ ہے اور ایک کی توہین بنی نوع انسان کی توہین ہے —

آج دنیا کے کل بندھن کٹ رہے ہیں اور ایک عظیم‌الشان دور بیداری کا آغاز ہو رہا ہے جسے دیکھہ کر خدا مسکراتا ہے اور شیطان خوف سے لرزتا ہے!"

نذرالاسلام شباب کا ہمدوش اور انقلاب کا نقیب ہے - وہ تغیر کا حامی اور جمود کا دشمن ہے - وہ قدیم کا حریف اور جدید کا علم بردار ہے - وہ قدرت اور سماج کے مظالم کے خلاف علم جہاد بلند کرتا ہے اور شاعری کو اس مہم میں چھاونی کی کسبی نہیں بلکہ جنگ کی دیوی بنا دیتا ہے - اس کی شاعری ادب ہند کے رستے میں ایک نئی المکار ہے جو بتاتی ہے کہ آرٹ موت کا نہیں زندگی کا پروردہ اور خادم ہے - وہ اس روح کو مٹا

دے گا جو جسم کو قید سمجھتی ہے - وہ استعمار و استبداد کو فنا کرکے حسن و عشق کے صحیح جذبات سے انسان کو آشنا کرے گا -

ادب جدید کی ضرورت اس مختصر سے سماجی تجزیے میں ہم نے یہ دکھانے کی کوشش کی تھی کہ ادب ہند کا دور قدیم حقائق زندگی سے نا آشنا اور بالکل داخلی تھا - کوئی حل پیش کرنا تو درکنار وہ زندگی کے مسایل کو سمجھتا ہے اور نہ سمجھنا چاہتا ہے - دور جدید زندگی سے اس حد تک بیگانہ نہیں ہے اور اس کی خدمت کا ولولہ بھی رکھتا ہے - لیکن اس کے بتلائے ہوئے راستے بڑی حد تک گمراہ کن ہیں -

ادب کا فرض اولین یہ ہے کہ دنیا سے قوم، وطن، رنگ و نسل اور طبقہ و مذہب کی تفریق کو مٹانے کی تلقین کرے اور اس جماعت کا ترجمان ہو جو اس نصب العین کو پیش نظر رکھ کر عملی اقدام کر رہی ہو - انسانیت کے دشمنوں کی دشمنی دراصل درد انسانی کی دلیل ہے - اب تک ہمارا ادب زندگی کی بے ثباتی اور انسان کی بیچارگی کا نوحہ پڑھتا آیا ہے - اب اسے اس جذبۂ بزدلی سے نکل کر یہ کہنا چاہیے کہ زندگی ابدالآباد تک ہے اور انسان اس کا کارساز حقیقی ہے - قیامت کے معنی یہ ہیں کہ روح الاجتماع دور محشر بن کر استبداد کو ہمیشہ کے لیے جہنم رسید کرے اور پھر اسی زمین پر ایک ایسے بہشت کی تخلیق کرے جس میں ہر انسان ذہنی جسمانی اور روحانی ترقی کی بلندیوں تک پہنچ سکے - انسانیت اور ادب کے مسلک الگ نہیں ہیں اور دونوں کی نجات کا رستہ بھی ایک ہے - وہ یہ ہے کہ ستم رسیدہ انسانیت اپنے حقوق اور ان کے غاصبوں کو سمجھے اور ان تمام پابندیوں کو توڑ دے جو اس کے ارتقا کی راہ میں حایل ہوں - یہ مضمون اردو کے ادیبوں کے لیے لکھا گیا ہے، لہذا میرا

خطاب ان سے ہے —

ایک طرف پولیس کا وہ پنشن خوار داروغہ ہے جو تا عمر اپنی فرعونیت اور ہوس پرستی کا مظاہرہ کرنے کے بعد تسبیح کے دانوں پر اپنے گناہوں کا شمار کر رہا ہے - اسے ایسی کتابوں کی ضرورت ہے جو اسے رلانے اور سلانے میں مدد پہنچائیں - پھر وہ مولوی ہے جو دین کے پردے میں سب سے بڑا دنیا دار ہے اور جس کی ہوس پرستی کو اشعار کے اس ناپاک دفتر سے ایک گونہ تسکین ہوتی ہے - اور وہ تعلیم زدہ لڑکیاں ہیں جو زن مرید شاعروں کی ٹھنڈی سانسیں سن کر کسی مجنوں کے انتظار میں بیٹھی ہیں - وہ ایسی کہانیاں پڑھنا چاہتی ہیں جن کی ہیروئن وہ خود ہوں اور جن کے ہیرو خود کشی کر کے بٹیروں کی طرح تڑپ رہے ہوں -

آپ اب تک انہیں لوگوں کے لیے لکھتے رہے ہیں - کیا آپ کی آئندہ ادبی کاوشیں بھی انہیں کے لیے وقف ہوں گی؟ —

دوسری طرف وہ کسان ہے جو سماج کی عمارت کا سنگ بنیاد ہے - زمین دار اور سود خوار جونک کی طرح اس کا خون پی رہے ہیں - مولوی اس پر خود گزاری اور صبر و شکر کا جادو پھونکتے ہیں - اس کی بیوی روٹیوں کے لیے عشوہ فروشی پر مجبور ہے - اس کے بچے بھوک سے تنگ آکر آپ کی جیب پر گھات لگائے ہوئے ہیں - اور وہ مزدور ہے جو سماج کی عمارت کا ستون ہے - وہ مال اس لیے پیدا کرتا ہے کہ منافع کے نام سے ایک دوسرا شخص اسے ہتیا لے جس کے لیے لغت میں 'مالک' کا لفظ تراشا گیا ہے - قید خانے کی کوٹھڑیوں سے بد تر جھونپڑیوں میں 'پلیگ اور ہیضے میں تڑپ کر وہ بھوکا اور ننگا مزدور اس حسرت میں مر جاتا ہے کہ مارواڑی کا سانڈ یا کسی امیر کا کتا کیوں نہ ہوا! —

کیا اس کے حال زار نے کبھی آپ کے دل میں چٹکی لی ہے؟ کیا کبھی آپ نے سوچا ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ کیا کبھی ان اسباب و علل کو مٹانے کا خیال آپ کے ذہن میں آیا ہے؟ - اگر نہیں تو آپ ادب کے لیے باعث ننگ ہیں - ایسے ادیبوں کے لیے کروپاٹکن کہتا ہے: "کیا تم مصنف بننے کی آرزو رکھتے ہو؟ تو اپنے ملک کے مصائب کی داستان پر نظر ڈالو اور اگر اس کے بعد تمہارا دل خون نہیں ہوجاتا تو اپنے قلم کو پھینک دو - اس قلم کا مصرف صرف یہ ہے کہ تمہارے بےحس دل کی ناپاکی کا پردہ فاش کرتا رہے؟"

گویا ادب آج کبیر داس کی زبان میں کہہ رہا ہے:

'کبیرا' کھڑا بزار میں لیے لکاٹھی ہاتھ　جو گھر پھونکے آپنا چلے ہمارے ساتھ -

ہمیں ان لوگوں سے غرض نہیں جن کے دماغ روپیوں کے لیے چکلا گھر بنے ہوئے ہیں اور جو سرمایہ دار پبلشروں اور جاہل و بے درد شہریوں کے زر خرید غلام ہیں - ہمارا خطاب ان سے ہے جو تخلیق ادب کو رتبۂ پیغمبری دیتے ہیں - جو حق گو اور حق پوست ہیں اور جو سچ کہتے ہوے کسی قسم کی پابندی سے نہیں ڈرتے -

اردو اور مذہب دو مختلف چیزیں ہیں - اردو اگر قومی زبان بننا چاہتی ہے تو اسے ہر قسم کے خیالات و جذبات کا حامل بننا چاہیے - وہ زبان ہرگز کسی ترقی یافتہ قوم کی زبان بننے کا استحقاق نہیں رکھتی جس کے حسن و قبح کا فیصلہ کوئی مذہبی جماعت کرتی ہو - یعنی اردو کے ادیبوں کو رواداری اور روشن خیالی کی تلقین کرنا چاہیے -

متوسط طبقے کی زندگی بند پانی کی موری ہے - عوام کو سمجھنے کی کوشش کیجیے اور انہیں بتایئے کہ وہ اس خستہ حالی میں کیوں ہیں اور

کس طرح نجات حاصل کر سکتے ہیں —

اردو ادب کی زن پرستی دونوں جنسوں کے لیے باعث عار ہے - پردے کی سختی اور عورت کی کم یابی نے مرد کے نقطۂ نگاہ کو یکسر Masochistic (خود اذیتی) بنا دیا ہے - سجاد حسین اور مہدی حسن جیسے آزاد خیال ادیب بھی عورت کو شہوت رانی کا آلہ سمجھتے ہیں - جنسی مساوات کی تبلیغ ہی اس ناپاک ذہنیت کو دور کر سکتی ہے —

مولویوں اور پنڈتوں کی زبان میں گفتگو بند کیجیے - عربی و سنسکرت کو ان کے لیے اور انہیں عربی و سنسکرت کے لیے چھوڑ دیجیے - ادب کو فطری بنانے کے لیے ہندوستانی اسپرٹ ہی نہیں ہندوستانی صورت اور اسلوب بھی اختیار کیجیے —

ادب جدید کے حامیوں کی انجمن بنائیے اور اس کے آرگن شایع کیجیے تاکہ جدید خیالات کی اشاعت میں آسانی ہو اور قدامت پرستوں کے اعتراضات کا جواب دیا جاسکے —

ہر سیاسی اور سماجی انقلاب کے پہلے ایک ذہنی انقلاب کی ضرورت ہوتی ہے اور اگر ہندوستانی عوام ہر اعتبار سے ملکی جد و جہد سے الگ اور نا آشنا ہیں تو اس کی ذمہ داری ان کے تعلیم یافتہ طبقے پر ہے جو خود بھی اوہام و تعصب کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے - اب وہ وقت آگیا ہے کہ اردو کے ادیب بھی اپنے بنگالی اور ہندی معاصرین کے نقش قدم پر چلیں اور یہ ثابت کر دکھائیں کہ "ادیب کا مشرب قومی و مذہبی تعصبات سے پاک ہے اور وہ واقعتاً انسانیت کا خادم، مصور اور پیشوا ہے —

سوچیئے کہ انسانیت کے ماضی میں آپ کے لیے کون سے اشارات پنہاں ہیں، مسایل حال کیا ہیں اور مستقبل کی راہ کیا ہے - اپنا انداز بیان

کو ایسی جلا دیجیے کہ وہ ظلم کے لیے تلوار اور مظلوموں کے لیے بیداری کا صور بن جائے —

اور آپ کا مذہب کیا ہو؟ ٹیگور سے بھی کسی نے یہ سوال کیا تھا اور اس کا جواب دنیائے ادب کا جواب ہے !- "میرا مذہب وہ ہے جو ہر آرٹسٹ کا مذہب ہونا چاہیے - میں کسی ایک قوم یا مذہب یا ملک کا ترجمان نہیں ہوں - میری زندگی بنی نوع انسان اور جملہ اقوام کے لیے اور میرا پیغام ان کے ارتقا کے لیے ہے - میری روح زندگی اور انسانیت کی وحدت میں گم ہوگئی ہے اور میں مذہبی، قومی و طبقاتی پابندیوں کو توڑ چکا ہوں" —

اور آپ کا فرض کیا ہے ؟ جو ہر انسان کا فرض ہونا چاہیے - کروپاٹکن کے آگے بھی یہی سوال آیا تھا اور اس کا جواب ہر ایمان دار ادیب کا جواب ہے : "اگر تمہیں اپنے دل و دماغ میں جوانی کی امنگوں کا احساس ہوتا ہے، اگر تم زندہ رہنا چاہتے ہو، اگر تم پاک و صاف، مکمل اور ارتقا پرور زندگی سے سرفراز ہونا چاہتے ہو — یعنی اگر تم ان حقیقی مسرتوں سے محظوظ ہونا چاہتے ہو جن کی تمنا ہر ذی حیات کرتا ہے — تو مضبوط بنو، عظمت و وقار کے زینوں پر چڑھو اور ہر کام مستقل مزاجی سے انجام دو —

اپنے چاروں طرف زندگی کی تخم ریزی کرو - خبردار! اگر تم دھوکا دوگے، جھوٹ بولوگے، اور سازش کروگے تو آپ اپنی نظروں میں ذلیل ہو جاؤگے، قعرِ پستی میں جاگروگے اور تمہاری حالت اس غلام کی سی ہو جائے گی جو اپنے آقا کو اپنا خدا ماننے لگتا ہے ! اگر تمہارا رجحانِ طبع اسی طرف ہو تو یہی کرو لیکن اس حالت میں لوگ تمہیں کم زور، حقیر اور قابل نفرت سمجھنے لگیں گے اور تم سے ایسا ہی برتاؤ کریں گے - تمہاری طاقت کا کوئی ثبوت نہ پا کر عوام تمہیں قابل رحم سمجھیں گے — سوچو

رحم و کرم کے قابل ہو جانا۔ انتہائی ذلت ہے - اگر خود اپنی صلاحیت کے بال و پر نوچکے ہو تو دنیا کو دشنام نہ دو - اس کے خلاف خود کو کمر بستہ کرو اور اگر کہیں تمہیں کوئی بے انصافی نظر آتی ہو خواہ اس کی نوعیت کسی قسم کی بھی کیوں نہ ہو — تو تم اس جبر و ظلم اور ناحق کے خلاف بغاوت کر دو - جہاد کرو تاکہ ساری دنیا اطمینان کی زندگی بسر کر سکے - یقین جانو کہ اس لڑائی میں تمہیں جو روحانی مسرت حاصل ہوگی وہ اور کہیں نہیں مل سکتی — "

ٹیگور کے ادبی مضامین

-۶-

تاریخی ناول

(مترجمہ پنڈت ونشی دھر صاحب ودیا النکار)

انسانی معاشرے کا وہ بچپن کہاں گیا جب قدرتی واقعات اور مصنوعی انسانی خیالات بھائی بہنوں کی طرح ایک خاندان میں ایک ساتھ کھیلتے ہوئے بڑے ہوئے تھے - یہ کسی کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ ان واقعات و خیالات میں علیحدگی کی ایک بڑی خلیج حائل ہو جائے گی —

کسی زمانے میں رامائن اور مہابھارت تاریخ کی حیثیت رکھتی تھیں لیکن موجودہ تاریخ انہیں اپنے زمرے میں شامل کرنے میں بہت پس و پیش کرتی ہے - وہ کہتی ہے کہ شاعری کے ساتھ تاریخ کا بیاہ ہوجانے سے اس کا بنس مٹ گیا ہے - اب اس کے خاندان کو دوبارہ اُبھارنا اتنا مشکل ہوگیا ہے کہ تاریخ شاعری ہی کی شکل میں اپنا تعارف کرانا چاہتی ہے - شاعری کہتی ہے " بہن تاریخ ! تمہارے اندر بھی بہت کچھ جھوٹ بھرا ہے اور مجھ میں بھی بہت سی سچائیاں ہیں اس لیے ہم دونوں پہلے کی طرح میل ملاپ کرلیں - " تاریخ کہتی ہے " نہیں بہن ' اپنے اپنے حصے تقسیم کرلینا ہی اچھا ہے - " علم کے امین * نے ہر جگہ یہ تقسیم

زمین کے حدود کے متعلق جھگڑوں اور دیوانی مقدمات کا فیصلہ کرنے والے سرکاری *امین ں کو کہتے ہیں —

کام شروع کردیا ھے - حقیقت اور تخیل کی سلطنتوں میں حدبندی کے خطوط کھینچنے پر اس نے کمر باندہ لی ھے —

تاریخ کی حد عبور کرنے کے جرم میں تاریخی ناولوں کے خلاف جو اعتراضات کیے گئے ھیں ان سے ادبیات کا شیرازہ منتشر ہو رھا ھے —

اس قسم کا اعتراض صرف ھمارے ھی ملک میں نہیں کیا گیا ھے ' صرف نوین بابو * اور بنکم بابو ھی مجرم نہیں ٹھہرائے گئے ھیں ' بلکہ تاریخی ناول نویسوں کا پیشوا اور امام اسکاٹ بھی اس سے چھٹکارا نہ پاسکا —

موجودہ انگریز مورخین میں فری مین صاحب کا نام بہت مشہور ھے - ناولوں میں تاریخ کی جو مٹی پلید ھوتی ھے اس پر انھوں نے ناراضگی کا اظہار کیا ھے - وہ کہتے ھیں کہ صلیبی جنگوں کے بارے میں جو لوگ کچھہ بھی جاننا چاھتے ھیں انھیں اسکاٹ کا آئون ھو (Ivon hoe.) نہیں پڑھنا چاھیے —

بے شک ھمیں یورپ کی صلیبی جنگوں کے بارے میں حقیقت واقعی کا علم حاصل کرنا چاھیے لیکن اسکاٹ کے آئون ھو میں ابدی انسانی معاشرے کی دوامی سچائی کا عکس دیکھنا بھی ھمارے لیے ضروری ھے - صرف یہی نہیں لیکن اس کے جاننے کی خواھش اتنی زبردست ھوتی ھے کہ یہ جانتے ھوے بھی کہ صلیبی جنگوں کے متعلق اس میں بہت سی غلطیاں ھیں ' طلبہ ' پروفیسر فری مین سے چھپا کر آئون ھو کے پڑھنے کی ترغیب کو نہیں روک سکتے —

اب قابل غور سوال یہ ھے کہ کیا سروالٹر اسکاٹ تاریخی واقعات اور ادبیات کی حقیقت دونوں کا لحاظ رکھہ کر آئون ھو کو نہیں لکھہ سکتے تھے ؟ -

وہ لکھہ سکتے تھے یا نہیں اس کے متعلق قطعی طور پر کچھہ نہیں

---

* بابو بنکم چندر بنگالی زبان کے مشہور ناول نویس اور بابو نوین چندر تا ...

مشکل ہے لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اس کتاب میں تاریخ اور ادبیات کا لحاظ نہیں رکھا ۔

یہ ممکن تھا کہ انہوں نے جان بوجھ کر ایسا نہ کیا ہو ' لیکن واقعہ یہ نہیں ہے ۔ پروفیسر فری مین صلیبی جنگوں کے متعلق جس قدر جانتا تھا اسکاٹ اتنا نہیں جانتا تھا ۔ اسکاٹ کے زمانے میں واقعات کی تشریح اور تاریخی حقیقتوں پر غور و خوض کرنے کا طریقہ اس قدر ترقی پر نہیں تھا *

مخالفین کہیں گے جب اسکاٹ لکھنے کے لیے بیٹھا تھا تو لازم تھا کہ اچھی طرح سوچ سمجھ کر لکھتا لیکن تحقیق کا یہ سلسلہ کب ختم ہوگا ۔ ہم قطعی طور پر یہ کب جان سکیں گے کہ صلیبی جنگوں کے متعلق تمام معلومات حاصل ہو چکی ہیں ' ہم یہ کس طرح جان سکیں گے کہ آج جسے ہم تاریخ کی اٹل سچائی کہہ رہے ہیں کل نئے دلائل اس کے سر سے حقیقت کا تاج نہیں اتار لینگے ؟ جو لوگ موجودہ مروجہ تاریخ کا سہارا لے کر تاریخی ناول لکھیں گے کل کے نئے مورخین اگر ان ناولوں کی بے قدری کریں تو ہم اس کا کیا جواب دیں گے ؟

مخالفین کہیں گے کہ اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ جتنا جی چاہے ناول لکھو لیکن تاریخی ناول مت لکھو ۔ اگرچہ یہ خیال ہمارے ملک میں پیدا نہیں ہوا ہے لیکن انگریزی ادب میں اس کی بازگشت سنائی دے رہی ہے ۔ سر فرانسس پال گریو کہتے ہیں کہ تاریخی ناول ایک طرف تاریخ کا تو دوسرے طرف کہانی کا بھی بڑا دشمن ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ ناول نویس کہانی کی خاطر تاریخ پر حملہ کرتے ہیں اور پراگندہ تاریخ کہانی کو خراب کر دیتی ہے ۔ اس طرح کہانی کا سوال اور ہوگا ۔ دونوں نیست و نابود ہوجاتے ہیں ۔

اس قسم کے اعتراض کے باوجود تاریخی شاعری اور ناول ادبیات میں کیوں

جگہ حاصل کرتے ہیں اس مضمون میں ہم اس کے اسباب کی وضاحت کریں گے -

سنسکرت کی ادبی کتابوں میں شاعری ایک رس بھرے جملے کو قرار دیا گیا ہے - شاعری کے متعلق اس سے زیادہ مختصر اور وسیع المعنی تعریف ہم نے کہیں نہیں دیکھی - بے شک رس کی تعریف کو سمجھانے کا کوئی طریقہ نہیں ہے - جس شخص میں رس سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت ہے اس کے لیے رس کی تعریف بے معنی چیز ہے اور جس میں نہیں ہے اسے ان باتوں کے جاننے کی ضرورت ہی نہیں —

سنسکرت کی ادبیات میں اصلی رسوں کی نو قسمیں * بیان کی گئی ہیں - لیکن بہت سے ناقابل بیان اور ملے ہوئے (مرکب) رس بھی ہیں جنہیں بیان کرنے کی کوشش ہی نہیں کی گئی —

انہیں متروک رسوں میں سے ایک کا نام "تاریخی رس" رکھا جا سکتا ہے اور یہ رزمیہ رس شاعری کی جان ہوتا ہے —

کسی خاص شخص کا دکھ سکھ اس کی ذات کے لیے ہی کیا کم ہے - دنیا کے بڑے بڑے واقعات اس کے سامنے سایے کی طرح نظر آتے ہیں - اگر اس طرح کسی خاص شخص یا اشخاص کی زندگی کے واقعات کے مد و جزر، عمل اور رد عمل ناول میں بیان کیے جائیں تو رس درجۂ کمال کو پہنچ جاتا ہے اور رس کا یہ جوش ہمارے دل پر گہری چوٹ کرتا ہے - ہم میں سے بہتوں کے رنج و راحت کا دائرہ محدود ہے - ہمارے جذبات

---

* نو قسمیں یہ ہیں - (۱) شرنگار یعنی عشقیہ - (۲) ہاسیہ یعنی مضحک - (۳) کرن احساس غم پیدا کرنے والا - (۴) ویر یعنی رزمیہ - (۵) رودر یعنی غصہ پیدا کرنے والا - (۶) بھیانک یعنی ڈراونا - (۷) بی بھتس یعنی نفرت انگیز - (۸) ات بھت حیرت انگیز - (۹) شانت جس میں سکون ہو -

کی گرمی چند رشتہ داروں اور احباب تک پہنچ کر ختم ہوجاتی ہے - وش ورکش * میں نگیندر ' سوریہ مکھی اور کند نندنی کے عیش و کلفت اور رنج و راحت کو ہم اپنا ہی سمجھ سکتے ہیں کیونکہ ان تمام تکلیفوں اور راحتوں کا مرکز نگیندر کا خاندان ہے - نگیندر کو اپنا پڑوسی تصور کرنے میں ہمیں کوی دقت نہیں ہوتی ہے

لیکن دنیا میں بہت کم لوگ اس بام رفعت تک پہنچتے ہیں دکھہ سکھہ دنیا کے بڑے بڑے واقعات کے ساتھہ وابستہ ہوجائیں - حکومتوں کا عروج و زوال ' زمانے کے آئندہ واقعات کا سلسلہ ' ان کی روز مرہ کی زندگی ہی کے کار نامے ہیں - ان کی کہانی جب گیت بن جاتی ہے تو رباب عالم اس کے سر کم ٹھیک کرتا ہے اور بجانے والے کی انگلیاں ہر تار میں ایک عجیب ' پرسکون اور بہت دور تک پھیلنے والی مسلسل جھنکار کو بیدار کردیتی ہیں —

انسان کے ساتھہ زمانے کی یہ رفتار ہمیں روزانہ دکھائی نہیں دیتی قوم کی تاریخ ' کو بدلنے والا اس قسم کا کوئی بڑا آدمی اگر ہمارے سامنے موجود ہو تو بھی موجودہ مختصر زمانے میں وہ اور اس کے کارنامے دونوں اکٹھے نظر نہیں آسکتے - اس لیے اس قسم کے لوگوں کو ہم انہیں کے زمانے میں ٹھیک طور پر نہیں دیکھہ سکتے - انہیں اگر ہم ایک خاص شخص کی شکل میں نہیں بلکہ زمانے کے ایک جز کی شکل میں دیکھنا چاہیں تو ہمیں ان سے دور کھڑا ہونا پڑتا ہے ' انہیں ماضی کے پس منظر میں رکھنا پڑتا ہے ' وہ جس عظیم الشان اسٹیج کے ہیرو تھے انہیں اور اس اسٹیج کو ملا کر دیکھنا پڑتا ہے —

* مشہور بنگالی مصنف بنکم چندر چٹرجی کا ناول ہے —

ہمارا روزانہ کے دکھ سکھ سے دور ہوجانا یعنی جب ہم نوکری کرکے، روکا کر، کھا پی کر وقت گزار رہے ہوں اس وقت دنیا کے شارع عام پر جو بڑے بڑے رتھ بان دنیا کے رتھ کو چلاتے ہوے جا رہے ہیں، چند لمحوں کے لیے ان کا خیال کرکے زندگی کے اس تنگ دائرے سے باہر نکل آنا، یہی حقیقی طور پر تاریخ سے لطف اندوز ہونا ہے —

ایسا نہیں ہے کہ اس طرح کے قصے کامل طور پر تخیئلی نہیں ہوسکتے لیکن جو قصے قدرتاً ہم سے دور ہیں جو ہمارے علم سے بالا تر ہیں، انہیں کسی بہانے سے اگر ہم حقیقی واقعات کے ساتھ ملا دیں تو مصنفوں کے لیے، پڑھنے والوں کے دل میں اعتماد پیدا کرنا آسان ہوجاتا ہے - رس کی تخلیق ہی مقصد ہے - لہذا رس پیدا کرنے کے لیے تاریخی ذرائع کی جس قدر ضرورت ہوتی ہے شاعر ان سے کام لینے میں کسی قسم کا پس و پیش نہیں کرتے —

شیکسپیر کے انٹنی اور کلیو پٹیرا ڈراما کا جو مرکزی نقطہ ہے وہ دنیا کے لیے ایک آزمودہ اور روز مرہ کی جانی بوجھی حقیقت ہے - بہت سے غیر معروف، گمنام اور قابل اشخاص نے عورتوں کے موہ لینے والے جال میں پھنس کر دین و دنیا خراب کرلی ہے اور اس طرح کی چھوٹی چیزوں کے اہم بن جانے سے جو تباہ کن نتائج پیدا ہوتے ہیں ان کے حسرت ناک مناظر سے تاریخ بھری پڑی ہے —

ہمارے روزمرہ کے دیکھے بھالے مرد اور عورت کی محبت کے زہر اور امرت بھرے کار ناموں کو شاعر نے ایک عظیم الشان تاریخی اسٹیج پر لاکر نہایت وسیع اور شان‌دار بنا دیا ہے - ذہن کے انقلاب کے بعد مسلک کا انقلاب شروع ہوتا ہے - محبت کی کش مکش کے ساتھ روم کے تمام لوگوں

میں پھوٹ ڈالنے والی زبردست جنگ کی تیاری ہوتی ہے - ایک طرف کیلوپیٹرا کے نشاط خانے میں غزل خوانی ہو رہی ہے اور دوسری طرف سمندر کے کنارے طبل جنگ گونج رہا ہے - شاعر نے محبت اور احساس غم کے رس کے ساتھ تاریخ کا رس ملادیا ہے - اس لیے اس ڈرامے میں دل کو ایک حیرت انگیز وسعت مل گئی ہے —

مورخ ممسن اگر شکسپیر کے اس ڈرامے کو عالمانہ حوالوں کی روشنی میں دیکھے تو اس میں سہو زمانی (Anachronism) اور تاریخ کی بہت سی غلطیاں نظر آسکتی ہیں - لیکن شیکسپیر نے پڑھنے والوں کے دلوں پر جو جادو کردیا ہے ' غلط اور بگڑی ہوی تاریخ کے ذریعے جس تاریخی رس کی تخلیق کی ہے وہ جدید تاریخی تحقیقات کے باوجود بھی مٹ نہیں سکتا -

اسی لیے ہم نے اس سے پہلے کسی تنقیدی مضمون میں لکھا تھا کہ "ناول میں تاریخ کے مل جانے سے ایک خاص رس پیدا ہوجاتا ہے - ناول نویس صرف اسی تاریخی رس کے حریص ہوتے ہیں - تاریخی حقیقت کی انہیں کوئی خاص پروا نہیں ہوتی - اگر کوئی شخص ناول میں تاریخی رنگ و بو سے مطمئن نہ ہو اور اس میں سے پورے تاریخی اجزا کو نکالنے لگے تو یہ گویا سالن میں زیرہ ' ہلدی ' دھنیا اور سرسوں کی تلاش کے مصداق ہے - مسالے کو ملا کر جو لوگ سالن کو لذیذ بنا سکتے ہیں وہ بنائیں اور جو اسے پیس کر سالن میں ڈالتے ہیں ان سے بھی ہمیں بحث نہیں کیونکہ یہاں صرف مزے سے غرض ہے مسالا تو اس کا ایک ذریعہ ہے - یعنی ناول نویس اگر تاریخ کو جوں کا توں رکھ کر ناول لکھیں یا اس کے اجزا ملا کو تاریخی رس پیدا کرسکیں تو انہیں اپنے مقصد میں کامیاب سمجھنا چاہیے -

اس لیے اگر کوئی رام چندر کو ادنیٰ اور راون کو اعلیٰ حیثیت

میں پیش کرے تو کیا کوئی جرم نہ ہوگا؟ ضرور ہوگا - لیکن وہ جرم بلحاظ تاریخ نہیں بلکہ بلحاظ شاعری ہوگا - مقبول عام حقیقت کو ایک دم پلٹ دینے سے رس کا مزا جاتا رہتا ہے - گویا مطالعہ کرنے والوں کے سر پر ضرب سی لگتی ہے اور اس سے شاعری چست ہوکر گر پڑتی ہے —

یہی نہیں! اگر کسی جھوٹی بات کو بھی مدت سے عام لوگ سچ مانتے چلے آرہے ہوں اور اگر تاریخ اور سچائی کے لیے شاعری اس کے خلاف احتجاج کرے تو یہ شاعری کا جرم ہوگا - تصور کیجیے کہ اگر آج بغیر کسی شبہ کے یہ ثابت ہوجائے کہ شرابی اور بے اصول یادؤں کا خاندان یونانی قوم میں سے تھا اور سری کرشن بنوں میں آزادی سے گھومنے والا اور بانسری بجانے والا یونانی قوم کا ایک گوالا تھا' اگر یہ ثابت ہوجائے کہ اس کا رنگ اس کے بڑے بھائی بلدیو کے رنگ کی طرح گورا تھا' اگر یہ ثابت ہوجائے کہ جلا وطن ارجُن ایشیاے کوچک کی کسی یونانی حکومت سے یونانی شہزادی سوبھدرا کو جیت لایا تھا اور دوارکا سمندر کے کنارے ایک چھوٹا سا جزیرہ تھا' اگر یہ ثابت ہوجائے کہ جلا وطنی کے وقت پانڈووں نے فن جنگ کے ماہر عالی دماغ یونانی بہادر کرشن کی مدد سے اپنی حکومت دوبارہ حاصل کرلی تھی اور اس کی باکمال غیر قومی سیاست' جنگی مہارت اور ایسے مذہب کا علم جس میں عمل کی بڑی اہمیت تھی اِن خصوصیات سے حیران ہوکر ہندوستان نے اسے اوتار مان لیا تھا' تو بھی وید ویاس کی مہابھارت نہیں مٹ سکتی اور کوئی نیا شاعر جرأت کرکے کالے کو گورا نہیں بنا سکتا —

ہم نے یہ باتیں سرسری طور پر کہی ہیں - نوین بابو اور بنکم بابو اپنی شاعری کی کتابوں اور ناولوں میں مروجہ تاریخ کے خلاف اتنی دور

جا پڑے ہیں یا نہیں جس سے شاعری کا رس جاتا رہا ہے ' اس کا اندازہ ان کے گرنتھوں کی خاص تلقید کے وقت ہی کیا جا سکتا ہے —

اس حالت میں ہمارا کیا فرض ہے ؟ ہمیں تاریخ پڑھنی چاہیے یا آئون ہو؟ اس کا جواب بہت آسان ہے - دونوں پڑھنے چاہئیں - حقیقت کے لیے تاریخ پڑھنی چاہیے اور لطف کے لیے آئون ہو - کہیں ہم غلطیوں ہی کا علم نہ حاصل کرلیں ' اس خدشہ سے جو شخص شاعری کا لطف نہ اٹھائے گا اس میں شئے لطیف کی کمی آجائے گی —

شاعری میں جو تاریخی غلطیاں ہمیں نظر آئیں گی ہم انہیں تاریخ میں درست کرلیں گے لیکن جو شخص صرف شاعری کی کتاب پڑھے گا اور تاریخ پڑھنے کا موقع نہ پائے گا وہ بد نصیب ہے اور جو شخص صرف تاریخ ہی پڑھے گا اور اسے شاعری کے مطالعے کا موقع نہ ملے گا غالباً یہ شخص پہلے سے بھی زیادہ بد نصیب ہے —



سخنوران ایران در عصر حاضر

از

(از جناب آغا محمد تقی "پارسا" شیرازی پروفیسر اورنگ آباد کالج)

جنبش ادیبانه و مسافرتِ دانشمندانهٔ جناب آقا ... محمد اسحاق

نوید زندگی بخشی میدهد و آیندهٔ بسیار درخشانی را بما نزدیک میکند - کم کم ذوق و شوقِ علمی و تشنگی و اشتهائی صادق در مشرق پیدا می شود - آهسته آهسته حاسهٔ دانش پژوهی و چشم بصیرتِ مشرقیان بیدار گشته رفته رفته احساس حقیقت جوئی و عاطفهٔ تحقیق طلبی آنان را تکان داده بجنبش انداخته است از پی راههٔ تقلید بیرون آمده بشاهراهٔ تحقیق افتاده اند - این بهترین نشانِ درخشان و علامتِ نمایان بیداری مشرقیان است -

رازِ ترقی اروپا

ترقی اروپا از یک نقطهٔ بسیار مهمی آغاز گشته و رفته رفته بزرگ گردیده و بالاخرهٔ به تمام شئونِ زندگی محیط شده است —

اروپا رهین منت آن اشخاص با همت و حوصله مند است که با پائمردیِ زحمت در شاهراهٔ تحقیق و انکشاف افتاده اند و پافشاری نموده هر چیز را در جا و محلِ آن تحقیق و انکشاف کرده اند ' کیمیا و طبیعیات را در عالم تجزیه و مشاهده و تجربه ' جغرافیاے بحری را در دریا و بری را

در کوه و صحرا ' زبان بیگانگان را در وطنِ آنان و همچنین هر چیز را از راه خودِ آن و درجا و مرکزش تحصیل و تحقیق کرده اند - سپس باهوش کافی و موشگافی آن راه مرتب ساخته اشاعت داده اند و در نمایش گاه عالم عملی گزارده اند —

پایهٔ بلند ایران شناس بزرگ و معروف استاد ادورد برون مرحوم (Edward Brown) نیاز مند معرفی نمی باشد - این استاد بزرگوار برای تحقیقات ادبیات زبان فارسی از انگلستان رهسپار ایران گردیده - کوه و بیابان را در نوردیده رو بمرکز نموده داخل محیط ادبیات زنده شده است - جلیس ادباء' انیس شعرا ' همنشین خاص و عام گشته - وضع مملکت را مطالعه کرده - باروح ادبی' احساسات شعری' عواطف ملی' آداب و اخلاق و نفسیات ایرانیان آشنا شده - نه تنها ایران شناس شده بلکه متخلق به آداب ایرانیان گشته ' محفل آرا' مهمان نواز' ایران پرست گردیده - پس قدم در جادهٔ ادب گذاشته و قلم تحقیق را بحرکت آورده است - همیشه و هرجا از خامه وزبان او روح' عواطف' احساسات ایرانی تراوش میکند و با این حال تاریخ ادبیات ایران نوشته است - این است رفتار یک محقق اروپائی که از راه دور و دراز باوجود بیگانگی ادبی و اخلاقی و زبانی رو بایران میکند —

حال می رویم بر سر مطلب - اردو زبان 'مشرقی 'همسایهٔ ایران ' که یگانگیِ ادبی ' اخلاقی با فارسی زبانان دارد' و روح ادبیات هر دو یکی است ' باید برای تحقیقات ادبیات فارسی توجه مرکز کرده خود داخل محیط ادبیات زنده شود' و خود برای تحقیق ادبیات شاهراه نزدیکی کشف کند' نه که مانند مقلدین گمراه شده راه دور و دراز پیش گرفته

خود را گول زده و دیگران را هم فریب دهند -

بنابرین مسافرت جناب محمد اسحاق و تالیف کتاب " سخن وران عصر حاضر " آیندهٔ درخشانی را بما نزدیک میکند —

سرپرستیِ هندوستان از فارسی گزشتهٔ درخشانی را تربیت و پرورش داده است - آقا سعید نفوسی تاریخ و تذکرهٔ ادباء و شعراء فارسی زبانان هند را تالیف کرده اند و بسیار پسندیده است - سلسلهٔ ادبی هندوستان و ایران گسیخته شد و مسئولیت هندوستان دو چند شد (انگریزی' اردو) مگر تعلقات اردو و فارسی بحال خود باقی ماند ' و هندوستان مستقیم و غیر مستقیم باز از فارسی سرپرستی کرده دست از نوازشهایِ ادبی نکشید - باز در همین قرن جدائی دست و زبان ادب پژوهان هندوستان ادب و زبان فارسی را در هند زنده نگاه داشته است - و فقط تاریخ همین قرن دربارهٔ ادبیات و زبان فارسی در هندوستان محتاج نگارشِ رسالهٔ جداگانه است - و این جا فقط به سه خدمت بزرگ اشاره می شود —

(۱) شعرالعجم - از علامهٔ بزرگ مرحوم شبلی نعمانی این اعجوبهٔ دهر در شعر عجم شناسی یکتا و بے مانند است در پنج جلد تاریخ ادبیات شعریِ فارسی تصنیف نموده و با کمالِ استادی و نکته سنجی تاریخِ روحی و شعریِ شعراء را توضیح و تشریح نموده و عظمت روح شعریِ فردوسی و سعدی و حافظ را در نمائش گاه عالمِ ادبیات بے پرده کرده است و به روانِ قدما و متوسطین و متاخرین تر و تازگی بے اندازه بخشیده است —

(۲) جناب دکتر اقبال که با زبان فارسی مقاصدِ حکیمانهٔ خود را سروده اند و در عالم ادبیات یک فلسفهٔ جدیدی اضافه نموده اند - چون ایشان

در فلسفهٔ مغرب نیز أستادند و با ذوق شعری اروپائی آشنا فوق‌العاده
اشعار ایشان تجدد معنوی وفکری دارد ، و زبان فارسی را آئینهٔ تفکرات
جدید خود قرار داده‌اند ، افکار ابکار ایشان که در زبان فارسی سروده
اند شهر تی‌بارو پاهم رسیده و از زبان فارسی‌بزبان خارجه ترجمه شده است -
(۴) " سخن وران عصر حاضر " است که موضوع این تبصره است

قدر و قیمت سخن وران عصر حاضر

تعلقات اردو به فارسی

فارسی با شاهنشاهی مسلمانان به هند درآمده باهم فرمان فرمائی
می کردند - سرانجام سلطنت مسلمانان روبزوال نهاده فارسی پائداری
کرده به شکل و قالب دیگر درآمده و نام نوی بخود گرفت - یعنی روح فارسی
با تمام معنی (ترکیبات ، تشبیهات ، استعارات وغیرها) در قالب تازه
حلول کرده باسم اردو باز دست از فرمان فرمائی نکشید - امروزه میتوان
گفت در هندوستان ، هیچ زبانی مانند اردو عمومیت ندارد و شمارهٔ اردو
دانان (هنود و مسلمانان و اروپائیان) از تمام زبانهای بومی و بیگانه بیشتراست
از کابل گرفته تا مندله (Mandalay) زبان اردو آلت تبادلهٔ خیالات اقوام
گوناگون است - بلکه به ساحلهای دور دست نیز دست اندازی کرده است
در بیرون هند زبان این مملکت را همین زبان اردو میدانند و بس - از زبان
هندی و هندوستانی تنها اردو میخواهند در جا های که برای کار و بار تدریس زبان
این مملکت میدهند همان اردو است - کسی بخواهد یا نخواهد ، بداند
یا نداند ، کشور پهن و دراز هند میدان و جولانگاه اردو است - و آن زبان
بومی که ادعای مقابلگی با اردو می کند دائرهٔ مختصر تنگی دارد - اردو
یک زبان عجیبی است شاید نظیر نه داشته باشد - مدارج ارتقاء خود را

در کمترین وقت طے کرده' و خزانۂ ادبیات خودرا مخصوصاً نظم' زود معمور و آباد نموده است - نثر و زبان علمی نیز بسرعت شگفت انگریزی دارد خود را بسر منزل خویش نزدیک می کند - اگرچه اردو هندی الوطن است و شمائل آن شباهت ظاهرئی تامی بزبان هندی دارد مگر روح آن و حرکات و سکنات از فارسی است' وروح فارسی باتمام معنی و جمیع خصوصیات درآن حلول کرده است - اگر اردو بخواهد قطع بستگی خود از فارسی بنماید اولاً خزانۂ ادبیات خود را بدست خویش آتش میزند ثانیاً باید بطور قهقری برگشته در عالم نشو و نمائی طفولیت در آید و این خلاف قانون فطرت است - به فرض محال در آں حال نه ادبیات نه نظم و نه لغت می ماند و اردو مفلس محض می شود - سخن کوتاه از اردو تنها یک نام باقی می ماند - نام هم (اردو) از بیرون آمده کشتنی است یا باید تبعید (شهر بدر) شود - اردو یادگار عهد زرین اتحاد مسلمانان و هنود است - روح و خیال از مسلمانان و ساخت جسم از هندی است -

بنابرین اطلاع از ادبیات عصر حاضر برائے اردو دارائے اهمیت است هر دو دورۂ تکامل را دارند طے می کنند - هر دو اشتراک روحی دارند - بالآخره تجددات فارسی را باید بغور مطالعه کرد - هرچه برائے اردو مفید است باید اختیار نمود و هرچه زیان بخش است پرهیز ازان لازم است —

مسافرت دانشمند محترم آقا محمد اسحاق دارائے اهمیت است -

' اول' محققانه براه راست افتاده در محیط ادبیات زنده رفته اند -

' دوم' تنها ذوق علمی' شوق مشاهده' حس حقیقت جوئی محرک این سفراست -

' سوم' سفر نتیجۂ تحقیقی خود داده وسه جلد بزرگ ادبیات عصر حاضر فراهم وجمع آوری کرده اند -

'چهارم' ایشان اول محققی است که ادبیات زبان حال را محققانه در ایران
جمع کرده و هندوستان و ممالک دنیا را بآن آشنا می کند -

آوازهٔ چهار جلد تاریخ ادبیات ایران تالیف استاد بزرگ مرحوم
ادورد برون (Edward Brown) بگوش ادب پژوهان رسیده و بیشتر آن را
خوانده اند - استاد مرحوم از آنجا که دست رس تحقیق بوده آغاز کرده*
و بزمان حاضر خاتمه میدهد و زندگئی مرحوم همین جا انجام یافت - ادبیات
زبان حاضر منتظر استاد و محققیء دیگر بود - در واقع این سه جلد ادبیات
عصر حاضر متمم و مکمل چهار کتاب استاد برون مرحوم است - لاکن این
چهار جلد تاریخ ادبیات است و سه جلد عصر حاضر ادبیات است و تاریخ و تذکرهٔ
مختصر و منهدی هم دارد - امید است آینده جلبهٔ تاریخی بیشتری پیدا کند —

کتاب "سخنوران عصر حاضر" دارائی سه جلد است - جلد اول طبع و مجلد
شده زیر مطالعهٔ نگارنده است - جلد دوم زیر طبع است - و این هردو
در ادبیات شعری است - وجلد سوم فقط ادبیات نثری است - هر سه جلد
(نظم و نثر) ادبیات عصر حاضر است یعنی دورهٔ مشروطه (از سال ۱۳۲۵ تا
عدل مظفری) لاکن تا هر سه جلد ملاحظه نشود آغاز حقیقیء این ادبیات
نمی توان نوشت - تبصره و انتقاد کامل هم بعد از مطالعهٔ سه جلد ممکن
است - کنون تنها تبصرهٔ مختصری دربارهٔ جلد اول که مطالعه شده است
ذیل نگاشته می شود —

(ا) کاغذ ' طبع ' خط ' عکس ' جلد بندی آبرومندانه است - واین نیز یکے
از علامتهاے نمایانِ بیداریِ مشرق است - کارکنان مطبعهٔ جامعهٔ ملیه دهلی
مستحق تحسین و آفرین هستند - کتاب با سلیقهٔ خوب و اسلوب مرغوب
مراحل زیبائی را طے کرده و بحد کمال رسیده است —

(۲) دارائی تقریظی است از استاد معظم جناب جمال زاده و ایشان با چشم حقیقت شناس اظهار حقائق کرده اند —
(۳) دیباچۂ خود جناب محمد اسحاق است که نظریات محققانۂ خود را مفید و مختصر بیان نموده اند —
(۴) انتخاب قسمت اول از اشعار 'سخنوران عصر حاضر' که موضوع حقیقی این تبصره است کنون تبصرۂ مختصری نوشته و انتقادِ سرسری نموده قدر و قیمتِ ادبیِ کتاب به نظر ادب پژوهان می رساند —

حسنِ انتخاب

نگارندهٔ ایرانی' معلم' هر از دو سه سال یک دفعه تجدید عهد کرده رهسپارِ ایران شده و در شهر ها و ایالات گردش نموده است و چندین بار در طهران قریب دو سال توقف داشته است و با بعضی شعرا آشنا' و با اشعار عصر حاضر با خبر - و خود در همین دوره نشو و نما یافته است - نگارنده انتخاب را دیده خوبی و زیبائی آن تعجب خیز و طرب انگیز است - تعجب خیز است که چگونه یک نو وارد توانسته است با صدها ادبا و شعرا آمیزش کند و عالم ادبیات آنان را جولانگاهِ نظر محققانۂ خود نموده و نقشۂ روحیِ ایشان را با مشقتها برداشته باین ارزانی در عالم ادبیات نمائش دهد - ازین جهت طرب انگیز است که بعد از ملاحظه و مطالعۂ کتاب روشن می شود که محقق باوجدان و طبع سلیم و در حسن انتخابات به احسن وجوه کامیاب است - و اسبابِ کامیابی را همه آماده کرده اند —

اول جناب منتخب در فارسی متبحر' دوم در دارالفنون کلکته استاد بزرگ فارسی' سوم محرک ذوق علمی و اشتهاے صادق است' چهارم توجه بخود ایران کردن' پنجم مشرقی و اردو زبان' ششم اشتراک اخلاقی و

ادبی' هنگم ندیده باید گفت با اخلاق عالمانه موردِ توجهٔ عموم ادباء شده '
و بواسطهٔ اشتهاے صادق شبانه روز رنج کشیده و آرام را برخود حرام کرده
اند - تنها یک حسِ حقیقت طلبی بر وجود ایشان فرما بوده است -

قدر و قیمت ادبیِ کتاب

انقلابات سیاسی ' آزادی' فکری ' تجددی ' اخلاقی ' تمدنی ' اجتماعی'
نیز از کتاب تا اندازهٔ میتوان بدست آورد - و بالاتر از همه درجه انقلاب
و تغیراتِ ادبی میتوان کشف کرد و دانست و فهمید که ادبیات فارسی
راه مشی خود را تغیر داده است و از عالم تنگ و تاریک بیرون آمده
در جهانِ روشن و گشاده پا گزاشته است و کم کم دارد خرد را به سرِ منزل
آیندهٔ خویش نزدیک می نماید - امید است بحدّ کمال رسیده در فضاے
علمی یک ملت هم آهنگ و یک تودهٔ یک نواخت بار آورد —

انقلابات و تغیرات زبان فارسی (زبان شعری)

یک جهتی و یک نوائی و عمومیت زبان است - و این وجه داراے
اهمیت فوق العادهٔ است و باید با نظرِ عمیق آنرا نگریسته در اطراف آن
سخن سرائی کرد - پیش ازین دوره زبان فارسی اسیر دسته بندی و گرفتار
پنجهٔ ادباء و شعرا بود و طبقهٔ شعرا صاحب امتیاز و فعال مایشاء بودند -
علماے دین را مذهبی ' شعرا را شعاری ' منشیها را شیوهٔ و ادباء را دابی'
دولتیان را تسلطی خاصی بود - عوام یک جادهٔ ساده و راهی هموار و روشی
طبیعیِ خدا دادی داشتند - زبان هم مانند مذهب سروکارش به دسته بندی
کشیده بود - نشیب و فراز' پستی و بلندی زبان به نظر خوانندگان رسید -
در زمان محمد شاه (۱۲۵۰ تا ۱۲۶۴) بدستیاری چند نویسندهٔ بزرگ تا اندازهٔ
خوبی زبان هموار و یک رخه گردیده بود به پائمردیِ " قائم مقام " و " فاضل خان

کروسی" و چند استاد دیگر سادہ نویسی و مطلب نگاری بروے کار آمدہ بود - و بہ کاستنِ برگ و شاخ انبوہ باغ سخن آرائی تروتازگئی نوی یافت - و این روش پیش رفت کردہ در آغاز (۱۲۶۲ھ) ناصرالدین شاہ و وزارت میرزا تقی خان یک دفعہ جنبش خود را تیز نمود - اصطلاحات ملکیِ میرزا تقی خان ' افتتاح دارالفنون (کالج) ' آشنائی بافرنگ ' شناسائی زبان فرانسہ ' ہمہ دست بہم دادہ راہِ تغیرات و ترقیات وسیع شد - افسوس بازہم افسوس کشتہ شدن مرحوم میرزا تقی خان ' چرخ ترقیات را از کار انداخت و حرکت ادبی نیز سست گردید - خلاصۂ این مطلب از موضوع بحث بیرون است - مقصود این بود کہ یادآوری شود کہ ادب جدید دورۂ مشروطہ دفعتاً و ناگہانی پیدا نہ شدہ است عوام در ہر چیز خوف زدہ شدہ اند و از چہار جہت خواص بر ذہن سادۂ عوام حملہ می کردند - (۱) از جہتے دورباش شاطران استبداد - (۲) از جانبے کور شو علم برداران شریعت - (۳) از سمتے قلنبہ گوئی ادیبان - (۴) از طرفے مشکل تراشیِ شاعران' ناچار طبیعت عوام کند و ذہن شان کور شدہ بود - بہ شنیدن و نہ فہمیدن و خواندن و نہ سنجیدن عادت کردہ بودند بہترین تعریف عوام برائے واعظ آن بود ' سبحان اللہ خیلے عالم است ' کسی حرفش نمی فہمد - این حرف را باسادگی برائے بزرگواریِ واعظ می زدند در واقع درست می گفتند - واعظ خودش ہم کلام خویش نمی فہمید گویا نافہمی ہم مانند فہم محتاج استاد است و نادانی ہم مثل دانائی از بزرگ بکوچک میرسد - در حقیقت چنین است عوام حق دارند رفع تہمت از خود نمودہ در مقام مدافعہ بر آمدہ بگویند - درست است نافہمی و نادانی بیماری است و متعدی می باشد مگر از بزرگ بکوچک رسیدہ ' از بالا بپائین آمدہ است' مرض خاص است لاکن مرض عام شدہ ' آب ازسرچشمہ گِل آلود است -

برائے استقلال مملکت وجودِ عوام لازم شد لهذا شعراء بزبانِ ایشان و برائے ایشان اشعارِ ملی و مصائبِ مملکتی سرودن گرفتند - هیچ مملکتی بدون پشتیبانیء اکثریت بمقصود نمی رسد و در واقع اکثریت مالکِ ملک است و اکثریت همیشه زنده است و زبانِ اکثریت زبانی است که قابلِ بقا و ارتقا است. پس باید اولاً زبان را یک جهت ساخت و همزبان با عوام شد بعد شروع بمقصود نمود - ادباء، خطبا، شعراء ایران مطلب را درک نموده با عوام یک جهت و همزبان شدند - و همزبانی اثرِ خود را کاملاً بخشید و ملتِ جاهل نادان و بے خبر به جنبش افتاد - در مملکت شعری، ملتِ حساس شعرهاے ملی را وردِ خود ساخت، ذوقِ شعریِ آں قوی شد و اشعار قلوب آنها را مسخر کرد —

اشعار عشقی، عرفی، ایرج میرزا، سید اشرف الدین، مانندِ برق زبان زدِ عام و خاص گردید - تعجب اینجا است که بهمان درجه که خواص ازین اشعار متاثر می شوند و چند درجه بیشتر عوام متالم می گردند و می فهمند این گونه اشعار بایک لهجۂ نمکین و زبانِ ساده احتیاجات ملی، مصائب مملکتی را با احساسات ملی و عواطف قومی ذهن نشینِ عوام می کند و این بزرگ ترین مدرسه است —

طلوعِ مشروطه و آزادی، پیش آمد یک مقصود عمومی، مصائب ملی، احساسِ احتیاجاتِ مملکتی، ملت ایران را با هم متحد کرده هم زبان ساخت و زبان فارسی بایک سرعت شگفت انگیزی گریبان خود را از دست تفرقه بیرون آورده در شاهراه یک جهتی افتاد - امید است آینده یک فضائے علمی، یک محیط هموار، یک ملتِ یک ساختی را بار آورد - طلوع مشروطه زبان را آزاد و قلم را توانا ساخت - پیش آمدن یک مقصود عمومی نویسنده و

گوینده را بسیار کرد - مصائب ملی خواننده و شنونده را فراوان نمود - احساس احتیاجات مملکتی مشیِ زبان را تغیر داد و شعرا از مقام خدائی خود پائین آمده همزبانِ عوام شدند- مراعات ذهن آنها نموده بفهم ایشان شعر سرودند - ادیبان و گویندگان سخنان خود را عوامانه ادا نمودند کم کم الفاظ عامیانه و بازاری راه و رخنه یافته زبان زد ادبا و شعرا شده زبان را ساده و شیرین تر گردانید - عوام نیز با شوق و ذوق نزدیک آمده و برائے مطالب فهمی آماده شدند و از عالم تنگ و تاریک بیخبری بیرون آمده به دنیائی نوی داخل گشتند - اشعار وطنی ' سرود هائے ملی بهترین معلم ایشان شد ایشان را سر گرم و پر جوش ساخته هنگامۂ انقلاب را گرم کردند - برائے آزادی و آبادی نعرۂ " زنده باد انقلاب " از جگر برکشیده رستخیز عام و محشر ملی بر پا شد - با پشت کاریِ خواص و پشتبانیِ عوام کاخِ استبداد سر نگون گردیده سلطنت ملی شد ---

وطنیات

ادبیاتِ شعریِ فارسی پیش از مشروطه یک دنیای پهنا ور ممتازی است و پهناوریِ آن زیاده تر از درازی است - یعنی موضوع کوتاه ' مضمون کم و بد بختانه مکرر است بعبارت دیگر مضمون و موضوع کم و شاعر بسیار - از اینجا است که یک موضوع کوچک خسرو شیرین ' لیلی مجنون ' فرهاد شیرین ' یوسف و زلیخا ' میدان مقابله و مبارزۂ شعرا است و شعراء بزرگ برائے یک موضوع کوچک بجان هم افتاده‌اند گویا عالمِ خیال هم مثل عالمِ معیشت تنگ شده و میدان تنازع البقا پیش آمده است لاکن در حقیقت مسئله تنازع للبقا فقط برائے نان نیست اگر هست برائے جان است و جانِ شعری بالا تر از جانِ نانی است - بد بختانه بیشتر شعراء ایران برائے نان شعر می

گفتند وهر دو میدان برائے آنان تنگ بود - تمام افراد بلی آدم برائے نان جان می دهند - آدم برائے نان خام (گندم) دست از نعمتهائے بهشت کشید - اگر اولاد او برائے گندم پخته (نان) بجانِ یکدیگر بیفتند جا دارد - سخن کوتاه ' مضمون محدود ' استاد معدود ' نابغه کمیاب ' شاعر بسیار ' دائرهٔ شعر وسیع تعریف شاعری ازان وسیع تر است وکشور شعر حد و کنارہ ندارد - آزادی و صلاے عام است —

هر که خواهد گو بیا و هر که خواهد گو برو
گیر و دار و حاجب و دربان درین درگاه نیست

بلی ولی استاد کم است و نابغه نادر نه تنها در دنیائے شعر بلکه در هر چیز و هر جا و همیشه نابغه کمیاب است - گویا روزگار درین باره امساک و بخل کرده است فقط وضع جغرافیائی سبب کمیابیِ شعراء بزرگ نیست بلکه سبب اصلی قناعت و کفایت شعاریِ طبیعت است - فقط چند استاد بزرگ نابغهٔ دنیائے ادبیات پیش از مشروطه شدند و همین چند تن نابغه کشور ادبیات را فتح کرده اند وهمه مستحق تکریم و احترام هستند - و دیگران هم در مرتبهٔ خود خدمت کرده اند و مستحق تعریف می باشند - درین جا فقط دو نابغهٔ بزرگ ذکر می شود —

فردوسی نه تنها نابغهٔ ادبیات است بلکه بواسطهٔ ایجاد موضوعِ مهم و مفیدی ' دارائے مقام بلندی است - این نابغهٔ نادره ' بقاء ملت ' زبان ' آداب و رسوم ملی ' تاریخ مختصراً هر چیز ملی و وطنی را درنظر گرفته پس یک عمر جانکاهی نموده و سراپا خدمت به ابنائے وطن کرده است وملت ایران را از پامالی و تباهی نجات داده است - سعدی نیز تنها نابغهٔ شعری نیست بلکه بایک طرز بلیغ و یک اسلوب شیوا اصلاحات ملی را

پیش نهاد خود نموده است و پادشاه و وزیر' رند و زاهد ' جوان و پیر' توانگر و فقیر ' تعلیم و تربیت ' اخلاق ' ظلم و عدل ' عشق و جوانی ' ضعف و پیری ' عواطف ' احساسات ' مختصراً احوال ملی را در نظر گرفته با یک فصاحت ساده و بسیار مختصر موثری در پئے اصلاح برآمده است و توجهِ خاص و عام را بخود معطوف داشته - ایجاد این گونه موضوع در وقت ضرورت از مختصات سعدی بوده و حقیقتاً او مصلح است -

وضع جغرافیائے ایران و آب و هوا ' باغها ' گلها و گلستانها ' و انقلابات سیاسی همیشه شاعر پیدا کرده است لاکن مخاطب دلیل منطقی می خواهد - در همین زمان حاضر باندازهٔ ماخذ درست بدست آمده است که میتوان یک کتابچه نوشت بلکه گواه تاریخی از زمان هخامنشی بدست داریم تقریباً ۳۴۰۰ پیش از میلاد عیسیٰ - از روئی ادلهٔ تاریخیٔ شعر قبل از اسلام در ایران موجود بوده است لاکن یک نکتهٔ مهمی دیگر هم ایرانیان قدیم در شعر ملحوظ می داشته اند و آن توافقِ اوزانِ شعری با موسیقیِ ملی است - این رعایت درین عصر حاضر کم کم دارد لحاظ می شود - امید است آینده وسیع شده اثرات مسرت انگیزی بدهد - آن هم یکے از شاه کارهائے عصر حاضر است که زبان را عمومی و یک جهت می کند و روح عوام را تکان داده آنان را برائے مبارزهٔ زندگانیِ ملی آماده می نماید - اشعار جدید به سبب هم آهنگی با موسیقی درخانه و کوچه و بازار و محافل ادب و بزمِ عیش قلوبِ عامه را جذب کرده است —

طلوع مشروطه و پیش آمدن یک مقصود عمومی' احساس احتیاجات وطنی ' مصائب مملکتی هزارها موضوع مفید بدست شعراء می دهد

و یک کشور وسیع بزرگی باسم ایران ' وطن به آنها حواله می کند - کنون موضوع بسیار مضمون بے شمار است - از ینجا است که شعار این عصر همه وطنی شده است - قصیده ' غزل ' قطعه ' ترجیع بند ' رباعی ' اوزان جدیده هر کدام در یک موضوع مهمی ' یک مضمون مفیدی سروده شده است - از پیر هشتاد ساله (ادیب پشاوری) تا جوان نو خیز (حسام زاده) همه با یک گرمیء حقیقیء وطن و ابداع آن را در نظر دارند و همه موضوع تازه و مضمون نو ایجاد می کنند - سخن کوتاه کنون شاعر کم و مضمون بسیار است —

سیل شعر گوئی با جوش و خروش سرازیر شده است و راه هائے نو پیش گرفته جویائی مجراهائے طبیعی است و کنون مضمون بے حد ' موضوع بے انتها ' باز شاعر بسیار ' استاد کم و جهان ادب تشنۂ وجود نابغه است —

جلد دوم و سوم ' سخن وران عصر حاضر ' به نظر نرسیده است و نگارنده ناچار است در حدود جلد اول تبصره بنویسد بنا برین کنون فهرست مهمی از انقلابات ادبی نوشته مقاله ختم می شود -

انقلاب ادبی زبان فارسی

(۱) یک رخی و یک جهتیء زبان -

(۲) وطنی شدن عالم نظم -

(۳) توافق با موسیقی -

(۴) راه و رخنه یافتن الفاظ و محاوراتِ عوام در جهانِ نظم -

(۵) ساده گوئی -

(۶) تسلسلِ مطلب -

(۷) علل و اسباب ظاهر کردن و نتیجه گرفتن -

(۸) ایجاد موضوع و مضمون بکر مانند وطنی -

(۹) گرمیء حقیقی -

(۱۰) اوزان نو -

(۱۱) لازم می نماید برائے برخے از مطالب مقالہ واین فہرست نمونۂ از نظم جدید نوشتہ شود لاکن کتاب ' سخنوران عصر حاضر ' خود نمونہ است —



سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ

از اڈیٹر

سر سید جامع حیثیات شخص ہوے ہیں - یہ وہ زمانہ تھا جب سوسائٹی کا شیرازہ بکھر چلا تھا - زندگی کا ہر شعبہ دبدھا کی حالت میں تھا - دو تہذیبوں کے ٹکرانے سے اس تذبذب میں اور اضافہ ہو گیا تھا اس وقت ایک ایسے مخلص زمانہ شناس ' اور ثابت قدم شخص کی ضرورت تھی جو قوم کی خفتہ اور مردہ قوتوں کو جگاے ' ان اوہام اور اسقام کو دور کرنے کی کوشش کرے جو گزشتہ تمدن اور حکومت نے پیدا کردیے تھے - اور اقتضاے زمانہ کے لحاظ سے ان کی ضروریات کو پورا کرے اور جدید حالات کی رو سے ان کی روش کو بدلے - سر سید نے اگرچہ زندگی کے ہر اہم شعبے کی طرف توجہ کی لیکن ان کا سب سے بڑا کام تعلیمی اور علمی تھا - اور اسی کام کا ایک جز سائنٹفک سوسائٹی کا قیام تھا - خود یہ نام اس تغیر کی خبر دے رہا ہے جو اس وقت عمل میں آرہا تھا - یہ علمی سعی اردو زبان کے سلسلۂ ارتقا کی ایک کڑی ہے اور اس لیے اس کا ذکر اردو زبان کے مطالعہ کرنے والوں کے لیے ضروری ہے —

سر سید نے سنہ ۱۸۶۳ ع میں ایک تحریر اس عنوان سے کہ ' التماس بخدمت ساکنان ہندوستان در باب ترقی تعلیم اہل ہند " چھاپ کر شائع کی

جس کا خلاصۂ مضمون یہ تھا کہ ہندوستان میں علم کے پھیلانے اور ترقی دینے کے لیے ایک مجلس مقرر کرنی چاہیے جو اپنے قدیم مصنفوں کی عمدہ کتابیں اور انگریزی کی مفید کتابیں اردو میں ترجمہ کرا کے چھاپے *"- یہ تھی اصل بنیاد سائنٹفک سوسائٹی کی - چنانچہ دوسرے ہی سال انہوں نے اس خیال کو عمل میں لانے کی کوشش کی —

۹ جنوری سنہ ۱۸۶۴ ع کو سر سید نے غازی پور میں جہاں وہ صدرالصدور تھے ' اپنے مکان پر ایک جلسے کا انعقاد کیا جس میں یورپین اور دیسی اصحاب کا اچھا خاصا مجمع تھا - یہ جلسہ سوسائٹی کے قائم کرنے اور اس کے اغراض و مقاصد بیان کرنے کی غرض سے کیا گیا تھا - اس میں لفٹننٹ کرنل گریہم نے (جو سر سید کے بڑے دوست تھے اور اس وقت غازی پور میں سپرنٹنڈنٹ پولیس تھے) اور سر سید نے بہت مدلل اور معقول تقریریں کیں —

سر سید کا یہ خیال بالکل صحیح تھا اور اب بھی تقریباً ۷۰ سال گزرنے اور مغربی تعلیم کی بکثرت اشاعت ہونے کے بعد بھی وہ خیال ویسا ہی صحیح ہے کہ علوم جدیدہ کی اشاعت اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ علمی کتابیں دیسی زبان میں ترجمہ نہ کی جائیں - مولانا حالی لکھتے ہیں کہ " انہوں نے اس بات کو انگریزی تعلیم کے پھیلانے سے بھی زیادہ ضروری اور مقدم سمجھا " - مولانا نے اس سوسائٹی کے مقاصد کو مختصر طور پر نہایت خوبی سے ان الفاظ میں ادا کیا ہے :—

" جو (یعنی سائنٹفک سوسائٹی) اس غرض سے قائم کی گئی تھی کہ لٹریری اور علمی کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرا کر مغربی لٹریچر اور مغربی علوم کا مذاق اہل وطن میں پیدا کیا جائے ' علمی مضامین پر

---

* حیات جاوید حصۂ اول صفحہ ۱۲۱

لکچر دیے جائیں ' رعایا کے خیالات گورمنٹ پر اور گورمنٹ کے اصول حکمرانی رعایا پر ایک ایسے اخبار کے ذریعے سے ظاہر کیے جائیں جو اردو انگریزی دونوں زبانوں میں شایع ہوا کرے ' ہندو مسلمان اور انگریز تینوں قوموں کے ممبر اس میں شامل کیے جائیں اور اس طرح قومی مغائرت اور مذھبی تعصبات اور جو جھجک ہندوستانیوں کے دلوں میں انگریزوں کی طرف سے ہے اس کو آہستہ آہستہ کم کیا جاے" ابتدا ہی میں ۱۲۹ ممبر ہوگئے - جس میں ہندو مسلمان انگریز سب شریک تھے —

اسی سال (یعنے سنہ ۱۸۶۴ ع میں) سر سید غازی پور سے تبدیل ہو کر علی گڑہ آگئے - " چونکہ غازی پور میں سائنٹفک سوسائٹی کا ان کی غیبت میں چلنا نا ممکن تھا ' اس لیے سوسائٹی کا تمام سامان اور اسٹاف وہ اپنے ساتھہ علی گڑہ لے آے - مسٹر ولیم جنکس بریملی جو اس زمانے میں علی گڑہ کے جج تھے ' سوسائٹی کے پریسیڈنٹ قرار پاے "- اور اسی وقت سوسائٹی کے لیے ایک مستقل مکان بننے کی تجویز ہوئی اور سر سید کی کی نگرانی میں عمارت کی تعمیر شروع بھی کردی گئی - مکان کی تعمیر اور آرائش اور کتب و آلات وغیرہ پر تقریباً تیس ہزار روپے کی لاگت آئی اس کا سنگ بنیاد لفٹننٹ گورنر شمال مغرب (اے - ڈریمنڈ) نے ۳ نومبر سنہ ۱۸۶۴ ع کو رکھا تھا اور ۳ مارچ سنہ ۱۸۶۶ ع کو جب عمارت بن کر تیار ہو گئی تو مسٹر ولیمس کمشنر قسمت میرٹھہ کے ھاتھہ سے اس کا افتتاح ہوا - ڈیوک آف آرگائل وزیر ہند اس کے پیٹرن (سر پرست) اور اے - ڈریمنڈ لفٹننٹ گورنر شمال مغرب وائس پیٹرن قرار پاے - اولین سکریٹری لفٹنٹ کرنل گریہم ' اس کے بعد سر سید ہوے -

اگرچہ سوسائٹی کا پہلا قانون سنہ ۱۸۶۴ ع میں بمقام غازی پور بنا لیکن جب سوسائٹی کا دفتر علی گڑہ میں منتقل ہو گیا تو سنہ ۱۸۶۷ ع میں اس میں

کسی قدر ترمیم کی گئی- سوسائٹی کے اغراض اور قواعد حسب ذیل قرار دیے گئے--

(لقب اور مقصد)

اس مجمع کا نام سین ٹیفک سوسائٹی یعنے علمی سوسائٹی کہا جائیے گا اور مقصد اس کا یہ ہوگا:—

(۱)-ان علوم و فنون کی کتابوں کا جن کو انگریزی زبان میں یا یورپ کی کسی اور زبان میں ہونے کے سبب ہندوستانی نہیں سمجھہ سکتے ایسی زبانوں میں ترجمہ کرنا جو ہندوستانیوں کے عام استعمال میں ہوں -

(۲) - جب کبھی سوسائٹی مناسب سمجھے تو کوئی ایسا اخبار یا گزٹ یا روزنامچہ یا میگزین وغیرہ چھاپ کر مشتہر کرنا جس سے ہندوستانیوں کے فہم و فراست کی ترقی متصور ہو—

(۳) - ایشیا کے قدیم مصنفین کی کم یاب اور نفیس کتابوں کا تلاش کر کر بہم پہنچانا اور چھاپنا —

(بناوٹ سوسائٹی کی)

(۴) - سوسائٹی میں (اول) معاون ممبر (دوسرے) آنریری ممبر (تیسرے) رفقاے سوسائٹی ہوویں گے اور سوسائٹی کے پیٹرن یعنے مربی اور وائس پیٹرن یعنے نائب مربی بھی مقرر ہوا کریں گے —

معاون ممبر دو قسم کے ہوں گے (اول) ممبران حضوری یعنے وہ ممبر جو ایسے مقام میں یا اس کے قریب رہتے ہوں جہاں سوسائٹی کا اجلاس ہوتا ہو- (دوسرے) ممبران مکاتبت یعنے وہ ممبر جو اس مقام سے جہاں سوسائٹی کا اجلاس ہوتا ہو فاصلے پر رہنے کے سبب سوسائٹی کے جلسے میں شریک نہ ہوسکیں اور بذریعہ خط و کتابت سوسائٹی سے ارتباط رکھیں —

تعداد غیر محدود- چندہ دو روپیہ ماہانہ-

آنریری ممبروں کی تعداد دس سے اور رفقاے سوسائٹی کی تعداد پانچ سے زیادہ نہ ہوگی —

صاحبان ڈریکٹرز پبلک انسٹرکشن بنگال اور شمال مغرب اور سنٹرل انڈیا اور اودہ و پنجاب موجودہ وقت بشرطیکہ وہ قبول کریں آنریری ممبر * ہوں گے —

رفقاے سوسائٹی ایسے شخص ہوں گے جو بسبب تحصیل علم یا علوم کے نہایت نامی ہوں مگر ممبری کے عہدہ پر مقرر ہونے کا ان کو کچھہ خیال نہ ہو —

کونسل مشیر کے ذمہ ترجمہ و ترتیب کتب' ترجموں کی پسندیدگی و ناپسندیدگی نیز یہ تجویز کہ ترجمہ اردو' فارسی' عربی' ہندی میں کیا جاوے یا کن کن زبانوں یا کس زبان میں کیا جاے —

کونسل کارپرداز - ذمہ دار منتظم اور ایک کتب خانہ کا قیام —

جو عمارت سوسائٹی نے علی گڑہ میں بنائی وہ علی گڑہ انسٹیٹیوٹ کہلائے گا اور جہاں تک ممکن ہوگا ہر قسم کی عجیب عجیب چیزیں اس مکان میں عجائب خانہ کی غرض سے جمع کی جائیں گی اور ان چیزوں کے حالات وقتاً فوقتاً مشتہر کیے جایا کریں گے —

۳۰ مارچ سنہ ۱۸۶۶ ع سے انسٹیٹیوٹ گزٹ جاری ہوا - یہ اخبار پہلے ہفتہ وار تھا پھر ہفتے میں دو بار نکلنے لگا - اڈیٹر خود سر سید تھے - مولانا حالی نے اس اخبار کے متعلق جو راے لکھی ہے وہ اس قدر معقول اور صحیح ہے کہ اس کے بعض حصوں کا یہاں نقل کر دینا کافی ہے -

"اول اول سر سید زیادہ تر اس میں پولٹیکل معاملات پر مضامین

---

* فرانس کے گارساں دتاسی بھی سوسائٹی کے آنریری ممبر بنائے گئے -

اور نوٹ لکھتے تھے ؛ اس لیے اس کی ابتدائی جلدوں کو ان کے پولیٹکل ورکس کا ایک مجموعہ کہا جاسکتا ہے۔ اس اخبار کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس کا ایک کالم انگریزی میں اور ایک اردو میں ہوتا تھا اور بعض مضامین اردو میں الگ اور انگریزی میں الگ چھاپے جاتے تھے ؛ اس لیے اس سے انگریز اور ہندوستانی یکساں فائدہ اٹھا سکتے تھے - اس کا خاص مقصد گورنمنٹ اور انگریزوں کو ہندوستانیوں کے حالات اور معاملات اور خیالات سے آگاہ کرنا اور ہندوستانیوں کو انگریزی طرز حکومت سے آشنا کرنا اور ان میں پولیٹکل خیالات اور قابلیت اور مذاق پیدا کرنا تھا - اس کی ابتدائی جلدوں کے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ انگریزی خیالات کو ہندوستانی لباس میں اور ہندوستانی خیالات کو انگریزی لباس میں ظاہر کرکے دونوں قوموں کو ملانا چاہتا ہے ــــ

اس میں سوشل ' اخلاقی ' علمی اور پولیٹکل ہر قسم کے مضامین برابر چھپتے تھے - جب تک سرسید کی توجہ دوسری جانب مائل نہیں ہوئی ' علاوہ اُن لیڈنگ آرٹکلوں کے ' جو وہ خود لکھتے تھے ' انگریزی اخباروں سے عمدہ عمدہ آرٹکل جو معاملات ہندوستان سے علاقہ رکھتے تھے برابر ترجمہ ہوکر چھپتے رہتے تھے - ہندوستان کے طریق معاشرت یا تعلیم یا کسی علمی یا تاریخی تحقیقات کے متعلق جتنے لکچر سوسائٹی میں دیے جاتے تھے وہ سب اس کے ذریعے سے شایع ہوتے تھے ــ

اگرچہ یہ اخبار ملک کی سوشل اصلاح کا ہمیشہ ایک عمدہ آلہ رہا ہے اور اول اول کئی سال تک جس قدر زمانۂ حال کی نئی اطلاعیں اس کی بدولت ہندوستانیوں کو حاصل ہوتی رہی ہیں اُن کے لحاظ سے یہ کہنا کچھ مبالغہ نہیں ہے کہ کم سے کم شمالی ہندوستان میں عام خیالات

کی تبدیلی اور معلومات کی ترقی اس پرچے کے اجرا سے شروع ہوئی ہے - مگر اس کے ساتھہ ہی پولیٹکل معاملات میں جو وقعت اور اعتبار اس اس پرچے نے گورنمنٹ اور حکام کی نظر میں حاصل کیا وہ آج تک کسی اخبار نے حاصل نہیں کیا —

... ...

ایک خاص وصف، جو اس اخبار کے ساتھہ مخصوص تھا اور جو اس کو ہندوستانیوں کے عام انگریزی اور دیسی اخباروں سے ممتاز ٹھیراتا تھا وہ یہ تھا کہ اس نے اپنے طرز تحریر میں برخلاف اپنے تمام ہم عصروں کے کبھی کسی قوم یا فرقے یا کسی خاص شخص کی دلآزاری روا نہیں رکھی - اس نے اپنے گاہکوں کے خوش کرنے کے لیے، جو ہمیشہ نوک جھوک اور چھیڑ چھاڑ سے خوش ہوتے ہیں، سنجیدگی اور متانت کو کبھی ہاتھہ سے نہیں دیا - اس نے ہندوستان کی کسی قوم کی نسبت دوستی اور خیر خواہی کے خلاف کبھی ایک حرف نہیں لکھا - کبھی کسی ہندو یا مسلمان ریاست یا اس کے اہلکاروں پر زہر نہیں اگلا - ہندو مسلمانوں کے مذہبی جھگڑوں سے وہ ہمیشہ بے تعلق رہا اور اگر کبھی کچھہ بولا تو دونوں کو صلح و آشتی کی نصیحت کی" —

یہ سب سچ ہے لیکن یہ اُسی وقت تک تھا جب تک کہ کالج اور دوسرے کاموں کا ہجوم نہیں ہوا تھا - آخر میں تو یہ "ماخوذ از پانیر" ہو کے رہ گیا تھا - لیکن جب کوئی خاص مسئلہ یا اہم معاملہ آجاتا تھا تو سر سید خود بڑے پُرزور مضامین لکھتے تھے —

ابتدا میں منشی محمد یار خاں اڈیٹری کا کام کرتے تھے اور منشی چھبن لال انگریزی اخبارات کا ترجمہ کرتے تھے - مولوی فیض الحسن اور

بابو گنگا پرشاد مترجم کتب تھے - اجرت پر بھی کام ہوتا تھا - کل عملہ پانسو روپیہ ماہانہ کا تھا —

ایک کتب خانہ بھی قائم کیا گیا اور آلات علمی اور کلوں کے نمونے فراہم کیے گئے اور لکچروں کا سلسلہ قائم ہوا - ڈاکٹر کلکلی ہر مہینے ایک لکچر ' نیچرل سائنس پر دیتے تھے اور عملی آلات سے جو سوسائٹی میں موجود تھے حاضرین کو تجربے دکھاتے تھے —

سوسائٹی کی ترقی اور فروغ کا سارا دار و مدار سر سید پر تھا - انہوں نے اپنی ذاتی کوشش اور محنت اور سالانہ چندوں اور عطیات سے سوسائٹی کو بہت کچھ فائدہ پہنچایا - اپنا ذاتی پریس جو "تبئین الکلام" کے چھاپنے کے لیے خریدا تھا ' سوسائٹی کے نذر کردیا - جون سنہ ۱۸۶۶ ع میں جب نواب سکندر بیگم والیۂ بھوپال نے یہ سنا کہ سید احمد خاں نے ہندوستانیوں کی بہبودی کے لیے یہ سوسائٹی قائم کی ہے تو انہوں نے بطور اظہار خوشنودی ایک الماس کی انگھوٹھی قیمتی ایک ہزار روپیہ سر سید کو بھیجی - سر سید نے ایک جلسۂ عام میں یہ انگوٹھی سوسائٹی کو دے دی - اسی طرح محض سوسائٹی کو فائدہ پہنچانے کے لیے سر سید نے فوجداری اور کلکٹری کے مختاروں اور وکیلوں کو قانون پر لکچر دینے شروع کیے اور اس سے جو فیس وصول ہوتی تھی وہ سوسائٹی کے نذر کردیتے تھے —

گورمنٹ اور روسا امرا اور حکام نے بھی اس کی معقول امداد کی - گورمنٹ نے تین ایکڑ تین روڈ اور تیس پول زمین سرکاری تعمیر مکان کے لیے اور ایک باغ سرکاری علم فلاحت کی ترقی اور امتحان کے لیے عطا کی - مہاراجہ جودھپور نے سو روپیہ سالانہ ' مہاراجہ کپورتھلہ نے پچاس روپے ' مہاراجہ جے پور نے پچاس اور نواب رام پور نے سو روپے سالانہ

امداد مقرر کی - وائسرائے اور لفٹننٹ گورنر وغیرہ نے چندوں سے مدد کی - سرجان لارنس کو خاص توجہ تھی - مسٹر ڈریمنڈ لفٹننٹ گورنر شمال مغرب اور میکلوڈ لفٹننٹ گورنر پنجاب نے بھی چندے دیے - نواب کلب علی خاں نے بارہ سو روپے کی ایک نقرئی کرسی سوسائٹی کو دی مہاراجہ الور اور مہاراجہ اندور اور نواب ٹونک نے بھی عطیات دیے - مہاراجہ بنارس کو بھی اس سے خاص دلچسپی تھی- عنایت اللہ خاں رئیس بھیکم پور نے دو سو روپے تعمیر چاہ کے لیے دیے - سر آکلنڈ کالون، مسٹر سمیتھ کلکٹر میرٹھ اور مسٹر کیمسن ڈائرکٹر تعلیمات بھی اس کے بڑے معاون تھے - سر سید کی کوشش کا یہ نتیجہ ہوا کہ سالانہ چندے اور اخبار کی قیمت کی تعداد دس ہزار آٹھ سو پچاس تک پہنچ گئی —

۱۵ - اگست سنہ ۱۸۶۷ع میں جب سر سید عہدۂ جج سمال کاز کورٹ پر ترقی پاکر علی گڑھ سے بنارس چلے گئے تو سوسائٹی کا تمام کاروبار راجہ جے کشن داس سی- ایس- آئی کو جو اس زمانے میں علی گڑھ میں ڈپٹی کلکٹر تھے سپرد کیا گیا اور انہوں نے بڑی توجہ سے اس کام کو سرانجام دیا - لیکن سر سید بنارس میں رہ کر بھی برابر سوسائٹی کی اعانت کرتے رہے اور اُن کے مضامین سوسائٹی کے اخبار میں شایع ہوتے رہے —

" سنہ ۱۸۶۷ میں سر سید بتقریب تعطیل دسہرہ بنارس سے علی گڑھ میں آئے اور ضلع علی گڑھ کے اکثر زمینداروں پر اس بات کو ظاہر کیا کہ اب تک سوسائٹی کی کوئی مستقل آمدنی نہیں ہے ؛ کوئی ایسی تدبیر کرنی چاہیے کہ اس کی آمدنی مستقل ہوجائے - بہت سے زمینداروں نے یہ تجویز کی کہ اِس ضلع کے تمام دیہات سے کم از کم ایک روپیہ سالانہ ہمیشہ کے لیے سوسائٹی کے قیام کے واسطے مقرر کیا جائے ؛ اور

اس کی شرائط واجب العرض میں بر وقت بندوبست کے درج ہو جائیں تاکہ نسلاً بعد نسلٍ ہمارے وارثوں میں سے کوئی کچھہ عذر نہ کرنے پاے- چنانچہ ۱۲ اکتوبر سنہ ۹۷ ع کو سوسائٹی کے جلسے میں سر سید نے یہ تجویز پیش کی اور ایک فہرست زمینداران درخواست دہندہ کی مع ان کی عرضیوں کے اور مع تفصیل ۱۳۳ دیہات کے جارج ہنری لارنس کلکٹر ضلع علی گڑہ کی خدمت میں اپنی چٹھی کے ذریعہ سے بھیج دی تاکہ وہ اس کی تصدیق کرکے گورنمنٹ میں رپورٹ کریں- اور صاحب کلکٹر نے وہ تمام کاغذات گورنمنٹ میں اپنی رپورٹ کے ذریعہ سے روانہ کردیے- اس کا نتیجہ سوا اس کے اور کچھہ معلوم نہیں ہوا کہ اس کے جواب میں جو چٹھی پرائیویٹ سکرٹری گورنمنٹ انڈیا مورخہ ۱۸ اکتوبر سنہ ۹۷ ع بنام سر سید وصول ہوی اس میں حضور وائسراے کی طرف سے رضامندی ظاہر کی گئی تھی" * —

۹ - مئی سنہ ۱۸۶۸ ع کو سوسائٹی نے ایک اڈریس سر ولیم میور لفٹننٹ گورنر شمال مغرب کی خدمت میں پیش کیا اور سوسائٹی کی درخواست پر سر ولیم میور نے وعدہ کیا کہ جو کتابیں دیسی زبان میں تصنیف و تالیف یا ترجمہ کی جائیں گی ان میں گورنمنٹ ضرور امداد دے گی-. چنانچہ ۲۶ - اگست سنہ ۱۸۶۸ ع کو گورنمنٹ شمال مغرب نے دیسی کتابوں پر انعام دینے کا اعلان کیا- "اگرچہ انعام سے کچھہ زیادہ آدمی مستفید نہیں ہوے اور اشتہار کی میعاد چند سال بعد گزر گئی لیکن اس اشتہار کا اثر اس تمام گروہ میں جو دیسی زبانوں میں تصنیف و تالیف کی کم و بیش لیاقت رکھتا تھا مگر اس لیاقت کو کام

---

* حیات جاوید حصہ اول صفحہ ۱۳۷ -

میں لانا نہیں جانتا تھا، برقی قوت کی طرح دوڑ گیا - انہوں نے اپنی تصنیفات سے ملک کو بھی فائدہ پہنچایا اور خود بھی حق تصنیف سے فائدہ اتھانا سیکھ گئے - خصوصاً اردو لٹریچر صرف اس تحریک کی بدولت جو کہ اشتہار مذکور نے ملک میں عموماً پیدا کردی تھی تھوڑے عرصہ میں توقع سے بہت زیادہ ترقی کر گیا" * —

سر سید کی دور اندیشی سوسائٹی کے نام سے ظاہر ہے - اس زمانے میں جدید خیالات کی اشاعت اور سائنس کا ذوق پیدا کرنا بہت بڑا کام تھا - جب سوسائٹی علی گڑھ میں منتقل ہوئی تو اس نام کے متعلق اختلاف پیدا ہوا اور سر سید بھی کسی قدر مائل ہوگئے تھے کہ یہ نام بدل دیا جائے لیکن جب طریقہ و علم کاشتکاری اور علمی عجائبات کا رہنا طے ہوگیا تو یہی نام مناسب خیال کیا گیا اور آخر تک یہی نام قائم رہا -

سائنس کے لکچروں کے سلسلے کے علاوہ جس کا ذکر پہلے آچکا ہے عملی تجربے بھی کیے گئے اور علم فلاحت کے اصول کے مطابق سوسائٹی کے باغ میں گیہوں بویا گیا اور جب تیار ہوگیا تو جلسے میں اس کا نمونہ دکھایا گیا - ایک ایک دانے میں ساٹھ ساٹھ ستر ستر شاخیں نکلیں اور بعض میں سو سے بھی زیادہ پھوٹ کر مثل پولے کے جھاڑ کے ہوگیا تھا - پودے کا طول ۴ فٹ ۸ انچ اور بال مع تور کے ۱ انچ لمبی تھی - نو قسم کے گیہوں لندن سے منگائے گئے - خود سر سید نے ایک ایک دانہ بونے کے لیے ایک آہنی نلی ایجاد کی اور علم فلاحت پر ایک رسالہ لکھنا شروع کیا -

مختلف علوم و فنون کی کتابوں کی تالیف اور مغرب اور مشرق کی اعلیٰ درجے کی کتابوں کا ترجمہ اس سوسائٹی کا بہت بڑا مقصد تھا - علمی ذوق پیدا کرنے کا یہ

---

* حیات جاوید حصہ دوم صفحہ ۴۵ -

بہت بڑا ذریعہ تھا - سر سید نے پولیٹکل اکانمی، نیچرل فلاسفی، علم آب وھوا کے ترجموں کی سفارش کی - کرنل جے ڈبلیو ھیملٹن نے پہلے ھیروڈوٹس کے تاریخ مصر کے ترجمے کی اور بعد ازاں تمام تاریخ کے ترجمے کا مشورہ دیا اور لکھا کہ مقاموں اور شخصوں کے ناموں کے معاملے میں بہ نسبت یونانی کے عربی زبان کی پیروی کرنی چاھیے اور جو تلفظ کسی لفظ کا یورپ یا ایشیا کی زبان میں مروج ھو وھی اختیار کیا جائے - انگریزی زبان کی تقلید لازم نہیں - ھندی کے حروف ٹ اور ڈ کا استعمال نہ کیا جائے - ھیئت اور جیالوجی (ارضیات) کے ترجمے کی بھی رائے دی - دوسرے خط میں سفارش کی کہ ایک عمدہ تاریخ مصر مسمیٰ حسن المحاضرہ مصنفہ سیوطی ھے - ھشت بہشت کا نسخہ بھی بھیجا جو ادریس بدخشی کی تصنیف ھے جس میں شاہ مراد کی وفات ۸۵۵ ھجری تک کے حالات ھیں - مصنف کے بیٹے ابوالفضل الاختری نے اسے ۹۸۲ ھجری تک پہنچایا، لیکن یہ نسخہ اصل مصنف کا تھا جو ۸۵۵ تک ھے - انہوں نے ھیرن صاحب کی تاریخ کے ترجمے کی بھی رائے دی -

خود سر سید نے دو کتابوں کی تالیف کا بیڑا اتھایا - ایک تمام اردو مطبوعہ کتب نظم و نثر کی فہرست کی ترتیب بطور تاریخ زبان اردو - اس میں امور ذیل کی صراحت کی جائے گی —

نام کتاب - نام مصنف مع مختصر حال - زمانۂ تصنیف - کچھہ عبارت بطور نمونۂ طرز بیان اور بعض مضامین کا خلاصہ —

معلوم ھوتا ھے کہ اس کتاب کے لکھنے کی نوبت نہیں آئی —

دوسرے اردو لغات جو سر سید نے لکھنی شروع کردی تھی، اس کا نمونہ موجود ھے جو آئندہ ھم اس رسالے میں پیش کریں گے - اس پر بعض یورپین فاضلوں نے رائیں بھی لکھیں —

یہ دونوں تجویزیں نہایت قابل قدر اور اردو زبان کے استحکام کے لیے لازم ہیں - سر سید کے صحیح ادبی ذوق اور دور بینی کا اسی ایک بات سے پتا چلتا ہے کہ انہوں نے ۶۶ برس پہلے اس چیز کا ڈول ڈالا تھا جس کی تکمیل پر ہم آج غور کر رہے ہیں —

سوسائٹی نے تقریباً چالیس علمی اور تاریخی کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرائیں جن میں سے بعض کے نام جو ہمیں معلوم ہوئے ہیں ذیل میں درج کیے جاتے ہیں —

۱ - تاریخ مصر قدیم مولفۂ رولن —

۲ - تاریخ یونان مولفۂ رولن —

۳ - رسالۂ علم فلاحت اسکاٹ برلن —

۴ - تاریخ چین بزبان فارسی قلمی ترجمۂ پادری ایکسوس —

۵ - تزک جہانگیری قلمی —

۶ - رسالہ علم انتظام مدن (پولیٹکل اکانمی) مولفۂ ولیم سینیر —

۷ - ایک گفتگو بر عہد لارڈ ڈلہوزی و لارڈ کیننگ مترجمۂ لفٹننٹ کرنل گریہم بزبان اردو —

۸ - تاریخ ہند مولفۂ الفنسٹن —

۹ - رسالۂ علم آلات مولفۂ تامسن —

۱۰ - رسالۂ علم طبیعات مولفۂ تامسن —

۱۱ - رسالۂ علم آب و ہوا مولفۂ تامسن —

۱۲ - رسالۂ برق مولفۂ ہیرس —

۱۳ - دیباچۂ تاریخ فیروز شاہی —

۱۴ - ٹاڈ ہنٹر کی کتاب اقلیدس مترجمۂ مولوی ذکاءاللہ -

۱۵ - جغرافیہ مولفۂ پادری ولکنسن —

۱۶ - سیاست مدن (مل کی پولیٹکل اکانمی کا انتخاب) مترجمۂ پنڈت دھرم نراین راے بہادر میر منشی اندور -

۱۷ - ترجمۂ علم مساحت مولفۂ ڈاڈ ھنٹر —

۱۸ - ترجمۂ علم مثلث مولفۂ ڈاڈ ھنٹر —

۱۹ - ترجمۂ الجبرا مبتدیوں کے لیے مولفۂ ڈاڈ ھنٹر -

۲۰ - ترجمۂ نظریۂ مساوات مولفۂ ڈاڈ ھنٹر -

۲۱ - کال بریتھہ اور ھاٹن کے سائنٹفک مینول یوکلڈ کا ترجمہ —

۲۲ - کال بریتھہ اور ھاٹن کے سائنٹفک الجبرا کا ترجمہ -

۲۳ - برنارڈ سمتھہ کی ارتھمیٹک کا ترجمہ —

۲۴ - برنارڈ سمتھہ کے الجبرا کا ترجمہ ۔

۲۵ - کال بریتھہ کی کتاب حساب کا ترجمہ -

۲۶ - ڈاڈ ھنٹر کے الجبرا کا ترجمہ (کالجوں اور مدارس کے لیے) —

۲۷ - کال بریتھہ کی Plain علم مثلث —

۲۸ - ڈاڈ ھنٹر کی Plain co-ordiate geometry —

۲۹ - ڈاڈ ھنٹر کا (Integral Calculus) تکمیلی احصا —

۳۰ - ڈاڈ ھنٹر کا (Differential Calculus) تفرقی احصا —

۳۱ - ترجمہ تاریخ ایران مولفۂ سر جان میلکم —

دھلی کالج اور اس کی ورنیکلر ترانسلیشن سوسائٹی کے بعد یہ دوسرا ادارہ تھا جس نے انگریزی سے مختلف علوم و فنون کے ترجمے اردو زبان میں شایع کیے - یہ کام جب آج کل دشوار نظر آتا ھے تو اس وقت کس قدر دشوار ھوگا جب نہ اچھے مترجم دستیاب ھوتے تھے اور نہ ان ترجموں

کی قدر کرنے والے کچھ زیادہ تعداد میں تھے - علاوہ اس کے عجائب خانے کے لیے سکے بھی جمع کیے - چنانچہ مسٹر تھارن ہل جج سہارن پور اور مولوی فضل احمد تحصیلدار قائم گنج نے کچھ سکے بھیجے - ایک اشرفی عہد تغلق کی عنایت اللہ خاں صاحب رئیس بھیکم پور نے دی —

سر سید کا قاعدہ تھا کہ وہ جس کام کا بیڑا اٹھاتے تھے ہاتھ دھوکے اس کے پیچھے پڑ جاتے تھے ' چنانچہ سوسائٹی کی بہبودی اور ترقی میں انھوں نے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا - " ضلع کے رئیسوں کو اس کی امداد پر آمادہ کیا گورنمنٹ کو اس کی طرف توجہ دلائی ' خود اپنی بساط سے بڑھ کر اس کو مالی امداد پہنچائی ' اس کی عالیشان عمارت اپنے اہتمام اور نگرانی میں بنوائی ' اس کی مستقل آمدنی کے لیے عمدہ عمدہ تدبیریں کیں ' لائق لائق آدمی ترجمے کے کام کے لیے مقرر کیے ' قریب چالیس کے چھوٹی بڑی علمی اور تاریخی کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرائیں ' غازیپور ' علی گڑھ ' بنارس جہاں کہیں رہے سوسائٹی کے اخبار کو اپنے عمدہ مضامین سے برابر مدد پہنچاتے رہے یہاں تک کہ ہندوستان چھوڑنے کے بعد بھی سوسائٹی کی دھن میں برابر لگے رہے - چنانچہ ولایت جاتے ہوے جو خط کہ انھوں نے مولوی سید مہدی علی خاں کو عدن سے بھیجا تھا اس میں لکھتے ہیں کہ " مجھ کو علاوہ مفارقت احباب کے یہ رنج بڑا ہے کہ میرے پیچھے لوگ عقل کے دشمن سائنٹفک سوسائٹی کی بڑی مخالفت کریں گے اور کوئی درجہ سعی کوشش کا واسطے شکست کردینے سوسائٹی کے باقی نہ رکھیں گے - پس میں چاہتا ہوں کہ آپ سوسائٹی کی طرف زیادہ متوجہ ہوں اور اس کے سنبھالنے اور ممبروں کے بڑھانے میں زیادہ کوشش فرمائیں " * —

* حیات جاوید حصہ دوم صفحہ ۳۶ - ۳۷ - .

محض سوسائٹی کی خاطر کلکتہ کا سفر اختیار کیا اور ۶ اکتوبر سنہ ۱۸۸۳ ع کو مذاکرۂ علمیہ میں ایک طویل لکچر فارسی زبان میں سوسائٹی کے اغراض و مقاصد پر دیا —

اس سوسائٹی کے ذریعہ سے بعض تعلیمی تحریکیں بھی کی گئیں - مثلاً تحصیلی مکاتب کے نصاب تعلیم پر غور کرنے کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی گئی - اسی سوسائٹی کے ضمنی نتائج میں سے ورنیکلر یونیورسٹی کی تحریک تھی جو اس زمانے کے لیے ایک عجیب خیال تھا - اس کا حال هم آیندہ ایک علحدہ مضمون میں لکھیں گے —

اس سوسائٹی نے نہ صرف علمی اور تعلیمی خدمات انجام دیں بلکہ اس کی دیکھا دیکھی ملک کے مختلف مقامات میں متعدد انجمنیں اور سبھائیں قائم هوگئیں جو اپنے اپنے حلقے میں مفید کام کرتی تھیں - سوسائٹی کے اخبار کا اردو اور دوسرے دیسی اخبارات پر بھی بہت اچھا اثر پڑا اور وہ سیاسی ' معاشرتی اور تعلیمی مسائل پر سنجیدگی سے بحث کرنے لگے - اس سوسائٹی اور تہذیب الاخلاق کا اردو زبان اور ادب پر بڑا احسان هے —

(اس مضموں کے لکھنے میں علی گڑہ انسٹیٹیوٹ گزٹ کی مختلف جلدوں ' گریہم کی لائف آف سید احمد خاں اور حیات جاوید سے مدد لی گئی هے) —

شمالی ھند میں اُردو شاعری کی ابتدا و ترقی ۔

از

شیخ چاند صاحب ایم - اے ' ایل ایل - بی

شمالی ھند میں اُردو شاعری کا باضابطہ آغاز دراصل بارھویں صدی ھجری کے اوائل میں ھوا ھے - اس میں شبہ نہیں کہ عالمگیر کے عہد کے پس و پیش ایسے شعرا گزرے ھیں جن کے اشعار تذکروں میں مل جاتے ھیں - چنانچہ موسوی خاں فطرت ' خواجہ عطا ' جعفر ' بیدل وغیرہ ایسے شاعر ھیں جن سے چند شعر منسوب ھیں - اُسی زمانے (۱۱۰۵ ھ) میں اسمعیل امروھی نے ایک مثنوی " تولد نامۂ بی بی فاطمہ " * لکھی ھے - اس کے سوا بعض شاعروں کا کلام بھی دستیاب ھوتا ھے لیکن یہ دراصل ایسی کوششیں تھیں جن کا مستقل اور پائدار اثر قائم نہ ھوسکا ' اور ان شعرا نے شمالی ھند میں اُردو شاعری کے رائج کرنے میں کوئی قابل لحاظ مدد نہیں دی - شمالی ھند اور خصوصاً دھلی میں اُردو شاعری کے آغاز کی تاریخ عالمگیر کا چوالیسواں سنہ جلوس (۱۱۱۲ ھ) ھے - یہ وہ تاریخ ھے جس میں بقول قایم ولی نے دھلی کا سفر کیا اور پہلی مرتبہ وھاں کے شاعروں کے حلقے میں اپنی ریختہ گوئی سے ھل چل ڈال دی -

---

* کتب خانۂ مولوی عبدالحق صاحب —

اور جب ۱۱۳۳ھ میں بقول * حاتم ولی کا دیوان دہلی پہنچا تو موزوں طبع شاعروں کو متاثر و متحرک کردیا - یوں تو دکنی شاعروں کے کلام سے شمالی ہند کے شاعر اس سے قبل سے واقف تھے اور شمالی ہند کے بعض شاعروں کے کلام سے اس کی شہادت بھی ملتی ھے - قائم † (قائم چاند پوری سے قبل گزرا ھے) نے اپنے مرثیہ میں قادر کا ذکر اس طرح کیا ھے -

قایم کا آج ہند میں شہرا ہوا بلند دکھن میں اس کے شعر کہو قادر استھیں

مخزن نکات (مولفہ ۱۱۶۸ھ میں لکھا ھے کہ پچاس سال قبل مرزائے دکنی کے مرثیے ھاتوں ھاتھہ دکن سے شمالی ہند میں پہنچتے تھے اور عام طور سے پڑھے جاتے تھے لیکن ان کا کوئی بین اثر نہ پڑسکا - یہ صرف ولی کے کلام کی کرامت تھی کہ اس نے شمالی ہند کے شاعروں کو ریختہ کی طرف متوجہ و مائل کردیا - اس کے مقلدین میں آبرو ' حاتم 'مضمون ' مظہر جان جاں ' احسن اللہ ' شاکر ناجی ' مصطفی خاں یکرنگ ایسے شعرا ھیں جو اساتذہ میں شمار ہوتے ھیں - ولی کے تتبع میں طبع آزمائی کرنے کا ذکر ان میں سے بعض نے کیا ھے چنانچہ حاتم لکھتا ھے :-" در ریختہ ولی را استاد می داند ' -

آبرو کا ایک شعر ھے :—

آبرو شعر ھے ترا اعجاز گو ولی کا سخن کرامت ھے

یہ شاعرانہ تعلی ھے ولی کا ذکر کرنا ھی اس کے اثر کو تسلیم کرنا ھے —

ولی کی تقلید سے اس کے مقلدین کے کلام میں ایک حد تک ہندی کا عنصر غالب تھا - اس ہندی عنصر نے اس قدر شدت اختیار کرلی تھی کہ ایہام کا رواج ہوگیا - ایہام کی بنیاد اسی عنصر پر قائم ہوئی -

---

* تذکرۂ مصحفی —

† حمید نے قائم کو برھانپوری لکھا ھے جو دوسرا شاعر معلوم ہوتا ھے -

بقول آزاد " سنسکرت میں ایک لفظ کے کئی معنی ہیں اس واسطے اس میں برج بھاشا اور اُس کی شاخ میں ذو معنین الفاظ اور ایہام پر دوہروں کی بنیاد ہوتی تھی - فارسی میں یہ صنعت ہے مگر کم - اُردو میں پہلے پہل شعر کی بنا اسی پر رکھی گئی " - ظاہر ہے کہ ایہام کا التزام ایک مصنوعی اور غیر فطری فعل تھا جس نے عام شاعری اور خصوصاً غزل کو اثر اور سادگی کے جوہر سے محروم کردیا - اس میں مضامین کے ادا کرنے سے بڑھ کر ذو معنی الفاظ کے استعمال پر شاعر کی پوری قوت اور زور صرف ہوجاتا تھا، اس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ کلام بے کیف اور بے لطف ہوجاتا تھا اور عام قبولیت حاصل کرنے سے محروم - اس دور کے اساتذہ کا کلام اٹھاکر دیکھیے تو شاعرانہ صناعی اور ہنر مندی پر حرف رکھنے کو جگہ نہیں لیکن سادگی اور اثر کافور ہیں، الفاظ کا ذخیرہ بافراط موجود ہے، اُن کے استعمال اور معانی کے مختلف پہلو روشن ہیں، عالم لسانیات اور محقق لغات کے لیے اُن کا کلام بیش بہا ذخیرہ ہے، لیکن کیف و لذت سے خالی ہے - اِبتداءً تو یہ طرز مقبول ہوئی لیکن بہت جلد یہ غیر فطری اِلتزام و تصنع مردود ٹھہرا - ایہام گوئی کے مشہور علم بردار حاتم کو بھی یہ روش چھوڑنی پڑی چنانچہ جب سنہ ۱۱۶۹ ھ میں اپنے کلام کا انتخاب " دیوان زادہ " کے نام سے کیا تو پرانی طرز کے کلام کو خارج کردیا اور لکھا ہے : —

کہتا ہے صاف و شستہ سخن بسکہ پڑتلاش　　حاتم کو اس سبب نہیں اِیہام پر نگاہ

اِیہام گوئی کے خلاف تحریک کا آغاز در اصل اُن شعرا نے کیا جو ان ایہام گو اساتذہ کے بعد فوراً مجلس شاعری میں جلوہ افروز ہوئے - اِن میں مظہر، سودا، میر، اور درد وغیرہ خصوصیت کے ساتھ قابل

ذکر ہیں اِن کے دور میں قدیم روش شاعری یک قلم متروک ہوگئی - اس عہد کی ابتدا میں بھی ایک طبقہ ایسا موجود تھا جو اِیہام گوئی کا قائل تھا اور شاعری میں اس اِلتزام کو ملحوظ رکھنے پر مٹا ہوا تھا - مہر کا شعر ہے :—

کیا جانوں دل کو کھینچے ہیں کیوں شعر مہر کے
کچھ طرز ایسی بھی نہیں ایہام بھی نہیں

اِس سے صاف ظاہر ہے کہ اِن کے ابتدائی دور میں اِیہام کے ماننے والے موجود تھے اور اِس صنعت کو شعر کی دلچسپی اور لطف کا موجب سمجھتے تھے - اس دور کے بھی بعض شعرا نے اِس طرز میں طبع آزمائی کی ہے - سودا کی ایک غزل اِسی رنگ میں ہے لیکن اُس نے صاف کہہ دیا ہے کہ یہ ابتدائی دور کے اِیہام گو علم بردار مضمون اور 'آبرو' کی طرز ہے مجھے اس سے کوئی مناسبت نہیں :

اسلوب شعر کہنے کا تیرے نہیں ہے یہ مضمون و آبرو کا ہے سودا یہ سلسلہ

'آبرو' کی طرز میں ایک غزل لکھی ہے :

ہو شاد اِس غزل سے روح آبرو کی سودا
تو اس زمیں میں ناداں طور اپنا کیوں نہ بولے

میر حسن کا زمانہ کسی قدر بعد کا ہے' لیکن اس نے بھی اِیہام میں طبع آزمائی کی ہے' چنانچہ اپنے تذکرے میں اپنے چند شعر بطور نمونہ نقل کیے ہیں' جن کی نسبت لکھا ہے "چند اشعار بطور قدماے اِیہام بنداں گفتہ شد"- اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ اِیہام گوئی کا اثر کچھ نہ کچھ باقی تھا اور شاعر کم از کم بطور تفریح اِیہام میں طبع آزمائی کرتے تھے لیکن اِسی زمانے میں لوگ اِس سے بیزار ہوتے جاتے تھے جیسا

کہ سودا کے اوپر کے دو شعروں سے واضح ہے - یہی وجہ ہے کہ نوجوان شعرا کے حلقے میں یہ طرز مردود ٹھہری - اس کے غیر فطری ہونے پر نظر کر کے اُس کے خلاف شاعروں نے علم احتجاج بلند کیا - سودا نے صاف لکھا ہے :

یک رنگ ہوں آتی نہیں خوش مجکو دو رنگی
منکر سخن و شعر میں ایہام کا ہوں میں

اِیہام گوئی کی بے وقعتی میر صاحب کی راے سے بھی ظاہر ہوتی ہے جو انہوں نے احسن اللہ کے اشعار کے حق میں ان الفاظ میں صادر کی ہے " طبعش مائل بہ اِیہام بود ازیں جہت شعر او بے رتبہ ماند " -

مظہر ، سودا ، میر وغیرہ نے جب اس طرز کو چھوڑنا پسند نہیں کیا اور ایک نئی روش زیادہ وسعت اور پھیلاؤ کے ساتھ اختیار کی تو ان کو زیادہ دشواری اور دقت پیش نہیں آئی اس لیے کہ قدیم طرز سے عام بیزاری پھیل گئی تھی ، زبان بڑی حد تک بن چکی تھی ، الفاظ کا کافی ذخیرہ موجود تھا ، زبان کے ابتدائی قواعد اساتذہ کے کلام سے مستنبط تھے ، فارسی عروض مدتوں پہلے اردو شاعری کا بنیادی عنصر بن چکا تھا ، نئے دور کے مذاق نے کئی الفاظ و محاورات کو متروکات میں داخل کر دیا تھا ، یہاں تک کہ کہنہ گو و مشاق بوڑھا استاد حاتم بھی اس اثر سے نہ بچ سکا - اسے بھی سنہ ۱۱۶۹ھ میں " دیوان زادہ " نئی طرز میں مرتب کرنا پڑا - ولی کی استادی کا اثر جس کا خود اس نے اعتراف کیا ہے ، زبان و خیال کے اعتبار سے کم ہونے لگا اور رفتہ رفتہ قدیم زبان بڑی حد تک متروک اور ہند کی زبان میں طبع آزمائی شروع ہوگئی - حاتم نے لکھا ہے :

ہند کی گفتگو انوکھی ہے　　چرب ہے سب اوپر یہاں کی زبان

میر حسن نے بھی قدیم زبان کے ترک کرنے اور معانی و مضامین کی پیروی کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے '' چوں بنیادِ ریختہ از زبان دکن است بنابریں صاحب سخنانِ ایں فن و معنی شناسانِ مغز سخن طرز زبانِ ہر دیار را معیوب نمی دانند و پیرویِ معانی می کنند " - قدیم زبان میں اصلاح کا حال دیوان زادۂ حاتم کے دیباچے سے واضح ہوتا ہے کہ کس طرح غیر مانوس ہندی عناصر کو خارج کرکے مروجہ زبان کے مطابق فارسی اجزا شامل کیے گئے :-

'' لفظ 'در' و 'بر' و 'از' و 'واژ' کہ فعل و حرف باشد در دیوان خود تقید دارد- دریں ولا از دہ دوازدہ سال اکثر الفاظ را از نظر انداختہ لسان عربی و زبان فارسی کہ قریب الفہم و کثیر الاستعمال باشد و روز مرۂ دہلی کہ مرزایان ہند و فصیحان رند در محاورہ دارند' منظور داشتہ' سوائے آں زبان ہر دیار بہ ہندوی کہ آں را بھا کا گویند موقوف کردہ' محض روز مرہ کہ عام فہم و خاص پسند بود اختیار نمود ...... ایں قاعدہ (قاعدۂ متروکات) را تا کجا شرح دہد - غرض کہ خلاف محاورہ و غیر مصطلح و غلطی روز مرہ و نقصان فصاحت را دخل نہ باشد '' -

حاتم کے اس بیان سے قدیم زبان میں اصلاح کا اندازہ ہوتا ہے اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہندی عنصر کم ہوتا گیا اور فارسی عربی کے اجزا مستحکم ہوتے گئے- اس باب میں مظہر جان جاں نے اس قدر غلو کیا کہ اس زمانے میں ان کی اردو کو اہل فن نہ ریختہ کہتے تھے اور نہ فارسی بلکہ ان کی اردو کا حال بقول سودا '' کتا دھوبی کا

کہ گھر کا نہ گھاٹ کا" تھا * —

یہیں سے فارسی اور ہندی کے عناصر میں اعتدال و توازن پیدا کرنے کی کوشش کا آغاز ہوا - اس سلسلے میں میر کے اس بیان پر نظر رکھنی چاہیے جس میں انہوں نے ریختہ کی اقسام کا ذکر کیا ہے اور آخر میں اس طرز کا ذکر کیا ہے جو اس دور میں رائج ہوئی - اس بیان سے یہ بھی واضح ہوجائے گا کہ ریختہ گوئی نے رفتہ رفتہ کیا صورت اختیار کی اور اس دور میں آکر اس کا کیا رنگ ہوا - یہ بیان چونکہ اس دور کے ایک مشہور استاد کا ہے اِس لیے ہر طرح لائق غور ہے' میر صاحب نے لکھا ہے : —

" ریختہ کی چند قسمیں ہیں ...... پہلی یہ کہ ایک مصرعہ فارسی اور ایک ہندی ہو مثلاً قطعۂ امیر خسرو : —

زر گر پسرے چو ماہ پارا　　کچھہ گھڑیے سنواریے پکارا
نقد دل من گرفت و بشکست　　پھر کچھہ نہ گھڑا نہ کچھہ سنوارا

دوسری قسم یہ ہے کہ آدھا مصرعہ ہندی ہو اور آدھا فارسی جیسا کہ میر معز کا شعر ہے —

از زلف سیاہ تو بدل دھوم پڑی ہے　　در خانۂ آئینہ گھٹا جھوم پڑی ہے

تیسری قسم یہ ہے کہ فارسی کے حروف و افعال استعمال کیے جائیں - یہ قبیح ہے - چوتھی قسم یہ ہے کہ ایسی فارسی ترکیبیں لائی جائیں جو زبان ریختہ کے مناسب ہوں - یہ جائز ہے - لیکن اسے غیر شاعر نہیں جانتا' ایسی ترکیبیں کہ جو ریختہ

* غالباً مظہر کے ابتدائی کلام کے متعلق راے ہے ورنہ ان کا بعد کا کلام بہت پاک صاف اور شستہ و رفتہ ہے —

کے لیے نا مانوس ہوں معیوب ہیں اور اس کا جاننا بھی سلیقۂ
شاعری پر موقوف ہے - میں نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے -
اگر فارسی ترکیب گفتگوے ریختہ کے موافق ہو تو مضائقہ نہیں -
پانچویں قسم ایہام کی ہے کہ اس فن میں جس کا رواج شاعرانِ
سلف میں تھا - اب طبائع اس صنعت میں کم مصروف ہیں
لیکن شستگی سے استعمال ہوتی ہے ' ایہام کے معنی یہ ہیں کہ
وہ لفظ ذو معنی ہو جس پر شعر کی بنیاد ہوتی ہے - ایک معنی
قریب ہوں اور دوسرے بعید - معنی بعید سے شاعر کی مراد
ہو اور قریب سے نہیں - چھٹی قسم وہ انداز شاعری ہے جسے
ہم نے اختیار کیا ہے ' یہ انداز تمام صنعتوں مثلاً تجنیس '
ترصیع ' تشبیہ ' صفاے گفتگو ' فصاحت بلاغت ' ادا بندیِ خیال '
وغیرہ پر محتوی ہے " —

ریختہ کی یہ تعریف و تحدید ممکن ہے کہ تحقیقی نقطۂ نظر سے
سے بالکل صحیح ثابت نہ ہو لیکن اس قدر تو یقینی ہے کہ اس دور کے
اساتذہ نے اردو شاعری کا انداز ہی بدل دیا اور اس میں وہ تمام
ضروریات اور لوازمات اختیار کرلیے جو شاعری کو سنوارنے اور بنانے
میں کام آتے ہیں - ان تمام التزامات سے ظاہر ہوتا ہے کہ فارسی کا اثر
بہ شدت داخل ہورہا تھا ' لیکن زبان کو غیر مانوس ترکیبوں اور لغات
سے پاک کر کے ہندی اور فارسی عناصر میں توازن و اعتدال بھی پیدا
کیا جا رہا تھا —

شمالی ہند میں جب اردو شاعری کا آغاز ہوا تو گنتی کے صرف چند
شاعر تھے ' ایہام گو بھی چند ہی تھے جس سے ظاہر ہے کہ اُردو شاعری ابھی

زیادہ مقبول نہیں ہوئی تھی' لیکن ایہام گوئی کے خلاف کوشش شروع ہوئی تو شاعروں کی تعداد میں ایک غیر معمولی اضافہ ہوگیا - اس کا ثبوت ان تذکروں سے آسانی سے مل جاتا ہے جو اس دور میں لکھے گئے ہیں - سنہ ۱۱۶۵ھ میں میر نے اپنے تذکرہ نکات الشعرا میں ایک سو چار شاعروں کا ذکر کیا ہے اور سنہ ۱۱۶۶ھ میں گردیزی نے اٹھانوے کا جن میں پچیس شاعر ایسے ہیں جو میر کے تذکرے میں شامل نہیں ہیں - سنہ ۱۱۸۸ھ میں قدرت اللہ شوق نے دو سو اٹھاسی شاعروں کا ذکر کیا ہے اور میرحسن نے قبل ۱۱۸۸ھ ما بعد ۱۱۹۳ھ دو سو اٹھاسی کا - شورش نے سنہ ۱۱۹۳ھ میں تین سو چودہ شاعروں کا تذکرہ لکھا ہے اس کے بعد شاعروں کی تعداد میں اس شدت سے اضافہ ہونے لگا کہ حصر و شمار آسان نہیں - اس تعداد اور تدریجی ترقی پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اُردو شاعری نے تیس چالیس سال کے عرصے میں غیر معمولی مقبولیت اور ترقی حاصل کرلی - چنانچہ اس کا ثبوت ان مجلسوں کی کثرت سے بھی ملتا ہے جن میں ریختہ گو شاعر اپنا کلام سناتے تھے - فارسی گویوں کے لیے غزلوں کو منظر عام پر لانے کا ذریعہ مشاعرے تھے اس زمانے میں کئی جگہ مشاعرے ہوتے تھے - سب سے زیادہ مشہور سالانہ مشاعرہ مرزا بیدل کے عرس کے موقع پر ہوتا تھا - اس زمانے کے شاعروں کے کلام اور دیگر تحریروں سے اس کا حال معلوم ہوتا ہے * فارسی گویوں کے مشاعروں کے توڑ پر ریختہ گویوں نے مراختہ (صحبت ریختہ گویاں) کی بنا ڈالی تھی' چنانچہ مراختے کئی جگہ ہوتے تھے - مراختۂ خان آرزو' یہ ہر قمری مہینے کی پندرھویں تاریخ کو خان آرزو کے مکان پر منعقد ہوا کرتا تھا - حاکم لاہوری نے اپنے

* ملاحظہ ہو ہجو مولوی ندرت از سودا' رقعات انند رام مخلص —

تذکرہ " مردم دیدہ " میں اس کا ذکر کیا ہے ' مراختۂ خواجہ میر درد ' یہ بھی ہر مہینے کی پندرھویں کو درد کے مکان پر منعقد ہوتا تھا - معلوم ہوتا ہے کہ خان آرزو کے مراختے کا سلسلہ بند ہوا تو انہوں نے اپنے ہاں یہ صحبت گرم کی - کچھ دنوں یہ سلسلہ جاری رہا - اس کے بعد درد نے یہ محفل اپنے ہاں رچانی بند کردی اور میر تقی میر سے کہا کہ ان کے ہاں مراختے منعقد ہوا کریں ' چنانچہ میر کے ہاں یہ صحبت گرم ہونے لگی - ان کے سوا میر نے اپنے تذکرے میں چند اور مراختوں کا ذکر کیا ہے - مراختۂ میر سجاد ' مراختۂ جعفر علی خاں زکی ' مراختۂ میر علی نقی وغیرہ - مشاعروں کی ترقی پذیر کثرت اور مجالس ریختہ کی ہنگامہ آرائی پر نظر کرکے ماننا پڑتا ہے کہ فارسی کا چراغ ٹمٹما رہا تھا اور ریختہ گوئی کا ہر طرف بازار گرم تھا —



گجرات کا باکمال شاعر اردشیر خبردار

از

(جناب اختر حسین صاحب رائے پوری)

دور حاضر کے گجراتی شاعروں میں اردشیر خبردار کا مرتبہ سب سے افضل اور بلند ہے - اس میں شک نہیں کہ اس امتیاز اور مقبولیت کی ایک بڑی وجہ اس کی قومی شاعری ہے اور وہ ستیاگرہ تحریک کا نہایت ہی نازک نگاہ ترجمان ہے - لیکن ہمارے خیال میں کوئی اصلاحی تحریک کسی آرٹسٹ کے جذبات میں وہ گرمی نہیں پیدا کر سکتی جو اس کی تخئیل و قوت تخلیق کو تحریک دے سکے - اصلاح کا مقتضاء توازن ہے اور آرٹ کا منتہا خود فراموشی اور بے بسی - لہذا شاعری جب اس میدان میں قدم رکھتی ہے تو صرف بغاوت اور انقلاب کی ہمنوا ہو سکتی ہے - اصلاح اور توازن کے ساز پر اس کا نغمہ بے کیف اور بے نمک رہ جاتا ہے - اردشیر خبردار کی قومی شاعری میں وہ ولولہ اور جوش ہم نہیں پاتے جو اقبال اور نذرالاسلام کے ہاں بدرجۂ اتم موجود ہے - لیکن اسے چھوڑ کر خبردار کے پاس جو سرمایہ رہ جاتا ہے وہ ایسا ہے کہ صرف گجرات ہی نہیں بلکہ تمام ہندوستان اس پر بجا طور پر فخر کر سکتا ہے اور آج اس کا تعارف ہم کسی قومی شاعر کی حیثیت سے نہیں بلکہ

ایک جمالیاتی آرٹسٹ کی حیثیت سے کرا رہے ہیں —

ہندوستان میں عشقیہ شاعری نے دو مختلف راستے پکڑے - ایک تذکر تو سنسکرت شاعروں کے لیے عام طور پر اور کالی داس کے لیے خاص طور پر مخصوص ہے - کالی داس فطری حسن کا دلدادہ تھا اپنے جذبات کو حسن و جمال کا آئینہ نہیں' بلکہ حسن فطرت اور مناظر قدرت کو اپنے محسوسات کا درپن بناتا تھا - ندی نالے اور جنگل پہاڑ اپنی اپنی بولیوں میں سرگوشیاں کر رہے ہیں اور کالی داس بلا تکلف انہیں قلم بند کرتا چلتا ہے - یہ وہ زمانہ تھا جب روح اور مادے کی کش مکش میں دوگونیت پیدا نہ ہوئی تھی - بعد میں ویشنو اور بھکتی تحریکوں سے ویدانت' زوجانیت نوازی اور داخلیت کا اثر بڑھا اور شاعر نے مظاہرات کا آئینہ دار اپنی خودی کو بنایا - بذات خود قدرتی نظاروں میں کوئی کشش نہ رہی بلکہ شاعر کی ذہنی کیفیت پر ان کے نظاروں کا ردّ عمل کہیں زیادہ اہم قرار پایا - سنسکرت اور ہندی شاعری میں اس اختلاف نے بعدالمشرقین پیدا کردیا - ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ آج کل کلاسک سنسکرت شاعری کا سب سے باکمال نمائندہ اردشیر خبردار ہے اور اس کی شاعری میں واردات عشق کے ظاہری و باطنی پہلوؤں کے امتزاج نے بڑی خوبی پیدا کردی ہے —

اردشیر خبردار کی زندگی ویسی ہی ہموار و یک رنگ رہی ہے جس کی توقع ہندوستان کے کسی متوسط طبقے کے فرد سے کی جا سکتی ہے - صوبۂ بمبئی کے شہر دمن میں نومبر سنہ ۱۸۸۱ ع میں وہ ایک نامور پارسی گھرانے میں پیدا ہوا - بیشتر آرٹسٹوں کی طرح اسکول کی تعلیم اسے غیر دلچسپ معلوم ہوئی اور اوایل عمر میں ہی وہ مدرسے سے

علحدہ ہوکر نہج کے طور پر مطالعہ کرنے لگا - شاعری سے اسے ایک خاص شغف تھا اور ۱۶ سال کی عمر میں جب اس کے سو دوہے شایع ہوے تو خرانت بوڑھوں نے عبلک میں سے اسے گھور کر سر ہلایا اور اس کے روشن مستقبل کی پیشین گوئی کی - اس کے بعد سے اس کے کمالات اور شہرت میں برابر رقابت ہوتی آئی ہے - اس کی انگریزی نظموں کا مجموعہ (Silken Passel) انگلینڈ کے اہل نظر سے خراج تحسین وصول کر چکا ہے اور دوسرا مجموعہ غالباً وہاں کی (Poetry Society) کی طرف سے شائع ہونے والا ہے - اس کی قومی نظمیں گجرات کے بچے بچے کی زبان پر ہیں اور گاندھی جی بھی فرصت کے اوقات میں انہیں دھیمے سروں میں گنگنایا کرتے ہیں! اس کی فلسفیانہ نظموں کا مجموعہ 'درشنکا' ذی ہوش لوگوں کے لیے سرمۂ بصیرت اور روح پرور بزرگوں کے لیے تفسیر حقیقت ہے - بہر حال اس کا نظریۂ زندگی صحیح ہو یا نہ ہو اس کی قادرالکلامی مسلّم الثبوت ہے ـــ

لیکن فنا کا سرد چنگل ویدانت اور ستیاگرہ سب کے لیے ہے - ایک تخیل ہے جسے کبھی فنا نہیں اور آرتسٹ جب تخیل کے کاغذ پر حسن کی روشنائی اور عشق کے قلم سے انسانیت کے خدوخال بناتا ہے تو ابدیت اس کی تحریر پر دایمی شہرت کی مہر لگا دیتی ہے - اردشیر خبردار کی وہ نظمیں ہمیشہ شوق سے پڑھی جائیں گی جن میں وہ اپنے مخصوص انداز میں حسن کی شوخی اور عشق کی وارفتگی کی تصویر کھینچتا ہے -

یہ سچ ہے کہ اردشیر خبردار کا تغزل یاس و حرماں کے ان جذبات سے ناآشنا ہے جو اردو شاعری کا ایک خاص عنصر ہے ' لیکن غور سے دیکھا جاے تو تمام ہند و ادب اس حزنیہ (ٹریجک) رنگ سے خالی ہے جو آرٹ

کی جان ہے - اور اسی وجہ سے ہندو شاعری کی معشوقہ ایک ایسی عورت ہے جس کا ملنا اگر آسان نہیں تو دشوار بھی نہیں ہے - محرومی کی اذیت کو ہندو شاعر نہیں سمجھہ سکتا اس وجہ سے کہ جنسی معاملات میں ہندو سوسائیٹی میں ایسے بدنصیب کم ہوتے تھے جو محروم و ناکام رہ جائیں —

لیکن طرب و نشاط کی یہ وارفتگی ملاحظہ ہو کہ ہر لفظ شراب میں ڈوبا ہوا ہے اور ہر بند شاعر کی شادمانی کے ساتھہ رقصاں و خنداں ہے - روح (Soul) اور حس (Sense) کا اتحاد کیا کسی معمولی صناع کی کاریگری ہوسکتی ہے کہ جب 'ارد شیر' اپنی محبوبہ کی رفتار کا بیان کرتا ہے تو الفاظ گھنگھرو بجانے لگتے ہیں اور جب اس کی گفتار کا ذکر کرتا ہے تو بندشیں اتنی سست و سبک ہو جاتی ہیں گویا پھول جھڑ رہے ہیں گو اس کے جذبات میں وہ تنوع اور ندرت نہیں جو ٹیگور کی امتیازی شان ہے لیکن معنی آفرینی ' جدت تخیل اور رنگینیِ بیان میں وہ اپنے ہم عصر سے آگے بڑھ جاتا ہے —

زمانۂ حال میں جب زندگی کی ہنگامہ پروری اور حرفت کی سلطنت رانی نے آرٹ کو پسپا کر رکھا ہے اور وہ دن دور معلوم ہوتا ہے جب وہ از سر نو تازہ دم ہو سکے گا تو یہ ملک کم از کم اس اعتبار سے دنیا کے تمام ممالک پر ضرور فوقیت رکھتا ہے کہ آج ایسے بلند مرتبہ شاعر کسی ایک ملک میں موجود نہیں ہیں - ارد شیر خبردار انہیں معدودے چند شاعروں میں سے ایک ہے —

یہاں ہم اس کی شاعری کے چند نمونے پیش کرتے ہیں - ترجمے میں شاعر کے جذبات کو صحیح طور سے ادا کرنے کی کوشش کی گئی ہے —

محبت کا گیت

جہاں زرِ گل کے فوارے صبح و مسا چلا کرتے ہیں اور اپنے ستارہ جبیں قطروں کو ہر طرف بکھیر دیتے ہیں —

جہاں دوشیزۂ صبح خوابوں کے تانے بانے سے نور کے تار نکالتی ہے،

جہاں گلناری پردوں کے جھلملاتے ہوے سایے تل کی طرح سمٹ جاتے ہیں اور مستانہ ہوائیں محو خرام رہتی ہیں —

جہاں دوج کے چاند کی ملگجی کرنیں غش کھا کر صبح تاباں کے آغوش میں گر پڑتی ہیں —

وہیں، میں ہری ہری دوب پر ناچتی ہوئی دنیا والوں کو اپنے گیت سناتی ہوں —

جب آفرینش کا سوتا سوکھا ہوا تھا اور دنیا کی بساط ایک بے روح ہیولیٰ سے زیادہ نہ تھی —

جب ہر ذرہ اس شعلے کے انتظار میں دم بخود تھا جس کی لپک جان جہاں بن جاے گی —

جب 'زمانہ' اپنی آنکھوں اور کانوں کو بازوؤں سے ڈھک کر خاموش و مبہوت بیٹھا ہوا تھا —

اور حقیقت خوابیدہ اس ڈور کی تلاش میں حیران تھی جو مدتوں پہلے اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی —

تو — میں نے ایک رسیلا نغمہ چھیڑا اور اے لو، انھیں میرے ہر ہر نقش قدم پر ایک ایک عالم کروٹ لیتا نظر آیا —

میری بنسی کی ہر تان ایک چنگاری تھی جس نے رات کے ڈھیکوں میں جوت جگا دی —

اور سنہرے پرندوں کی طرح، مہر و ماہ نے میری مسرت کی نورانی

مالاؤں میں گوندھ کر دنیا کے گلے میں پہنا دی —

میری نواسنجی کے سانچے میں خلد بریں کا کالبد ڈھلا اور وہاں کے برگ و شجر نے غیر فانی انبساط کا لباس اوڑھ لیا —

اور 'وقت' موسیقار کی طرح آپ اپنی خاکستر سے اٹھا کہ میرے مندر کی آرتی کرے —

اور میرے سرگم کی سیڑھیوں پر چڑھ کر 'حقیقت' میرے حضور میں سجدہ ریز ہوگئی —

میرا ہر تار نفس بہار کی دلربائیوں کے ساتھہ غزل خواں ہے - میں بادلوں کے جھولے پر جھولتی ہوں' وہ میرے اشاروں پر رقص کرتے ہیں۔

اور میں برشگال کی ہلکی ہلکی پھوار کے ساتھہ ناچتی ہوں - کبھی زمستاں کی سرد پتیوں کے ساتھہ میں خاک بسر رہتی ہوں —

اور کبھی باد سموم کی ہم رکاب ہو جاتی ہوں —

کبھی برف کے ٹکڑوں کے ساتھہ زمین پر پھسلنے لگتی ہوں —

کبھی میں دن کی روشنی کے ساتھہ آتی ہوں اور کبھی رات کے ساتھہ — وہ رات جو سپنا پوری کی ملکہ ہے —



تیرا تبسم

تیری مسکراہٹ بھالے کی وہ انی ہے جو فولاد کے دل و جگر میں بھی سوراخ ڈال دیتی ہے —

وہ دھوپ چھانو کی پرچھائیں ہے جو ندی کے سبک رفتار دھارے کو آئینہ دکھاتی ہے —

تیرا تبسم گلاب کا وہ پھول ہے جس کی پنکھڑیاں برف پر بکھر گئی ہوں -

جان من! تجھے کیا خبر کہ تیری کرشمہ گری نے 'تبسم' کا پیرایۂ

اظہار اختیار کرلیا ہے —

ایک جنبش لب ؟ — اور میرے خیالات کا سارا شیرازہ منتشر ہوگیا -

ایک لرزۂ تبسم ؟ — میں اس کا اتنا ہی رسیا ہوں جتنا سردیوں میں سورج کی ایک کرن کا —

ہلکی سی مسکراہٹ ؟ — اور میرا دل آپ اپنی خود فریبیوں کے دام کا اسیر ہوگیا —

جان من ! اس شمع کی لو کو زیادہ نہ اُکسا ورنہ کس کا دیدہ ہے جو خیرہ نہ ہوجائے —

گرمیوں کی کوئی صبح تیری مسکراہٹ کی دلکشی کو نہ پاسکی سردیوں کی چاندنی کو لجاجت کا یہ انداز کب میسر ہے ؟ شفق شام یا آیا کسی گل خنداں میں یہ بانک پن نہ آیا — نہ آیا —

حسن و جمال کا کوئی مجسمہ قوس قزح کی رنگینیوں کو ہونٹوں میں گھلا کر یوں فضا میں نہیں بکھیر سکتا —

تیرے تبسم کی ضیا طرازی میں میری چمک جگنو کی طرح ماند پڑ رہی ہے -

للہ ! ان ہونٹوں اور آنکھوں کو دوسری طرف پھیر لے جنکی ہر جنبش کے ساتھ جنت کے چراغ جلتے اور بجھتے ہیں -

تیرا تبسم میری دنیا میں ہنگامہ برپا کر دیتا ہے اور پھر اس کے بغیر ہر طرف سناٹا ہوتا ہے — سناٹا اور اندھیرا ! —

اگر اس دنیا میں کوئی بہشت بن سکتی ہے تو اس کی تخلیق تیرے ہی تبسم سے ہوگی ! میرے سرو ناز' ایک مرتبہ اسی انداز سے مسکرا دے -

(۱) نظارہ

واردات محبت | کف دریا کی طرح سبک اور سفید پھولوں کی سیج سے — خواب ناز سے میری محبوبہ یوں بیدار ہوئی گویا گل

صنوبر کی ایک چوڑی لچک کر ٹہنی سے گر پڑی ہو۔

گویا سپنا پوری سے کوئی دیوی اس دنیا میں اتر آئی ہو۔ یا لہلاے شب کی گود میں بنت نور مچل اٹھی ہو اور اس کی جلوہ گستری نے زمین و آسمان کو شاداں و فرحاں کردیا ہو —

رات سے کہو کہ بھول جاے اپنے تمتماتے ہوے ستاروں کو اور صبح سے کہو کہ بھول جائے اپنے شبنمی اجالے کو۔

سمندر سے پوچھو کہ کیوں یاد کرتا ہے اپنی بیکرانی کو، اور بہار سے پوچھو کہ کیوں یاد کرتی ہے اپنی چمن آرائی کو، نہیں بھول سکتا کیا یہ پھول اپنی نازک ادائی کو، اور کب تک روئےگی زمین ان نونہالوں کو جو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پیوند خاک ہوگئے —

اگر وہ بھول سکتے ہیں تو سب کچھہ بھول جائیں کیونکہ دیدار محبوب کے بعد شاعر اپنے گیتوں کو بھی بھول رہا ھے —

دل نواز! یہ جو صداے نغمہ فضا میں گونج رہی ہے —

دراصل ان لہروں کی صداے بازگشت ھے جو تیری روح کے وسیع سمندر میں اٹکھیلیاں کیا کرتی ہیں۔

ان موتیوں کی چمک میں جو تیرے دل کی گہرائیوں میں سامان نظارہ مہیا کر رہے ہیں۔

(۲) حسن

کلی کے لوچ سے پھل رنگ و بو حاصل کرتا ہے اور سیلاب اشک میں مسکراہٹ کی سیپی اجاگر ہوتی ہے - رات کی گہری تاریکی میں دنیا ابدیت کے خواب دیکھتی ہے اور قدرت کے ارتقا میں انسان کی قوت پروان چڑھتی ہے - زندگی موت کے رتھہ پر بیٹھہ کر جہاں گشتی کرتی ہے اور کانٹوں کے آغوش میں پھول یوں کھلتا ہے جیسے رشک کے آغوش میں عشق!

اور جس طرح نور عالم سمٹ کر آفتاب میں سما جاتا ہے اسی طرح حسن کے سارے تار میری محبوبہ کے رباب میں اکٹھا ہوجاتے ہیں —

دیکھا ہے کبھی راج ہنس کو تم نے مان سرور میں تیرتے ہوے دیکھا ہے کبھی قطرہ کو گہر ہوتے ہوے ؟ برف کو پگھلتے ہوے ؟ اور یا تم نے کوکل کی پتی کی نزاکت کو غور سے دیکھا ہے ؟ کسی تیتری کے پر کبھی تمہارے ہاتھوں پر تھرتھرائے ہیں ؟ شاعری کے ابدی ترانوں کی گونج کبھی روح کے ساز پر سنی ہے ؟ —

خواب میں کوئی پری کبھی تمہیں کوہ قاف اٹھا لے گئی ہے ؟ اگر ایسا ہوا ہے — تو تم میری محبوبہ کی نزاکت، ملاحت اور لطافت کا اندازہ لگا سکتے ہو — جو آب حیات سے زیادہ لطیف، کنول سے زیادہ ملیح، اور چھوئی موئی سے زیادہ نازک ہے - میری محبوبہ جاڑوں کی چاندنی کی طرح سیمیں اور چودھویں کے چاند کی طرح خنداں و فرحاں ہے -

وہ امرت کے لب ریز پیالے کی طرح جوانی کے رس میں شرابور ہے کاش میں وہ ساغر ہوتا جس میں یہ شراب شباب ڈھالی گئی ہے تو میں اسے اپنی رگوں میں اس طرح حلول کر لیتا کہ ایک قطرہ بھی چھلک کر نہ گر سکتا -

(۳) نشاط

سنوار نکھار کے بعد میری محبوبہ گل شگفتہ کی طرح آغوش کشودہ ہو جاتی ہے -

دور سے میرے ذہن حریص بھونرے کی طرح اس کے رس کو چکھنے کے لیے ابرؤں کے پر تولنے لگتے ہیں -

پھر میں کوشش کرتا ہوں کہ اپنی ملتجی آنکھوں کی ڈور سے پتنگ کی طرح اسے اپنی طرف کھینچ لوں -

لیکن یہ دیکھو وہ نہیں پڑی — اور چشم زدن میں ڈور کٹ گئی اور پتنگ پھر ہوا میں اڑنے لگی -

اپنی سہیلیوں کے ساتھہ وہ تالاب میں جل کلیل کرتی اور تھک کر کنارے پر بیٹھہ جاتی ہے -

جب وہ جوڑا کھول کر پانی میں اپنے پانو لٹکا دیتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ عروس شام نے مشرق کی ساری رنگینیاں چرالی ہیں -

اور جب وہ اپنے گلے میں کنول کے ڈنٹھلوں کی مالا ڈال لیتی ہے تو گمان ہوتا ہے کہ سنگ مرمر کے ایک بت پر کیوپڈ نقش و نگار بنا رہا ہے -

جب وہ پانی میں منہ دیکھتی ہے تو گویا چاند فرش آب پر کنول کے جھولے میں جھولنے لگتا ہے -

سورج کو اس لیے پوجتا ہوں کہ اس میں عظمت ہے اور آگ کو اس لیے کہ اس میں روشنی ہے —

چاند کو اس لیے پوجتا ہوں کہ اس میں حسن ہے اور دریا کو اس لیے کہ وہ غیر فانی ہے —

بادل کو اس لیے پوجتا ہوں کہ وہ کبھی گرجتا ہے ' کبھی برستا ہے

اور کبھی کھل جاتا ھے —

اور ھوا کو اس لیے کہ وہ کبھی آندھی بن جاتی ھے اور کبھی نسیم و شمیم —

کیوں نہ ان دیوتاؤں کو چھوڑ کر ایک اپنی محبوبہ کی پرستش کروں جس میں یہ سب صفات موجود ھیں —

وہ سورج بننا چاھے تو واللہ میں آسمان بن جاؤں —

اور وہ بجلی بنے تو میں بادل بن جاؤں —

وہ کویل بنے تو میں آم کی ڈال بن جاؤں اور وہ مرلی ھونا چاھے تو میں 'کشن' بن کر اسے ھونٹوں سے لگالوں —

وہ سمندر بنے تو میں ساحل ھو جاؤں —

اور وہ پھول بنے تو میں بھونرا بن کر ھمیشہ اس کے کانوں میں سر گوشیاں کروں —

الہی! مجھے حیات دارین عطا کر کہ میری محبت کا چراغ ھمیشہ روشن رھے —

وہ دیکھو، وہ جان جاں، وہ بلند حیات، وہ دل کی کلی ادھر آرھی ھے - میرے پاس ھزار جانیں ھوتیں تو سب کو اس کی ایک لغزش مستانہ پر نثار کر دیتا —

وہ آرھی ھے — ایک سرجوش لہر کی طرح جو میرے دل سے ایک میٹھے راگ کی طرح ٹکرا جاتی ھے —

میں ایک بت سنگین تھا جسے اس کی ایک ٹھوکر نے 'اھلیا' کی طرح زندہ کر دیا —

اعجاز مسیحا پر کیوں نہ ایمان لاؤں کہ خود بھی تو ایک فسوں طراز کا جلایا ھوا ھوں —

---

(۴) پوجا

نہ آفتاب تھا اور نہ ماہ تاب — ایک تیرا ہی جلوہ تھا —

نہ سمندر تھا اور نہ ساحل — زمین سے آسمان تک تیرے سوا کچھہ نہ تھا -

نہ جنون تھا نہ عقل — فہم و وہم سب تیرے کرشمے تھے -

نہ پرواز تھی نہ رفعت — فضا تیری تھی' صبا تیری تھی —

نہ تو آسمان میں تھی اور نہ زمین میں - تو محبت کے اُڑن کھٹولے پر بیٹھہ کر ایتھر کی چادروں میں لہراتی رہتی تھی —

---

(۵) بے بسی

عشق کا بندہ ہوتے ہوئے بھی یہ کہنے کی جرات نہیں ہوتی کہ میں اس کی حقیقت کو پا گیا -

اس کی ایک آنکھہ تبسم بہ کنار اور دوسری اشک بار ہے - اس کے ایک ہاتھہ میں روشنی اور دوسرے میں تاریکی ہے —

وہ آگ سے زیادہ گرم اور برف سے زیادہ سرد ہے - وہ زندگی' خواب اور موت کا حسین ترین امتزاج ہے - اس کا سر بہشت بریں میں ہے تو پانو تحت الثریٰ میں —

مجھے یہ کہنا چاہیے کہ میں محبت سے ناواقف ہوں لیکن اس کی جھلک سے تجھے پہچان گیا ہوں —

کبھی کبھی میری آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب امنڈ آتا ہے اور میں سوچتا رہ جاتا ہوں کہ حدیث عشق کی تفسیر یہی تو نہیں ہے —

وہ ہمارے آنسو ہیں جو آسمان پر جم کر ستارے بن گئے ہیں —

جان من' زمین آسمان کی دی ہوئی بارش کے معاوضے میں کیوں

نہ ہمارے آنسوؤں کی جھڑی کا منہ اوپر کی طرف پھیر دے اور ان کے ساتھہ اوپر چڑہ کر میری روح جنت کی رنگینیوں میں تحلیل ہو جائے —

آفتاب صبح اس لیے طلوع ہوتا ہے کہ شام کو غروب ہو جائے —

لیکن محبت کا آتش کدہ ایک مرتبہ بھڑک کر کبھی نہیں بجھتا -

ستاروں کے پھول اس لیے کھلتے ہیں کہ مرجھا جائیں لیکن آسمان کا گل کدہ سدا بہار ہے —

جب مہ و انجم نوامحروم سروں میں بہاگ گاتے ہیں تو او خدائے محبت ! میں سمجھہ جاتا ہوں کہ درد کی انتہا یہ ہے کہ دوا ہو جائے —

---

(۶) ہوش

ایک مرتبہ میری کشتی بھنور میں پڑ گئی ' اس کے مستول اور بادبان توٹ کر پانی میں گر گئے اور لنگر بھی بہہ گیا —

کسی گم دیدہ مسافر کی طرح گمراہ ہو کر یہ ناؤ منجدھار میں یوں حیران و غلطاں چکر کاٹ رہی ہے کہ سمت و ساحل دور سے اسے دیکھہ کر ہنس رہے ہیں -

اور اسی خستہ حالی میں کیا دیکھتا ہوں کہ افق پر سورج ندی سے نہا کر نکلا اور ایک سنہری کشتی بام فلک پر ہویدا ہوئی —

نہنگ آسا موجوں میں پھنس کر میری ننھی سی ناؤ تنکے کی طرح کبھی ڈوبتی ہے ' کبھی ابھرتی ہے -- کیا معلوم کہ ناخدا میری خبر لے گا یا نہیں —

آج جو میری محبوبہ اداس ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے اپنے ریاکار بندوں کا سوگ لیا ہے —

اس کے ہونٹوں پر تبسم بے جان ہو کر تڑپ رہا ہے اور یہ محسوس

ہوتا ہے کہ آسمان پر بادل گھر تو آئے ہیں لیکن نہ وہ برستے ہیں اور نہ کھلتے ہیں — نہ ان میں بجلی تڑپتی ہے —

آہ، مجھ غم زدہ کی جانت سونی ہو رہی ہے میری بے نور آنکھوں کا کاجل ڈھل رہا ہے —

میں نے کائنات کا ہر ذرہ چھان مارا لیکن میری مایۂ حیات کہیں نہ ملی -

میں ازل اور ابد کے سروں کو دیکھ آیا - اور تحت الثریٰ کی عمیق گہرائیوں تک پہنچ گیا - آفتاب کی آتشین زلفوں کو کمند بنا کر میں اس غار میں اترا جہاں تاریکی اور تنہائی دو بہنیں رہتی ہیں -

لیکن وہ مشام جاں کہیں نہ ملی اور میرے گیتوں کے ڈینے ٹوٹ کر ہوا میں منتشر ہو گئے —

---

(۷) کامرانی

او مرغ خوش الحان، تو ہمیشہ سر بلند پہاڑیوں کی سیر کرتا رہا ہے - اب نیچے اتر اور وادیوں کو بھی اپنے نغموں سے زمزمہ ریز کر دے - تو ہمیشہ عظمت و رفعت کا جویا رہا ہے —

آ، اور میدان کی وسعت کو بھی ایک نظر دیکھ جا —

ان بدلیوں میں پانی ہے تو ان برساتی ندیوں کی اٹھتی جوانی بھی کچھ کم تسکین بخش نہیں —

آ، میرے نغمہ گر اور اپنے میٹھے بولوں سے ان میدانوں میں امرت کی دھار بہا دے —

درد نا آشنا ساحل کو منانے کے لیے سمندر روز اس کی خدمت میں جل پریوں کے غول بھیجا کرتا ہے —

وہ کبھی ہلکے سروں میں گاتی ہیں' کبھی آنسوؤں سے اس کے پھر دھوتی ہیں' کبھی اس کی سنگ دلی پر کھیج کر چیخ اٹھتی ہیں —

یہ ساحل کبھی نہ پسیجیگا — اور ایک دن وہ آئے گا کہ مدوجزر کا طوفان اس کے بند بند توڑ دیگا —

پیاری' اسی طرح دریاے محبت میں طوفان اٹھنے والا ہے جو تجھے اپنے آغوش میں ہمیشہ کے لیے چھپا لے گا —

محبت کے ڈینوں پر بیٹھہ کر میں اندھیرے میں اڑا کرتا ہوں - میں صرف ایک گیت گاتا ہوں' میرے ساز میں صرف ایک راگ ہے' ایک تان ہے' ایک سر ہے —

میں صرف ایک خواب دیکھتا ہوں —

میں نے سب دیوتاؤں کے مندر توڑ کر ایک مندر کھڑا کیا ہے جس کا نام ہے — پریم مندر —

میرے لیے سارے الفاظ کے معنی صرف ایک لفظ میں سمٹ آئے ہیں - پریم -

---

الوداع

میرے گیت' جا اور آسمان پر وہ ساز چھیڑ کہ ستارے ٹوٹ کر گر پڑیں اور تیری ایک ایک تان اس کی جگہ لے لے' حتیٰ کہ تو سارے فلک پر چھا جاے - اب تک تو نازک پودوں کی لچک دار ٹہنیوں پر نواریز رہا اور یا میری جھوپڑی میں بیٹھہ کر نوحہ خوانی کرتا رہا —

اب جا اور اس آسمانی ملک کو اپنی سحرنوائی سے مدھوش کر دے جو گوش برآواز تیرا' منتظر ہے —

بادۂ کہن

غزلیات اشرف

اشرف، ولی کے معاصرین میں خاص درجہ رکھتا ہے - ولی اور اس کے معاصرین نے اپنے کلام میں اس کا ذکر کیا ہے - ولی کا شعر ہے :-

اشرف کا یو مصراع ولی مجکوں ہے دلچسپ
الفت ہے دل وجاں کوں مرے پیم نگرسوں

اشرف نے بھی ولی کا ذکر کیا ہے —

کرتا ہے یو مصراع ولی صید دل اشرف
پھر مری خبر لینے وو صیاد نہ آیا

ان اشعار سے اشرف کا معاصر ولی ہونا ثابت ہے - ایک اور ثبوت ان کی معاصرت کا ہے ولی نے اپنے کلام میں سید ابوالمعالی نامی سید زادے کا ذکر کیا ہے اور بقول قایم اس کے ساتھ ۱۱۱۲ھ میں دھلی کا سفر بھی کیا تھا - قایم لکھتا ہے —

" درسنہ چہل وچہار از جلوس عالمگیر ہمراہ سید ابوالمعالی نام سید، پسرے کہ دلش فریفتۂ او بود بشاہ جہاں آباد آمد " —

اشرف نے بھی سید معالی کے حسن و جمال کی تعریف میں ایک پوری غزل لکھی ہے اور متفرق اشعار میں اس کا ذکر کیا ہے، اس کا ایک شعر ہے —

معالی حسن میں سب سوں بڑا ہے　　اسے دیکھن کوں کئی عالم کھڑا ہے

شفیق نے اشرف کو معاصرِ ولی لکھا ہے لیکن حمید اورنگ آبادی نے اس کو "بلا واسطۂ شاگرد ولی" لکھا ہے - حمید کا مدعا غالباً یہ ہے کہ اشرف باضابطہ شاگردِ ولی تو نہ تھا لیکن اس کے کلام سے فیض اٹھایا ہے - شاید ایسا ہو - لیکن اب تک نہ تو کسی تحریر سے یا خود اشرف یا ولی کے کلام سے ان کے استاد و شاگرد ہونے کا ثبوت ملتا ہے - بہر حال معاصرت مسلم ہے - ولی نے ۱۱۱۹ھ میں انتقال کیا ہے لیکن اشرف فرخ سیر کے زمانے تک زندہ رہا - سید معالی کی تعریف میں اس کا ایک شعر ہے جس میں فرخ سیر کا ذکر استعارتاً کیا ہے —

جگت کے خوبرو سارے نہ ہوئیں کیوں حکم میں اس کے
دیار حسن میں فرخ سیر سید معالی ہے

حمید نے اشرف کو گجراتی لکھا ہے لیکن اس بیان کے سوا کوئی اور شہادت یا سند اس کے گجراتی ہونے کی نہیں ملتی ہے البتہ اس نے اپنے کلام میں گجرات کے بزرگ شاہ عالم کا ذکر کیا ہے اور ان سے عقیدت ظاہر کی ہے —

پیر اشرف کے شاہ عالم ہیں　　خلف الصدق سید اقطاب
مجھ سے عاصی کوں کئیں نہیں ہے پناہ　　مگر ان کی جناب فیض مآب

یہ عجیب بات ہے کہ جس طرح ولی نے اپنے آپ کو "شاعر ملک دکن" لکھا ہے اس طرح اشرف نے گجرات کا ذکر نہیں کیا بلکہ اپنے شعر کی داد شاعرانِ دکن سے طلب کی ہے - حمید کے تذکرے میں اس کی غزل ہے جس کا مقطع ہے —

یہ شعر سن کے کہے ہیں صد آفریں اشرف
تمام شاعر ملک دکن ' سخن کی قسم

اشرف کے حالات ابھی تک روشنی میں نہیں آے ہیں - حمید نے اس

کا نام محمد اشرف لکھا ہے لیکن انجمن ترقیء اردو کے کتاب خانے میں اس کا جو دیوان ۱۱۲۹ھ میں محمد بدیع الزماں کا لکھا ہوا ہے اس میں اس کا نام جگہ جگہ "اشرف الموسوی المدنی الشاہی" تحریر ہوا ہے - یہ دیوان انجمن کو سورت میں دستیاب ہوا ہے - سنی المذہب تھا - اس لیے کہ شاہ عالم گجراتی سے عقیدت رکھتا تھا اس کے سوا اس کا ایک شعر ہے —

اخلاص سوں نظر کر اے صاحب بصیرت
ہر چار یار حضرت تمثیل چار قل ہے

شہیدان کربلا اور اہل بیت سے بھی خاص محبت رکھتا تھا - اس نے کئی مرثیے لکھے ہیں چند اس کے دیوان میں بھی ہیں - اس کے دیوان کے حاشیے پر رضی، صالح اور فراقی کی غزلیں ہیں - فراقی کا ذکر ولی نے اپنے اشعار میں کیا ہے - اشرف نے رضی کا ذکر کیا ہے - اس کے دو شعر نقل کئے جاتے ہیں جن میں رضی کا ذکر ہے —

اس مصرع رضی کا اشرف ہے دل سوں بھو کا
بے غم ہمارے غم کوں کہاتا نہیں سبب کیا

یاد کر اشرف یو مصراع رضی مصحف گل کا سبق بابل پڑے

حمید نے رضی کو معاصرِ اشرف اور شاگردِ ولی بتایا ہے - رضی، ولی کا شاگرد ہو یا نہو لیکن معاصر اشرف تو ضرور تھا اور اس طرح فراقی اور صالح بھی اس کے ہم عصر تھے -

اشرف کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پختہ گو شاعر تھا - کلام کا عام رنگ بھی وہی ہے جو ولی کے کلام کا ہے - اپنے زمانے میں اس کو اچھی خاصی شہرت حاصل تھی - حمید نے لکھا ہے —

طبع رنگینے داشت - شعرش در نواح گجرات شہرت دارد و

دیوان لطیف تصنیف نمودہ " —

اشرف کے کلام کی ایک خصوصیت کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے جو ولی کے کلام میں بھی نمایاں ہے - ولی نے اپنے اشعار میں امرت لال، گوبند لال، محمد یار خاں، سید ابوالمعالی کے حسن و جمال کی بڑی تعریف کی ہے۔ اس طرح اشرف نے بھی عظمت اللہ، ظفر خاں اور سید معالی کے حسن کی تعریف کی ہے، سید معالی کی تعریف کا اوپر ذکر ہو چکا ہے - دو علحدہ غزلوں میں عظمت اللہ اور ظفر خاں کی تعریف لکھی ہے یہاں ایک ایک دو دو شعر نقل کیے جاتے ہیں —

عظمت اللہ بسکہ ہے پیارا　　جیو پس کا میں اس اُپر وارا

ظفر خاں گلشن ناز و ادا　　بلبل دل اس اُپر ہے مبتلا
گرچہ ہے افغاں پسر و نازنیں　　ہے ادا اس کی ادائے میرزا

انجمن کے نسخے سے اشرف کی چند غزلیں نقل کی جاتی ہیں جن سے اس کی شاعری کا انداز معلوم ہوگا۔ (چ)

✓ جب سجن مکھ اُپر نقاب کیا　　چشم عاشق کوں جوں سحاب کیا
جو پیا ہے پیا کے لب کی شراب　　نُقل خاطر جگر کباب کیا
آشنا اس کے بحر حسن ستی　　میں اپس دل کوں جیوں حباب کیا
تب سیں ہوں غرق بحر درد و الم　　جب سیں اس شوخ نے عتاب کیا
تجھ جدائی میں چشم اشرف سوں　　جوش دریاے خون ناب کیا

قد موزوں نے اس کے کام کیا　　سرو رعنا کوں پاے نام کیا

پاے تا سر ہے بسکہ صورت ناز کس ادا سوں دیکھو سلام کیا

ساغر مست چشم ساقی سوں نشاءِ عشق میں مدام کیا

خضر وقت اس کوں بولنا ہے بجا جس سوں امرت بچن کلام کیا

مشرق مکھہ پہ کھول زلفاں کوں صبح کے بیچ وقت شام کیا

نیم بسمل تھا تیغ ناز ستی نگہِ شوق نے تمام کیا

تب سوں ہے سرو باغ میں پابند جب سوں وو سرو قد خرام کیا

تجھہ جدائی میں خواب راحت کوں میں اپس کے اُپر حرام کیا

بسکہ اشرف اُپر ہے فضل خدا

صف عشاق میں امام کیا

اے ہوش ربا سندر مجھہ پاس تک آتے جا
رشتے کوں محبت کے بازو پہ بندھاتے جا

یوں دل ملنیں ہے خواہش تجھہ گھر کی طرف آؤں
تک ناؤں بتاتے جا یا ٹھاؤں بتاتے جا

دیدار ستی اپنے محروم نہ رکھہ مجکوں
انچل کوں اٹھا مکھہ سوں تک درس دیکھاتے جا

مغرور نکو ہو توں اس حسن پہ اے ناداں
یو سب ہے فنا آخر گن بی کماتے جا

لاگی ہے نظر جن کی اے رشک پری تجھہ کوں
دو بیم کے اچھر سوں ان پاس چھڑاتے جا

کر رام اِتا مجکوں مشتاق ہو آیا ہوں
تک رام کلی میانے یک تان سناتے جا

اے کانِ ادا سندر اشرف ہے ترا طالب
تک پیار ستی اس کوں چھاتی سوں لگاتے جا

عشق تیرے میں بسکہ ہوں بیتاب　　بیقراری ہے دل کوں جیوں سیماب

تجھ جدائی میں خواب آوے نہیں　　گر مہیا ہو بستر سنجاب

نکتۂ خال کوں وو بوجھیا ہے　　جس نے تجھ حسن کی دیکھیا ہے کتاب

تجھ جبیں پر عرق کی بوندیاں دیکھ　　شرم سوں گوہراں ہوے ہیں آب

حسن تیرے کی جھلجھلات کوں دیکھ　　پردۂ ابر میں چھپیا مہتاب

دیکھ تجھ حسن شعلہ خیز کوں شمع　　اشک سوں جل ہوی ہے گل گل آب

بیگ دی سوں خبر لے اشرف کی
تجھ پرت میں ہے بیخور و بے خواب

تجھ دہانِ کا العدم سوں غنچۂ گل ہے خجل

تجھ لب میگوں کی کیفیت انگے مل ہے خجل

عشق نے جب سوں مرے دل کے چمن میں گل کیا

بوستان عاشقی میں تب سوں بلبل ہے خجل

نغمۂ مطرب ہے از بس نشاء بخش اس بزم میں

شیشۂ خالی نمن آواز قلقل ہے خجل

نوخطاں کے حسن کے دریا سیں ہوں میں آشنا

موج خط عنبریں سوں ان کی کاکل ہے خجل

گل رخاں کے حسن سوں از بسکہ ہے رشک ارم

سر زمین ہند سوں کشمیر و کابل ہے خجل

پیچ و تاب زلف شبرنگ پری کوں دیکھ کر

دامن دشت پریشانی میں سنبل ہے خجل

گلشن اشعار اشرف بسکہ ہے رنگیں بہار

عندلیب طالب گلزار آمل ہے خجل

ہے تجھہ حسن کے وصف کا جب سوں بیاں مجھے
کہتے ہیں تب سوں لعل سخن درفشاں مجھے

لکھتا ہوں مو قلم سوں اپس ضعف کا بیاں
از بسکہ ہے تصورِ نازک میاں مجھے

رشک یمن کیا ہے دل اس رشک مہر نے
اپنے عقیق لب پہ دیکھا رنگِ پاں مجھے

اشرف ہوں درد عشق سوں ہمرنگ کہربا
کہتا ہے بسکہ کاہ تمن ناتواں مجھے

دیکھیا ہے جب سوں وو شہ ابرو کماں مجھے کہتا ہے اپنے تیرِ نگہ کا نشاں مجھے
جیوں برق جلوہ گر ہو گیا ہے سپند وار وو شہسوار تازی آتش عناں مجھے
عاشق کے حق منیں دیکھو کیا ناز شوخ ہے ماریا نگاہ تیز سوں دلبر سناں مجھے
آزاد دیکھہ زلف چلیپا کی موج (سوں) زنجیر بی کیا ہے سہی قامتاں مجھے
رکھتا ہوں آہ تیشۂ فرہاد کوہکن ہے جب سوں عشق خسرو شیریں زباں مجھے
دقت نپٹ ہے نت مرے نازک سخن منیں سر مشق فکر جب سوں ہے وو مومیاں مجھے
اس شمع رو کی جب سوں ہے اشرف مجھے لگن پروانہ ساں نہیں ہے کدھیں خوف جاں مجھے

تبصرے

ادب

تاریخ و سیر

متفرقات

اردو کے جدید رسالے

خاص نمبر

تبصرے

ادب

دریاے لطافت

مطبوعہ و شایع کردۂ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن - صفحات مع مقدمات وغیرہ سوا چار سو - کاغذ، طباعت وغیرہ عمدہ - قیمت مجلد تین روپے غیر مجلد دو روپے آٹھہ آنے

یہ اردو زبان کے نامور شاعر سید انشاالله خاں انشا کی تالیف ہے۔ جس میں اردو صرف و نحو، منطق، عروض و قافیہ اور معانی و بیان سے بحث کی گئی ہے - اس کے دو حصے ہیں - پہلے حصے میں صرف و نحو کا بیان ہے - یہ سید انشا کی تصنیف ہے - دوسرا حصہ جس میں منطق، عروض وغیرہ سے بحث کی گئی ہے مرزا قتیل کی تالیف ہے - پہلا حصہ کتاب کی جان ہے - اس میں اردو کے قواعد، محاورات اور روزمرہ پر نہایت تحقیق اور خاص اصول و ترتیب کے ساتھہ بحث کی ہے - اور تمام مسائل پر محققانہ اور ناقدانہ روشنی ڈالی ہے - سید انشا چونکہ ہندوستان کی

مختلف زبانوں سے بخوبی واقف تھے ' دھلی (جو اس زمانے میں فصاحت اردو کا گہوارہ تھی) کی شاعری کے خاص علم بردار تھے ' اور لکھنؤ کے جدید دور شاعری کے بنانے میں بھی شریک تھے اس لیے ان مقامات کی زبان کے فرق اور خصوصاً دھلی کے محلے محلے کی زبان کی خصوصیات سے بخوبی واقف تھے - انہوں نے ھر محلے ' طبقے اور پیشے کی زبان کی خصوصیات اور ان کے باھمی اختلافات کو بڑی باریک نظری سے دکھایا ھے - اس کے سوا ھندوستان کے مختلف صوبوں کی بولیوں سے بھی بحث کی ھے - اپنی تحقیق سے زبان کے ایسے قواعد منضبط کیے ھیں کہ وہ آج تک کم و بیش برقرار ھیں - کتاب کے وہ حصے خاص طور سے دلچسپ ھیں جن میں سید انشا نے کسی خاص محلے ' طبقے ' پیشے یا صوبے کے محاورہ یا روز مرہ کو فصیح یا غیر فصیح یا کسی قاعدہ کو صحیح یا غیر صحیح اور مستند یا غیر مستند قرار دیا ھے - ایسی اکثر باتیں وہ اپنے ذوق کی بنا پر لکھہ گئے ھیں - بے شبہ ان میں سے اکثر آج تک وھی مروج ھیں اور تسلیم کیے جاتے ھیں جن کے حق میں انشا نے اپنے ذوق کی بنا پر فیصلہ کیا تھا ' لیکن بعض محاورے ' الفاظ اور قاعدے ایسے بھی ھیں جو سید انشا کی نظر میں غلط ' غیر فصیح یا غیر مستند تھے لیکن آج وہ صحیح ' اور فصیح اور مستند ھوگئے ھیں - یہ چیزیں لسانیات کے طالب کے لیے خاص دلچسپی کا باعث ھیں - اسی طرح انشا نے بعض اساتذہ پر تنقید کی ھے - ایک اعتراض مرزا سودا پر یہ کیا ھے کہ وہ " لپک ' جھپک والے قصیدے میں کٹک بمعنی لشکر محض قافیے کی ضرورت سے استعمال کر گئے ھیں ..... - کٹک ھرگز اردو کا لفظ نہیں " - اس کے ثبوت میں ایک تو سکندر کا مارواڑی زبان کا مرثیہ پیش کیا ھے اور دوسری سند بخت سنگھہ مارواڑی کی نثر سے پیش کی ھے - انشا نے یہ

عجیب بات لکھی ھے - کتک سنسکرت زبان کا لفظ ھے اور ھندوستان کے مختلف صوبوں کی بولیوں میں وھیں سے آیا ھے - قدیم اردو شاعروں نے بھی اس لفظ کو استعمال کیا ھے چنانچہ سودا اور سکندر سے تقریباً ایک سو سال قبل نصرتی نے بھی اس لفظ کا استعمال کیا ھے - اس کے سوا قدیم اردو لغت کی کتابوں میں بھی یہ لفظ پایا جاتا ھے - ایسی صورت میں اس کو خالص مارواڑی زبان کا لفظ کہنا صحیح نہیں —

دریاے لطافت میں کئی ایسی باتیں موجود ھیں جن پر بحث مباحثہ اور گفتگو کی ضرورت ھے - زبان و ادب کے طالبوں کے لیے یہ بہت بڑا سرمایہ ھے ان کو ضرور اس کا مطالعہ کرنا چاھیے - اس سے زبان و ادب کے عجیب و غریب نکات ھاتھہ آتے ھیں —

یہ کتاب ۱۸۰۸ ع میں لکھی گئی تھی جب کہ جدید مغربی علم ادب کی پرچھائیں ھماری ادبیات پر نہیں پڑی تھیں اور ھمارے شاعروں اور ادیبوں کو مغربی خیالات اور تحقیق و تنقید کی ھوا تک نہیں لگی تھی لیکن سید انشا کی سلامت ذوق اور باریک نظری کی داد دینی پڑتی ھے کہ انھوں نے تحقیق و تنقید کا وہ راستہ اختیار کیا کہ ان کے پیدا کیے ھوے مباحث اور طریق تحقیق میں وھی تازگی اور جدت برقرار ھے —

لیکن عجیب بات ھے کہ اس قدر اھم کتاب قدردانی اور مقبولیت سے محروم رھی - اس کے دو سبب معلوم ھوتے ھیں ایک تو یہ کہ ھمارا ذوق ادب اتنا ترقی یافتہ نہ تھا - دوسرا یہ کہ یہ کتاب بلحاظ مطالعہ سہولت بخش نہ تھی - اس میں بعض جدتیں ایسی تھیں کہ ان سے لطف و آسانی کی بجاے الجھن اور دشواری پیش آتی تھی - مثلاً انھوں نے اپنے ولی نعمت نواب سعادت علی خاں کے اوصاف کی رعایت سے حروف کے

نام بھی عجیب غریب رکھے تھے - الف کو وہ اقبال اور "ب" کو بخشش لکھتے تھے و علیٰ ھذا - الف بے کی سادگی کے مقابلے میں اقبال، بخشش وغیرہ ظاہر ہے کہ کس قدر دشواریاں پیدا کرتے ہوں گے اور قاری کو الجھن میں ڈال دیتے ہوں گے --

مولوی عبدالحق صاحب مدظلہ نے ۱۹۱۶ع میں اس کے غیر ضروری اجزا کو حذف کرکے اور طولانی، غیر واضح اور دقت طلب عنوانات وغیرہ کو بدل کر مرتب کیا تھا اور انجمن ترقی اردو کی طرف سے شایع کیا تھا - یہ سہولت بہم پہنچانے کے بعد بھی اس کی خاطر خواہ قدر نہیں ہوئی غالباً اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ کتاب فارسی زبان میں ہے جس سے ہر شخص بآسانی مستفید نہیں ہوسکتا - اس کے افادے کو عام کرنے کی غرض سے انجمن نے اس کا ترجمہ کرایا ہے - ترجمہ اردو زبان کے نامور اور مستند ادیب و شاعر پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی نے فرمایا ہے - ترجمہ نہایت سلیس، پاکیزہ اور صحیح ہے - لایق مترجم نے جگہ جگہ حواشی بھی درج کیے ہیں اور متن کتاب میں بھی توضیحی عبارتیں داخل کی ہیں جن کو مصنف کی عبارت سے ممیز کرنے کے لیے قوسین میں درج کیا گیا ہے - کتاب کے شروع میں ایک بہت تفصیلی فہرست ہے جو انڈکس کا حکم رکھتی ہے - اس کی مدد سے کتاب کے تمام مطالب و مضامین کا حال بہت جلد معلوم ہوجاتا ہے اور ہر چیز آسانی سے مل جاتی ہے - انجمن نے یہ اڈیشن شایع کرکے سید انشا کی عالمانہ تحقیقات کو ہر اردو داں کے لیے عام کردیا ہے --

(چ)

نکات الشعرا

تالیف میر تقی میر مطبوعہ و شایع کردۂ انجمن ترقیء اردو اورنگ آباد دکن - صفحات علاوہ مقدمہ و اشاریہ ۱۸۰ - کاغذ طباعت وغیرہ عمدہ اور دیدہ زیب - قیمت مجلد ۲ روپے چار آنے غیر مجلد ایک روپیہ بارہ آنے —

جو لوگ اردو زبان کی تاریخ سے دلچسپی رکھتے ہیں وہ میر کے تذکرہ نکات الشعرا کی اہمیت کو بخوبی جانتے ہیں - یہ اردو شاعروں کے اولین تذکروں میں ہے اور چونکہ ایک مشہور ' مستند اور بلند پایہ استاد کا لکھا ہوا ہے اس لیے خاص اہمیت وحیثیت رکھتا ہے - اس میں ایک سو چار شاعروں کا تذکرہ ہے - گو یہ مختصر ہے لیکن اس میں بہت سی کام کی اور مفید باتیں ملتی ہیں اور ایسے تاریخی اشارے اور ادبی نکات ملتے ہیں جو دوسری جگہ نہیں مل سکتے - میر صاحب نے بڑی تحقیق سے لکھا ہے اور شعرا کا معیاری کلام انتخاب کیا ہے اور جگہ جگہ بڑی استادانہ تنقیدیں کی ہیں - یہ تذکرہ عمدہ اشعار کا انتخاب بھی ہے جس سے عام ناظرین لطف اندوز اور میر کے ذوق سے آشنا ہو سکتے ہیں ' اور شاعروں کے حالات کا مجموعہ بھی ' جس سے تاریخ ادب کے شائقین مستفید ہو سکتے ہیں - اور چونکہ اس میں میر نے بڑی آزادی اور بے باکی سے شاعروں کے کلام پر تنقید اور راے زنی کی ہے اس لیے یہ تنقید کا بھی عمدہ نمونہ ہے —

اس تذکرے میں اکثر ان شاعروں کا حال ہے جن سے مصنف ذاتی ملاقات اور واقفیت رکھتا تھا ' اس لیے اس میں اکثر مستند اور محققانہ

چیزیں ملتی ہیں - مصنف نے شمالی ہند کے شاعروں کے ساتھ دکنی اور گجراتی شاعروں کو بھی لیا ہے - اس باب میں مصنف نے عزلت کی بیاض سے استفادہ کیا ہے - کہیں کہیں دکنی شاعروں کے حالات اور اسما وغیرہ میں فرو گزاشتیں نظر آتی ہیں، ان کی تصحیح حواشی میں کر دی گئی ہے، جس سے تذکرہ کا پایۂ استناد زیادہ بلند ہو گیا ہے —

اس سے قبل انجمن ترقیء اردو نے اس تذکرے کو شایع کیا تھا لیکن پہلے اڈیشن میں متعدد غلطیاں رہ گئی تھیں - یہ اڈیشن خاص اہتمام اور صحت کے ساتھ طبع کیا گیا ہے - شروع میں مولوی عبدالحق صاحب مدظلہ کا مقدمہ بھی ہے جو پہلے اڈیشن میں نہ تھا اور آخر میں ایک اشاریہ (انڈکس) ہے جو ہر طرح سہولت بخش ہے —

(چ)

دیوان تاباں

مطبوعہ و شایع کردۂ انجمن ترقیء اردو اورنگ آباد دکن - کاغذ، طباعت وغیرہ عمدہ - صفحات ۲۸۰ - قیمت مجلد ۲ روپے چار آنے غیر مجلد ایک روپیہ ۱۲ آنے —

میر عبدالحی تاباں دہلوی محمد شاہی عہد کے شاعر ہیں - یہ وہ زمانہ ہے جس میں ایہام گوی کا زور تھا، لیکن اس کے آخر زمانہ میں ایہام گوی کے خلاف بعض شاعروں نے تحریک شروع کر دی تھی اور شاعری میں سادگی اور اس کی زبان میں اعتدال و توازن پیدا کیا جا رہا تھا - تاباں کا کلام اس دور اصلاح کی پیداوار ہے - تاباں کا انتقال ۱۱۶۱ھ اور ۱۱۶۵ھ کے درمیان ہوا ہے گویا محمد شاہی عہد کے اثرات ابھی پورے طور پر زایل نہیں ہوے تھے - یہ پورا دیوان اسی عہد کے اخیر حصے میں تصنیف

ہوا ہے، اس لحاظ سے اس کی زبان کی صفائی، سادگی اور سلاست لایق داد ہے - تاباں کے کلام میں تخیل کی بلند پروازی نہیں ہے - اس کی شاعری عام عاشقانہ مضامین اور بقول مہر "گل و بلبل" کی داستان تک محدود ہے - لیکن زبان و بیان کی خوبی اور لطافت کے اعتبار سے دلچسپ اور پڑھنے کے قابل ہے - مہر نے اپنے زمانے کی شاعرانہ زبان کا لحاظ کرتے ہوے اس کے متعلق بہت صحیح راے دی ہے —

"زبان رنگینش پاکیزہ تر از برگ گل، گلستان سخن را نازک دماغ بلبل، سمند رنگینیء فکرش با گلگون باد بہار طابق النعل بالنعل است - ہر چند عرصۂ سخن او در لفظ ہاے گل و بلبل تمام است، اما بسیار برنگین می گفت" —

(چ)

حامد کے سو شعر

حامد علی خاں بی - اے - جائنٹ اڈیٹر رسالۂ ہمایوں زیادہ تعارف کے محتاج نہیں - ان کا کلام اور ان کے مضامین ہمایوں اور دوسرے رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں - ان کے سو شعر کا انتخاب ادبی دنیا کے مدیر منصور احمد صاحب نے کیا ہے اور شروع میں دس صفحوں کا دیباچہ لکھا ہے جس میں شاعر کی خصوصیات شاعری سے بحث کی ہے - انتخاب اچھا ہے اور پڑھنے کے قابل ہے - کتابت عمدہ، طباعت رنگین ہے اور کاغذ بھی اچھا ہے، تقطیع بھی عام سو شعری انتخاب سے کسی قدر بڑی ہے - قیمت چھ آنے - ملنے کا پتا : - دفتر ہمایوں، ۲۲ - لارنس روڈ - لاہور -

(چ)

حضرت احمق کے سواسو شعر

مرتبۂ مرزا ابراہیم بیگ صاحب اڈیٹر سرگزشت علی گڑہ

کچھہ دنوں سو شعری انتخابات کی گرم بازاری رہی۔ اب سوا سو کا آغاز ہوگیا ہے ' مشہور کہاوت ہے سیر کو سوا سیر۔ انتخاب کی یہ جدت مرتب نے شاعر کے تخلص اور اس کے رنگ شاعری کے اعتبار سے بہت خوب کی ہے۔ اکبر کے بعد ظرافت نگاری میں کئی شاعروں نے زور مارا لیکن اس کو اب تک کوئی نہیں پہنچا۔ حضرت احمق بھی ان ظرافت نگار شاعروں میں ہیں جو اکبر کے رنگ میں کہتے ہیں۔ ان کا کلام اکثر رسائل و اخبارات میں شایع ہوتا رہا ہے اس لیے وہ کسی تعارف یا تقریب کے محتاج نہیں ہیں۔ اس مجموعہ میں وہ اشعار نہیں ہیں جن میں سیاسیات پر سختی سے حملے کیے گئے ہیں۔ مرتب نے شروع میں ایک مختصر دیباچہ لکھا ہے جس میں حضرت احمق کے حالات اور "احمقیات" کا ذکر ہے۔

(چ)

---

(۱) صہبائے ولا۔ (۲) جوش ولا۔

مصنفۂ شاہ ابوالحسن محمد مظفر حیدری۔ چھوٹی تقطیع ' صفحات و قیمت علی الترتیب ۱۶ ' ۲۸ - ڈیڑہ آنہ ' تین آنے۔ مصنف کے پتے : سی - اے - وی - ہائی سکول الہ آباد سے مل سکتی ہے۔

صہبائے ولا میں وہ چند نظمیں ہیں جو نعت وغیرہ میں مصنف نے اثنائے سفر حج میں لکھی ہیں۔ جوش ولا دراصل ایک نعتیہ نظم ہے جو عید میلاد النبی کی ایک محفل میں پڑھی گئی تھی۔ مصنف کو نعت گوئی

میں اچھا خاصا ملکہ ہے - جو لوگ نعتیہ کلام سے ذوق رکھتے ہیں - ان کے لیے یہ دو کتابچے خالی از دلچسپی نہ ہوں گے —

(چ)

اتالیق الصبیان

مصنفہ ڈاکٹر احمد شاہ صاحب - صفحات ۱۷۳ - قیمت ایک روپیہ چھہ آنے علاوہ محصول ڈاک - مصنف کے پتے' نور منزل' ڈاک خانہ راج پور' دھرہ دوں سے مل سکتی ہے -

یہ نظموں کا مجموعہ ہے جس کے متعلق مصنف نے لکھا ہے کہ "۴۲ سالہ خدمت سے سبک دوش ہونے کے بعد ہمالہ کے پہاڑوں میں آخری دن بسر کرنے کا ارادہ کیا اور قریب ساڑھے چار سال سے یہاں مقیم ہوں - کچھہ عرصہ یہاں رہنے کے بعد اکثر خیال ہوا کہ وقت گزارنے کے لیے کوئی دلچسپ مشغلہ ضرور ہونا چاهیے اور مشغلہ ایسا ہو جو دلچسپ تو ضرور ہو مگر کچھہ مفید بھی ثابت ہو" - چنانچہ یہ مجموعہ اس دلچسپ مشغلے کی پیداوار ہے - جس کے لکھنے کا مدعا یہ ہے کہ بچوں کو هندوستان کی مختلف چیزوں سے با خبر کیا جاے - اس میں تقریباً سوا پانسو نظمیں ہیں جن کو پانچ مختلف عنوانات کے تحت درج کیا گیا ہے - (۱) حیوانات' اس میں ۷۵ جانوروں کا ذکر ہے - (۲) مصنوعات' ان کی تعداد ایک سو ایک ہے - (۳) نباتات' ۱۷۶ - (۴) پیشہ ور ۱۶۳ - (۵) متفرق ۸ —

ہمارے ملک کے نہ صرف بچے بلکہ جوان اور بوڑھے تک مختلف جانوروں' پرندوں' پودوں اور پھولوں وغیرہ کے ناموں سے نا واقف ہوتے ہیں' اور ان کی خصوصیات اور خاص خاص حالات سے بے خبر - ہماری

زبان میں کوئی ایسی جامع کتاب نہیں ہے جو خاص ہندوستانی چیزوں پر لکھی گئی ہو۔ ڈاکٹر احمد شاہ صاحب کو یہ خیال بہت خوب پیدا ہوا۔ لیکن انھوں نے جو راستہ اختیار کیا ہے وہ ہمارے خیال میں صحیح نہیں ایسی چیزوں کا بیان خواہ کتنی ہی دلآویز اور دلچسپ نظم میں کیوں نہ ہو زیادہ مفید نہیں ہوسکتا۔ نظم کی پابندیاں وضاحت و تشریح چاہتی ہیں۔ ایسی حالت میں بچوں کے لیے اکثر ان چیزوں کو جو ان کی نظروں سے نہیں گزری ہیں نظم میں بیان کرنا ناقابل فہم نہیں تو سریع الفہم بھی نہیں۔ اگر اس میں تصاویر ہوتیں تو بھی آسانی ہوتی۔ موجودہ صورت میں اس سے صرف لفظی تعریفیں معلوم ہوسکتی ہیں، لیکن اشیا وغیرہ کی اصل حقیقت سے واقفیت پیدا نہیں ہوسکتی۔

(چ)

مرقع سخن حصہ اول و دوم

مصنفہ ڈاکٹر مبارک حسین مبارک عظیم آبادی۔ صفحات و قیمت علی الترتیب ۸۴، ۲۰۰، آٹھ آنے، بارہ آنے۔ مصنف کے پتے، پٹنہ سٹی ڈاک خانہ بیگم پور محلہ چوراہا آغا حسینا سے مل سکتی ہے۔

ان دونوں حصوں میں مصنف نے اپنی طبع زاد نظمیں جمع کی ہیں۔ پہلے حصے میں ۴۰ نظمیں ہیں اور دوسرے حصے میں ۸۸۔ ان کے موضوعات مختلف و متنوع ہیں، لیکن زیادہ تر صوبۂ بہار سے متعلق ہیں، ان میں بھی بیشتر ایسی ہیں جو خاص خاص تقریبوں سے لکھی گئی ہیں۔ مثلاً کسی کے صاحبزادے کی تسمیہ خوانی، تعمیر مکان، کسی خاص غرض کے

لیے چندہ ' کسی کے اضافۂ تنخواہ کی التجا ' دوستوں یا ذی اثر لوگوں کی اونچے عہدوں پر ترقیاں ' کسی طالب علم کا امتیاز سے امتحان پاس کرنا ' کسی مسجد کی ترمیم کے لیے عرض داشت اور چندے کی اپیل ' ٹی پارٹی ' وداعی جلسہ ' شادی اور دعوتوں کے رقعے ' مبارکبادیں ' تہنیتیں ' کلب کے فوٹو وغیرہ وغیرہ —

مصنف کی غرض ان مجموعوں سے یہ ہے کہ طلبا کے نصاب میں شریک کیے جائیں ' پہلے حصے کو وہ ہائی اسکول کی آٹھویں اور نویں جماعتوں کے لیے موزوں بتاتے ہیں ' اور دوسرے حصے کو دسویں (میٹریکولیشن) کے لیے - مصنف ایک مشاق اور دیرینہ سال شاعر ہیں ان کا بیان ہے کہ

" راقم ۴۵ سال سے اردو کی بقا کے لیے اپنی ہستی کو فنا کر رہا ہے — مجنوں بنا ہوا ہے جو یہ سر سے پاؤں تک لیلیٰ کی شکل کھینچ رہا ہے قلم میرا "

اس دیرینہ تجربے کے مقابلے میں مجال لب کشائی نہیں ' تاہم باادب یہ کہنے کی جسارت کی جاتی ہے کہ یہ مجموعے طلبا کی نصابی ضرورتوں کو شاید ہی پورا کریں - نظم کے موضوعات بہت وسیع ہیں جن سے طلبا کو اپنی تعلیم کی ابتدائی منزل پر باخبر ہونا لازم ہے - اس نصابی مسئلے کا حل اب تک صرف یہی سمجھا جاتا ہے کہ مختلف اساتذہ کے کلام کا انتخاب کیا جاے اور اس طرح طلبا کو ہر استاد کے رنگ سے واقف کرایا جاے - اس سے طلبا میں بصیرت پیدا ہوتی ہے اور وہ نظم کو سمجھنے اور اس کی اصلی روح سے آشنا ہونے کی صلاحیت پیدا کر لیتے ہیں - کسی ایک شاعر کا کلام پڑھانے سے یہ مقصد پورا نہیں ہوسکتا —

(چ)

سلسبیل

مجموعۂ کلام جناب آل احمد صدیقی سرور ایم - اے (علیگ)
سلسلۂ مطبوعات انجمن اردوے معلیٰ نمبر ا کاغذ معمولی -
کتابت و طباعت اچھی - صفحات ۱۱۲ - قیمت ایک روپیہ -
ملنے کا پتا - درج نہیں —

کسی قوم کے انحطاط کا اندازہ لگانے کے لیے ایک یہی مشاہدہ کافی ہے کہ اس کے افراد میں شعر خوانی اور شعر گوئی میں تمیز باقی نہیں رہتی' یعنی ہر شعر خواں شعر گوئی کی طرف مائل ہوجاتا ہے - یہ رجحان ایک خاص قسم کی ذہنیت کا پتا دیتا ہے - جہاں ہمارے ملک میں ضبط اولاد اور ضبط نفس کی تحریکیں شروع ہوچکی ہیں کاش شعر و ادب میں بھی کسی قسم کا ضابطہ نافذ ہو سکے اور گم کردہ راہ شاعر نما حضرات اپنے اصلی رستوں کو پہچان جائیں -

'نژاد نو' کا ہر شاعر اپنا مجموعہ اس شان کے ساتھہ مرتب کرتا ہے کہ ورق الٹتے ہی اس کی تصویر پر نظر پڑے پھر ایک مرعوب کن مقدمہ اور 'ہدیۂ محبت' ہو - چنانچہ یہ صفحات بھی ان صفات سے خالی نہیں ہیں - بقول سرور صاحب ان کا " تخیل کشمیر کی بہاروں میں جوان ہوا ہے " - لہذا یہ ہدیہ بھی انہیں بہاروں کے نام ہے - ان نظموں اور غزلوں کو پڑھنے کے بعد ہمیں افسوس کے ساتھہ کہنا پڑا 'اے وائے بہارے اگر این صست بہارے !' نظموں کے علاوہ جن میں سے بیشتر مناظر کشمیر سے متاثر ہو کر لکھی گئیں مولانا محمد علی مرحوم کا ایک مرثیہ اور کئی غزلیں بھی اس مجموعے میں شامل ہیں —

شروع میں رشید احمد صاحب صدیقی نے اپنے مخصوص انداز میں ایک تعارف تحریر فرمایا ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ " سرور صاحب

اپنے کار ناموں کے اعتبار سے فسانۂ عجائب سے کم نہیں ہیں" - ہمارا
خیال ہے کہ خواجہ حسن نظامی اور رشید احمد صاحب صدیقی اگر ایک
دوسرے کو اپنی تحریریں دکھا لیا کریں تو وہ زیادہ دلچسپ اور شگفتہ
ہو جائیں - خواجہ صاحب کا پیرایہ اتنا یک رنگ و ہموار ہے کہ اسے
رشید صاحب کا پیچ و خم کسی نہ کسی قدر ملنا چاہیے - اور رشید
صاحب کے تحریری بھول بھلیاں میں خواجہ صاحب کی سادگی ایک نئی
بات پیدا کر دے گی —

مصورانہ شاعری کے بھی خارجی اور داخلی پہلو ہوتے ہیں - یا تو
شاعر کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ الفاظ کی گل کاریوں سے چمن بندی کر دے'
پہاڑ کی بلندیوں کو آسمان سے ٹکرا دے' اور دریاؤں میں ایسے بھنور
ڈال دے کہ ناظر سکتے میں آجائے اور سمجھ نہ سکے کہ یہ نظارہ
خواب میں دیکھا تھا یا بیداری میں - یا پھر شاعر ان مناظر سے اثر
پزیر ہو کر اپنے محسوسات کو یوں بیان کرے کہ سننے والے پر وہی کیفیت
طاری ہو اور وہ ان تماشوں کو دیکھنے کے لیے بے تاب ہو جائے -
جوش ملیح آبادی اور حفیظ جالندھری کے کلام میں خارجی منظر کشی
کے عمدہ نمونے ملیں گے - لیکن پیش نظر نظموں میں شاعر نے اپنے کو
اُجاگر رکھنے کی اتنی کوشش کی ہے کہ تصویر کہیں نہیں رہی' صرف
مصور رہ گیا اور اس کے جذبات میں وہی فرسودہ رومانی کیفیت ہے
جو ہمارے اکثر رومانی نظم نگاروں کا طرۂ امتیاز ہے - ان کی جوانی
پیٹھ پر کتابوں کا پشتارہ لادے ہوے عینک کے وسیلے سے حسن و عشق کی
رنگینیوں کا جائزہ لے رہی ہے - سرور صاحب اپنے ہم عصروں کی طرح اس
جوانی کے احساسات کو خوبصورت الفاظ کے پردوں میں بھی چھپا نہ

سکے - اجنبی ترکیبیں اور ناموزوں بندشیں جابجا نظر آتی ہیں —

" مرے دل میں بھی لہریں سی کئی بے ساختہ اُٹھیں" - (صفحہ ۲۷)

لہروں کی بے ساختگی یعنی چہ؟

حباب احمریں کی شوخیاں فرش زمرد پر

مرا وہ راز جو یوں برملا افشا نظر آیا (صفحہ ۲۸)

دونوں ہی مصرعے زبان حال سے کہہ رہے ہیں کہ انہیں ایک دوسرے سے دور کا بھی لگاؤ نہیں ہے —

عروس شعر نے پردہ اُٹھایا روے روشن سے

بڑھے اہل نظر ساغر بکف شاخ نشیمن سے (صفحہ ۴۱)

گویا شاخ نشیمن پر پنچھیوں کی طرح اہل نظر اس تاک میں بیٹھے رہتے ہیں کہ شاعری کی دیوی بے نقاب ہو اور یہ اس کی طرف پر پھیلائیں —

" یا میرے ذوق نظر کی آخری پرواز ہے" - (صفحہ ۴۷) نظر کی پرواز بھی ذوق نظر کی پرواز اور وہ بھی آخری پرواز! سمند ناز پر یہ تازیانہ!

" مگر لبوں پہ بھی ایک دعا نظر آئے" - (صفحہ ۵۹)

دعا نظر بھی آسکتی ہے یہ ہمیں آج معلوم ہوا -

نظموں میں صرف ایک پرواز خیال اچھی ہے اور اس میں بھی اس اس قسم کے مصرعوں کی فراوانی ہے " تمام دیدۂ حیرت بنا ہوا ہوں میں -"

غزلوں پر اصغر گونڈوی کا اثر صاف نمایاں ہے اور کہیں کہیں جگر مرادآبادی کی پیروی کی کوشش بھی کی گئی ہے - ان دونوں کی غزلوں پر طبع آزمائی بھی کی گئی ہے اور نتیجہ جس صورت میں

برآمد ہوا وہ ملاحظ ہو :

" تارے ' اچالتے ' ہوں میری گرد راہ کو " (صفحہ ۸۲)

" وہ روشنی ہو رہی ہے دل میں کہ ' محفلیں جگمگا رہا ہوں " (صفحہ ۸۷)

" سرور بزم کو اتنا ' چھکا ' نہ دوں تو سہی ' (صفحہ ۱۰۱)

" ہزاروں لولوے لالہ لیے بیٹھا ' ہوں محفل میں - " " خرام موج سے لولوے تہہ نشیں بہتر - "

غرض غزلوں سے نظمیں پھر بھی غنیمت ہیں کہ ان گھڑ اور بے جوڑ ترکیبوں کے لیے ان میں کسی نہ کسی طرح گنجائش نکل ہی آتی ہے -

غزلوں میں وہی چوچلے ملیں گے جنہیں رشید صاحب نے اپنے دیباچے میں " شورہ پشت " شاعروں کے لیے مخصوص کہا ہے - ان کے عشق کی داستان ان ابواب میں تقسیم کی جاسکتی ہے -

پہلا سین : " ہزاروں لولوئے لالا لیے بیٹھا ہوں سینوں میں " - (صفحہ ۸۱)

دوسرا سین : " زیر و زبر ہے قافلہ صبر و قرار کا " - (صفحہ ۹۴)

تیسرا سین : " پیشانیوں پہ نور حرم لے کے آئے ہیں " - (صفحہ ۳۰)

چوتھا سین : " اور بڑھتا جا رہا ہے بار سر کو کیا کروں " - (صفحہ ۱۰۹)

ڈراپ سین : " حضور حسن میں دل باریاب ہو نہ سکا " - (صفحہ ۸۷)

یہ مختصر سی روداد ہے ہماری ' شورہ پشت شاعری ' کی ' جس کا نمونہ یہ مجموعہ ہے —

(نا خدا)

خمستان

اثر صہبائی کے کلام کا مجموعہ

صفحات مع مقدمہ وغیرہ - تقریباً ۳۰۰ - کاغذ کتابت و طباعت اچھی -

قیمت ۲ روپیہ ۸ آنہ ملنے کا پتا - آزاد بک ڈپو، سیالکوٹ، پنجاب -

جناب اثر صہبائی پنجاب کے مقبول اور ممتاز نوجوان شاعر ہیں - خمستان ان کے کلام کا دوسرا مجموعہ ہے - اس میں غزلوں اور رباعیوں کے علاوہ نظمیں اور قطعات بھی ہیں —

مجموعے کے آغاز میں " دنیائے ادب کے مایۂ ناز ادیب " (بقول مصنف) سید سلیمان صاحب ندوی نے جرعۂ مئے کے عنوان سے ایک مقدمہ تحریر فرمایا ہے اور پنڈت کیفی صاحب نے بھی اس سنت کی پابندی کی ہے - سید صاحب نے اس مقدمے میں ایک بڑی دلچسپ بحث یہ کی ہے کہ اہل حدیث حضرات شاعر ہوتے ہیں یا نہیں —

مجموعے کا پہلا باب ' تجلیات ' غزلوں پر مشتمل ہے اور غالباً سب سے زیادہ طویل ہے - غزل گوئی کی صنف نہایت نازک اور مشکل ہے اور یوں صنفی اعتبار سے کوئی اس پر عبور حاصل بھی کرلے لیکن خود فراموشی کا وہ جذبہ کم کو میسر ہوتا ہے جو عشقیہ شاعری کی جان ہے اور جس کے بغیر غزل بالکل روکھی پھیکی رہ جاتی ہے - ہمارا خیال ہے کہ اثر صاحب کی طبیعت حکمت اور فکر کی طرف زیادہ مائل ہے اور ان میں ایک خاص قسم کا ضبط ہے - اس لیے اسی صنف میں انہیں جولانی طبع کا زیادہ موقع ملے.گا جو اس قسم کے رجحان کے لیے موزوں ہو - غزل جس قسم کی صناعی اور خود فراموشی کی طالب ہے وہ اثر صاحب کو ودیعت نہیں ہوئی - چنانچہ غزلوں میں فی الجملہ بہت کم ایسی ہیں اور ان میں بھی ایسے اشعار کم ہیں جو دل میں اتر جائیں - ایک طرف ایسی غزل موجود ہے :—

دنیا میں ہزاروں خوشیاں ہیں ، یہ دنیا عشرت خانہ ہے

اس بزم میں لیکن میرا بھی ایک درد بھرا افسانہ ہے

برگشتہ قسمت والوں کا نے کعبہ نے بتخانہ ھے
ھاں دو ھی سہارے ھیں ان کے - یا موت ھے یا پیمانہ ھے
ھر شاخ جب ایک مستانہ ھے ھر پھول جب ایک پیمانہ ھے
توبہ! ایسے میں توبہ ؟ جب فطرت خود میخانہ ھے
کچھہ فرق نہیں ھم مستوں کے کاشانے اور میخانے میں
کاشانہ ھی میخانہ ھے میخانہ ھی کاشانہ ھے

اثر صاحب کی بہترین غزلوں میں سے یہ ایک ھے پھر بھی مقدمہ نگار کو بصد تکلف اس کے ھر شعر پر اصلاح دینے کی ضرورت محسوس ھوئی - کہیں کہیں " بخت واژوں " (صفحہ ۱۴) جیسی عجیب ترکیبیں ملیں گی جو الفاظ کے ترنم کے ساتھہ بگل کی آواز کا کام کرتی ھیں - اس میں شک نہیں کہ بسااوقات ایسے شعر بھی نکل آتے ھیں کہ سخن شناس سوچتے رہ جائیں کہ شاعر کیا کہہ گیا :

جستجوے منزل میں بے قرار و آوارہ
میں بھی ایک منظر ھوں موجہاے دریا کا
رھرو محبت کے ھر قدم پہ منزل تھی
حسن کا تھا آینہ ذرہ ذرہ صحرا کا

زندگی سوز ھے کہ تادم زیست　　ختم پر آہ آتشیں نہ ھوئی
آستانے نگاہ سے گزرے　　مایل بندگی جبیں نہ ھوئی

کچھہ شغل زندگی کے لیے بھی تو چاھیے
تقدیر سے اگر نہ لڑے کیا کرے کوئی

لیکن ایسے اشعار خال خال ھی ھیں —

دوسرا باب بعنوان 'سمن زار' نظموں پر مشتمل ھے اور یہاں شاعر

کو اپنے اس نظریۂ شباب کے پھیلانے کا خوب موقع ملا ہے جس کی تشریح وہ پہلے کر چکا ہے :

کیف آفریں ہے یاد جوانی رسوائی و رندی و بت پرستی

چنانچہ یہاں شیب و شباب کی رنگینیاں ابلی پڑتی ہیں - غزلوں سے کہیں اچھی ہیں ، خصوصاً بہاریہ اور "محبت اور موت" خوب ہیں -

'جام صہبائی' رباعیات کے لیے وقف ہے اور یہ اثر صاحب کا خاص میدان ہے - شاید یہ مبالغہ نہیں کہ جگت موہن لال رواں آں جہانی کے بعد امجد حیدر آبادی اور اثر صہبائی اس اقلیم سخن کے آلہا اودل ہیں -

ہماری شاعری کی بدنصیبی ہے کہ اس کا رکن اول نوحہ خوانی قرار پاگیا ہے اور ولی دکنی سے لے کر دور حاضر تک کے جس شاعر کو دیکھیے چرخ کج رفتار کو بددعائیں دیتا اور دامن و گریباں کے درپے ہوکر اپنے افلاس میں زیادتی کرنے پر تلا رہتا ہے - وجہ یہ ہے کہ ہماری سوسائیٹی میں انسان کی تمنائیں قدم قدم پر پامال ہوتی ہیں اور ان کی تکمیل کا موقع بہت کم ملتا ہے - خصوصاً اب حالات ایسے ہوگئے ہیں کہ ہمارے نوجوان زیادہ حساس ہوتے جاتے ہیں کیونکہ ان کے ارادوں کی تکمیل کے تمام راستے بند ہیں اور اس کا رد عمل لامحالہ حزنیت کی صورت میں ہوگا - اثر صاحب جس اندوہ و ملال کی تلچھٹ پی رہے ہیں وہ فطری نہیں بلکہ ماحولی ہے - امید ہے کہ وہ بہت جلد اس مہلک مرض کو اپنے دامن سے جھٹک دینگے اور اس کا آئندہ مجموعہ نوحۂ غم نہیں بلکہ پیام عمل ہوگا —

کچھ رباعیات درج کی جاتی ہیں جو اثر صاحب کے مخصوص رنگ میں ہیں اور حق یہ ہے کہ خوب ہیں -

صحرائے جہاں میں ایک فریاد ہوں میں ظلمات فلک میں برق آباد ہوں میں
جویائے سکون جاوداں ہوں یعنی ناشاد ہوں بیتاب ہوں برباد ہوں میں



جو لطف ہے جستجو میں حاصل میں نہیں لذت جو تگ و دو میں ہے منزل میں نہیں
وہ منظر زندگی کہ امواج میں ہے کشتی میں نہیں، سکوت ساحل میں نہیں



تاراج خزاں ہوں اور رقصاں ہوں میں گلہائے بہار میں پریشاں ہوں میں
لذات و علم بھی ایک معمہ ہیں اثر خوش رنج میں اور خوشی میں گریاں ہوں میں



ہو جائے عیاں جو مجھ پہ ہستی میری پھر کوئی سنے صدائے مستی میری
معبود ہوں آپ ہی عبادت کس کی؟ ہے بے خبری خدا پرستی میری

خوب کہا —

بہ ایں ہمہ، شاعر کہیں کہیں جذبات کے تلاطم میں بہہ جاتا اور ایسی باتیں کہہ جاتا ہے کہ مقدمہ نگاروں کے 'مشوروں' کے باوجود وہ کانوں کو کھٹکتی ہیں - رباعیات میں فرط بے نیازی سے کبھی کبھی مصرعوں میں ایسی تکرار ہونے لگتی ہے جو ناگوار معلوم ہوتی ہے : -

"کیوں شکوۂ روزگار اے دل اے دل
دنیا تیری ہے میں بھی تیرا' تیرا
مرنا تو میں جانتا ہوں - ہوگا ہوگا"

'راحت کدے' میں شاعر نے اپنی رفیقۂ حیات کی یاد میں جو قطعات کہے ہیں ان میں سے کئی بہت پر درد ہیں اور بتلاتے ہیں کہ خلوص جذبات صحیح صناعی کی سب سے بڑی ضمانت ہے :

سحر کے روے رنگیں سے نقاب الٹھاے جاتے ھیں
دل محزوں پہ لیکن غم کے بادل چھاے جاتے ھیں
تمہارے ھجر میں باد صبا ایک آہ غم گیں ھے
نہیں تم جلوہ گر تو پھول بھی مرجھاے جاتے ھیں
تمہارے غم ربا جلوے عیاں ھیں لالہ زاروں میں
تمہارے دل نشیں نغمے رواں ھیں آبشاروں میں
تمہارا روے رنگیں ماہ تاباں میں درخشاں ھے
تمہاری مسکراھٹ رقص کرتی ھے ستاروں میں

اثر صاحب قدرت کی طرف سے شاعرانہ دل و دماغ لے کر آے ھیں اور ان کا مستقبل روشن ھے - مشق کے ساتھہ پختگی آتی جاے گی اور اگر ان کے مشاھدے کا دائرہ وسیع ھوگا اور وہ عوام کے دکھہ اور اس کے مداوے کو سمجھہ سکے تو ان کے کلام میں وہ شگفتگی ضرور آجاے گی جس کی توقع ایک شباب پرور شاعر سے کی جاتی ھے —

(ناخدا)



(۱) سودیشی اردو (۲) ضروری کہانیاں -

(مصنفۂ قاضی عبدالصمد صاحب - کاغذ طباعت و کتابت ، فاہمت - پہلی میں ۳۰ صفحات ھیں اور قیمت چار آنے ھے - دوسری میں ۷۲ صفحات ھیں اور قیمت چھہ آنے ھے - ملنے کا پتا - مولوی محمد ادریس میرٹھی - مکتبہ شرقیہ - دھلی)

دونوں کتابیں اسکول کی ضروریات کو مد نظر رکھہ کر لکھی گئی

ھیں اور اس لائق ھیں کہ ھمارے طلبہ انھیں بار بار پڑھیں —

سودیشی اردو سید انشا کی 'رانی کیتکی کی کہانی' اور ھندی کے مشہور شاعر ھری اودھ کی 'ٹھیٹھہ ھندی کے ٹھاٹ' کے طرز کی کتاب ھے - خوبی یہ ھے کہ فارسی اور عربی کا ایک لفظ نہ ھوتے ھوے بھی زبان پاکیزہ اور فصیح ھے - اگر اس قسم کی کتابیں برابر اشاعت پذیر ھوا کریں تو اس تحریک کو بڑی تقویت ھوگی جو مولویانہ اردو اور پنڈتانہ ھندی کی جگہ بول چال کی زبان کو ملک کی مشترکہ قومی زبان بنانا چاھتی ھے -

دوسری کتاب بھی بہت مفید ھے اور اسکی تالیف کا مقصد نہایت مستحسن ھے - یہ ھندوستان کے ایسے تاریخی واقعات کا مجموعہ ھے جن سے (۱) اھل ملک میں باھمی محبت اور حب وطن کے جذبات پیدا ھوں - (۲) جن سے اچھا اخلاقی سبق حاصل ھو - (۳) جن حکمرانوں کے متعلق بعض اشتعال انگیز واقعات مشہور ھیں ان کے وہ واقعات لکھے جائیں جن سے بدگمانیاں رفع ھوں —

یہ امر کتنا افسوسناک اور باعث شرم ھے کہ ھمارے ملک میں جہاں آے دن ایسی تحریکیں اٹھا کرتی ھیں جن سے فرقہ وارانہ کشیدگی بڑھتی جاے اور ایسی تحریریں بکثرت شایع ھوتی ھیں جن میں سے دلوں کی سیاھی کاغذ پر انڈیلی جاتی اور باھمی مناقشت کی آگ کو ھوا دی جاتی ھے ' وھاں اتحاد و رواداری کا جھنڈا برابر خاک بسر ھے اور کم لوگ ایسے ملتے ھیں جو اس خلیج کو پاٹنے کی کوشش کریں - اس قحط الرجال میں ایسی کوششیں لائق ستایش ھیں —

کیا اچھا ھو کہ ھماری قوم کے نونہال ان افترا پرداز تاریخوں کو پڑھنے پر مجبور نہ کیے جائیں جو اوائل عمر سے ان کے دلوں میں کینہ و تعصب کے

جذبات پیدا کرتی ہیں - اور اس قسم کی کتابیں ان کے ہاتھہ میں ہوں جو یک جہتی اور قومیت کی روح پھونکیں !

" ناخدا "



منتخب افسانے

مترجمہ سلیم آبادی صاحب - حجم ۵۰۰ صفحات - کاغذ ' کتابت و طباعت معمولی - قیمت ایک روپیہ - ملنے کا پتا ہلد بک ایجنسی چت رنجن ایونیو ' کلکتہ '

مترجم نے مشرق و مغرب کے شہرۂ آفاق افسانہ نگاروں کے ۳۸ افسانوں کو اردو میں منتقل کیا ہے - افسانہ نگاروں یا افسانوں کے انتخاب میں کوئی خاص التزام ملحوظ نہیں ہے - ترجمے کے متعلق یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ " افسانہ نگار کی اسپرٹ کو سمجھہ کر اسے اردو کے قالب میں ڈھال دیا ہے "- ہمارے خیال میں یہ طریقہ کسی طرح مستحسن نہیں ہے - جب تک آرتست کی لغوی اور معنوی خوبیاں برقرار نہ رہیں اس کے کمال کا صحیح اندازہ نہیں ہوسکتا - افسانہ ایک unit ہے جس کی اسپرٹ اگر روح ہے تو پیرایۂ بیان جسم ہے - ' قالب میں ڈھالنے ' والی ترکیب سے قصہ ہی قصہ باقی رہ جاتا ہے اور لطف بیان کی تمام نزاکتیں ضایع ہوجاتی ہیں - ان میں سے کئی افسانے انگریزی میں ہماری نظر سے گزر چکے ہیں اور ہمیں یہ کہنے میں تامل ہے کہ ترجمہ میں اصل کے حسن کی ایک جھلک بھی موجود ہے شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ اکثر تراجم عربی سے چھن کر اردو میں پہنچے ہیں اور اس صورت میں نگارش کی دلکشی کا باقی رہنا محال ہے - ترجمے کی عبارت یک رنگ ہوتے ہوئے بھی صاف اور سلیس ہے - ایک دو قصوں کے ساتھہ مصنف کا نام نہیں ہے مثلاً

شیخ حسن علی تھانہ دار۔ ممکن ہے یہ مترجم کی جدت طبع کے نمونے ہوں۔

ملیح آبادی سے غالباً عبدالرزاق صاحب ملیح آبادی کی طرف اشارہ ہے جو عربی کی کئی کتابوں کے ترجمے کر چکے ہیں۔ ملیح آباد میں اردو کے اور بھی ادیب ہیں اس لیے پورا نام نہ ہونے سے شبہ کی گنجائش رہ جاتی ہے ــ

بہر حال، جو لوگ انگریزی نہیں جانتے انھیں اس کتاب میں یورپ کے کاملین فن کا ایک ھلکا سا عکس مل سکتا ہے۔ان داموں کتاب مہنگی بھی نہیں ہے ــ

"ناخدا"



لال قلعہ کی ایک جھلک

مصنفۂ - خواجہ ناصر نذیر فراق مرحوم دھلوی - کتابت و طباعت دیدہ زیب - حجم ۱۲۵ صفحات - قیمت ایک روپیہ - ملنے کا پتا - ساقی بک ڈپو، کھاری باؤلی دھلی -

فراق مرحوم دلی کی اس تہذیب و معاشرت کے آئینہ دار تھے جس کے خط و خال انقلاب زمانہ نے بالکل مسخ کردیے اور اب وہ باتیں خواب معلوم ہوتی ہیں۔ اِن کے بعد اب کوئی نہیں رہا جو اس خراب آباد کی یاد تازہ کرے۔ دلی کی زبان لکھنے میں فراق مرحوم کو ید طولی حاصل تھا اور یہ کتاب ان کے مخصوص طرز انشاء کا بہترین نمونہ ہے - دلی یہ کتاب شرر کے شاہ کار "گزشتہ لکھنؤ" کے جواب میں پیش کر سکتی ہے - شاھد احمد صاحب مدیر ساقی مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے بڑی کاوش سے یہ مضامین لکھوائے اور مرتب کرکے کتابی صورت میں شائع کیے ورنہ یہ انمول موتی

یونہی بکھرے رہ جاتے - قدیم تمدن اور لطف زبان سے شغف رکھنے والوں کے لیے اس کا مطالعہ باعث مسرت ہوگا —

"ناخدا"

تاریخ و سیر

حیات مسعودی

(نوشتۂ مولوی محمد عباس خاں صاحب شروانی - صفحات ۱۶۱ قیمت ایک روپیہ چار آنے)

سالار مسعود غازی (عرف بالے میاں) کا نام جس قدر مشہور اور زبان زد خلائق ہے اسی قدر ان کے اصل حالات و واقعات تاریکی میں ہیں - مولوی محمد عباس خاں صاحب شروانی نے جہاں تک ان کی دسترس تھی مختلف تاریخوں، کتبوں، زبانی روایتوں وغیرہ سے تحقیق کرکے ان کی تاریخ مرتب کی ہے - مسعود غازی کے حالات میں صرف ایک ہی کتاب مرأۃ مسعودی ہے، جس میں بہت کچھ مبالغہ ہے اور بہت سی ایسی باتیں درج ہیں جو ساقط الاعتبار ہیں - اگرچہ مولف کتاب ھذا نے اپنی تاریخ کی بہت کچھ بنیاد اسی پر رکھی ہے لیکن انہوں نے تحقیق و تلاش میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا - ان تمام قدیم و جدید تاریخوں کا مطالعہ کیا ہے جن میں مسعود غازی کا ذرا سا بھی حوالہ تھا - بعض کتابیں جو دستیاب نہیں ہوئیں اور جن کا نام صرف دوسری تاریخوں میں ضمناً

آگیا ہے ' اس میں مجبوری تھی - موجودہ حالات میں قابل مولف کی سعی و محنت لائق تحسین ہے —

تذکرۂ محسن

(مولفہ مولوی محمد امین صاحب زبیری - صفحات ۳۰۸ + ۲۵ قیمت غیر مجلد ایک روپیہ چار آنے ' مجلد ایک روپیہ آٹھ آنے) -

اس کتاب میں نواب محسن الملک سید مہدی علی مرحوم کے حالات زندگی بیان کیے گئے ہیں- لکھنے والے مولوی محمد امین صاحب ہیں جن کو کچھ دنوں نواب صاحب مرحوم کے ساتھ رہنے کی عزت حاصل رہی ہے - اگرچہ محمد امین صاحب کے تعلق کا سلسلہ اس وقت سے شروع ہوا جب کہ نواب صاحب حیدرآباد سے رخصت ہو کر بمبئی میں قیام فرما تھے - لیکن چونکہ خود محمد امین صاحب کو زمانۂ دراز تک ایک اسلامی ریاست سے تعلق رہا اس لیے وہ ریاستوں کے معاملات کو خوب سمجھتے ہیں اور انہیں حیدرآباد کے حالات و معاملات کے سمجھنے میں ذرہ بھی دقت نہیں - حیدرآباد کے بعد علی گڑہ کالج کا دور شروع ہوتا ہے اور یہیں اُن کی زندگی کا خاتمہ ہو جاتا ہے - کالج کے حالات بھی لائق مولف نے بہت تحقیق سے جمع کیے ہیں یہ گویا اس وقت کے کالج کی صحیح تاریخ ہے —

اس سے قبل محمد امین صاحب نے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرس کے لیے بھی نواب محسن الملک کی سوانح عمری لکھی تھی - لیکن اب کے انہیں اتفاق سے اور کچھ نواب مسعود جنگ بہادر کی سعی سے نیا مسالا

ہاتھ لگا ہے جس سے یہ سیرت مکمل ہوگئی ہے - آخر میں بعض ضمیمے بھی اضافہ کیے گئے ہیں اور بعض انگریزی تحریریں اور خطوط جو اعلیٰ درجے کے انگریزوں نے خاص معاملات پر نواب صاحب کو لکھے تھے بجنسہ چھاپ دیے ہیں - ان میں لارڈ ڈفرن کا خط پڑھنے کے قابل ہے —

نواب صاحب میں بعض ظاہری اور باطنی ایسی خوبیاں تھیں جو اب شاذ و نادر پائی جاتی ہیں - چونکہ وہ مختلف حیثیتوں کے جامع تھے- اُن کا تعلق ملک اور خصوصاً مسلمانوں کی زندگی اور بہبودی سے تھا اس لیے اُن کی زندگی بہت ہی دلچسپ اور بصیرت افروز ہے- مولوی محمد امین صاحب نے اپنے اس فرض کو بڑی خوبی اور محنت سے انجام دیا ہے —



انقلاب فرانس

مصنفۂ باری صاحب - صفحات ۱۰۷ - قیمت درج نہیں - کتابت و طباعت اچھی - ملنے کا پتا - اردو بک اسٹال لوہاری گیٹ - لاہور —

انقلاب فرانس تاریخ عالم کا نہایت اہم واقعہ ہے اور سنہ ۱۷۸۹ ع عصر جدید کی آفرینش کی تاریخ کہی جاسکتی ہے - آج دنیا میں مساوات' اخوت اور آزادی کے جو پرچم لہرا رہے ہیں اس کی ابتدا اول اول وہیں سے ہوئی - زیر نظر کتاب میں مصنف نے پہلے تو نشاۃ ثانیہ سے لے کر لوئی پانزدہم کے عہد حکومت تک کا ایک سرسری سا جائزہ لیا ہے - بعد ازآں استبداد کا خاکہ پیش کرکے امکانات انقلاب پر بحث کی ہے - اس ضمن میں انہوں نے جو کچھ لکھا ہوگا صحیح ہو یا غلط لیکن ہم ان کی انقلاب کی تعریف کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں کیونکہ وہ بادی النظر میں انقلاب

اور بغاوت میں کوئی امتیاز نہیں سمجھتے درآں حالیکہ ان دونوں میں بعد مشرقین ہے - کروپاٹکن اپنی تاریخ انقلاب فرانس میں اس تاریخی روش (Process) کی یوں تشریح کرتا ہے : شہروں اور دیہاتوں کی بھیڑیری بغاوتوں سے بھی انقلاب کا دائرہ کہیں زیادہ وسیع ہے- وہ خوفناک جماعتی لڑائیوں یا حکومت کی تبدیلیوں سے زیادہ دور رس ہے - انقلاب نام ہے چشم زدن میں ان اداروں کے نیست و نابود ہوجانے کا جو صدیوں سے قائم تھے اور جن کی بنیادوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بڑے بڑے سورما رفارمر بھی لرزتے تھے - انقلاب نام ہے اس عہد کے سیاسی' اقتصادی اور سماجی ایوانوں کے زمین دوز ہو جانے کا - انقلاب تعلقات انسانی اور سماجی اداروں کی قدیم بنیادوں کو تہس نہس کر کے نظام زندگی کا ایک نیا ڈھانچا کھڑا کرتا ہے - پھر اس کے اصول رفتہ رفتہ دنیا میں پھیلتے جاتے اور آنے والی نسلوں کے لیے تمدنی' اقتصادی اور سیاسی ترقی کی نئی شاہراہیں کھول دیتے ہیں - اس لحاظ سے انقلاب فرانس کی نوعیت بالکل مختلف ہے —

مصنف یہ بتلانے میں کامیاب ہوے ہیں کہ انقلاب کی تحریک کس ماحول میں نشو و نما پارہی تھی - لیکن انقلاب کی قیادت کن ہاتھوں میں تھی اس کے سپاہی کون تھے' اس کے مطالبات کیا تھے' اور وہ کیوں نہ پورے ہوے - ان اہم سوالات کا جواب اس کتاب میں ملے گا —

یہ فرانس کا سرمایہ دارانہ جمہوری انقلاب - (Bourgeois democratic Revolution) تھا - یعنی یہ ساملتی شکنجوں سے آزاد ہونے کے لیے حرفتی سرمایہ داری کی کامیاب سعی تھی - ہر حکومت کا دارومدار کسی خاص طبقے کے اقتصادی مفاد پر ہوتا ہے اور اس کے استوار ہونے کی ضمانت اس طبقے کے فروغ پر ہے - جب کوئی نیا طبقہ اپنے تاریخی فرایض کو پورا کرنا

چاھتا ھے تو ضروری ھو جاتا ھے کہ وہ حکومت وقت کو ایسی تشکیل دے کہ وہ اس کے ارادوں میں حارج نہ ھو - فرانس میں مشینوں کے رواج اور دور حرفت کے آغاز کے بعد یہ ناگزیر تھا کہ فرسودہ نظام حکومت بدل جاے تاکہ اس کی پوش پا افتادہ پابندیاں متوسط طبقے کی راہ میں حایل نہ ھوں - اس مہم میں وہ صرف اس وقت فتحیاب ھوتا ھے جب کہ عوام اس کے دوش بدوش استبداد سے لڑیں - جب ان کی امداد سے متوسط طبقے نے سامنہت سے نجات حاصل کی تو مساوات' اخوت اور آزادی کے معنے بدل گئے - پھر سرمایہ داروں میں ان ارکان ثلاثہ کے مطلب یہ سمجھے جانے لگے کہ آزادی ھو مگر ظلم کرنے کی- اخوت ھو لیکن صرف ظالموں میں - اور مساوات ضرور ھولیکن عالم بالا میں- لیکن یہ بھی ایک ناگزیر نشان راہ تھا کیونکہ اس زمانے میں وہ شترا کی انقلاب ممکن ھی نہ تھا جس کے سرگرم موئید باری صاحب معلوم ھوتےھیں- مارکس اور لینن نے اپنی کتابوں میں جابجا اور خصوصاً "پیرس کمیون" میں اس کا اعتراف کیا ھے —

بھرحال یہ مسئلہ ایک بسیط مقالہ کا حاجت مند ھے اور ھم صرف یہ کہہ کر اکتفا کرتے ھیں کہ اس کتاب کے حدود کو دیکھتے ھوے اس میں معلومات کا نہیں تو دلچسپی کا کافی مواد موجود ھے- طرز تحریر خطیبانہ ھوتے ھوے بھی دلکش ھے - کتابیات میں حسب ذیل کتابوں کا اندراج ضروری تھا —

(۱) انقلاب فرانس از ھالینڈ روز (۲) انقلاب فرانس از میڈلن (۳) انقلاب فرانس از مالیت (۴) انقلاب فرانس از کروپاٹکن (۵) انقلاب فرانس میشلے (۶) انقلاب فرانس از اولارد (۷) انقلاب فرانس از کارلائیل —

"ناخدا"

متفرقات

اردو پرائمری مدارس صوبۂ متوسط و برار کا درسی سلسلہ

(عطر چند کپور اینڈ سنز بک سلیرز اینڈ پبلشرز لاہور)

اس سلسلے میں اردو کا قاعدہ اور پہلی چار کتابیں شامل ہیں - یہ سب کتابیں عمدہ کاغذ پر بہت اچھی چھپی ہیں - قاعدے میں ابھی اصلاح کی بہت کچھہ گنجائش ہے - موجودہ صورت میں بچوں کے لیے کوئی سہولت نہیں پائی جاتی - اعراب کے لگانے میں بھی کوئی خاص اصول مد نظر نہیں رکھا گیا -

باقی چار کتابیں تعلیمی اور ادبی لحاظ سے بہت مناسب اور معقول ہیں - زبان ایسی رکھی گئی ہے جو اس صوبے کے بچوں کے لیے غیر مانوس نہیں - بعض اسباق ایسے داخل کیے گئے ہیں جن کا تعلق خاص صوبۂ برار سے ہے اور یہ اس سلسلے کے لیے ضروری تھا - علاوہ ادبی اور اخلاقی مضامین کے عام معلومات کے مضامین بھی کافی تعداد میں ہیں - موقع موقع سے عکسی اور رنگین تصویریں بھی دی گئی ہیں - خاں صاحب خواجہ لطیف احمد صاحب بی - اے نے جن کی تمام عمر تعلیم و تعلم میں گزری ہے ' اس سلسلے کو مرتب کیا ہے - اس کی ترتیب و تالیف میں خواجہ صاحب نے بڑے سلیقے سے کام لیا ہے —

اُردُو کے جدید رسالے

انیس

(اڈیٹر شرار بی - اے صاحب - سالانہ قیمت - دو روپے آٹھ آنے - ایلچ پور ' برار)

یہ ماهانہ رسالہ ایلچ پور برار سے شایع هوتا هے - مضامین مختلف قسم کے اور دلچسپ هوتے هیں - اس علاقے میں ایک ایسے رسالے کی بہت ضرورت تھی - اهل برار کو اس اردو رسالے کی حوصلہ افزائی کرنی چاهیے ' وهاں ابھی اردو کا چرچا هے اور اس کی ترقی اور اشاعت کے لیے هر طرح کی سعی درکار هے —

صبح امید

(اڈیٹر مدن گوپال متل صاحب بی - اے - سالانہ قیمت تین روپے - مقام لدھیانہ)

یہ ماهانہ رسالہ جو ابھی لدھیانہ سے نکلنا شروع هوا هے ' هونہار معلوم هوتا هے - سرورق پر "علمی ادبی اور تعلیمی" رسالہ لکھا هے اور اس مقصد کے نباهنے کے لیے قابل اڈیٹر نے مفید اور دلچسپ دونوں قسم کے مضامین جمع کیے هیں —

اوانی عليگيرين

(ایڈیٹر سعید محمد خاں صاحب بھوپالی - کراؤن سایز اردو کے ۴ اور انگریزی
کے ۴ صفحات - کاغذ طباعت و کتابت اچھی - سالانہ قیمت - ۱۲ روپے)

سعید محمد خاں صاحب پہلے بھی یہ اخبار نکالتے تھے اور اب علی گڑہ
اور وہاں کی جمعیت کی خدمت کے ارادے سے ازسرنو اس کی اشاعت
شروع کی ہے - پیش نظر نمبر اس جریدہ کا (experimental) یعنی تجرباتی
نمبر ہے گویا یہ ایک 'محاس' ہے جس سے یہ معلوم کرنا مقصود ہے کہ
اتنے خریدار فراہم ہوتے ہیں یا نہیں جو اسے کفیل بالذات بنا دیں - اگر ایسا
ہوا تو فبہا ورنہ احتمال اس کا ہے کہ ایک " Longing tearfuladieu "
'پر حسرت اور اشک فشاں الوداع' کے ساتھ وہ ہم سے رخصت ہو جاے گا -
تاہم وہ اخباری برادری کے لیے ایک نیا پیمانہ چھوڑ جاے گا جس کے
ذریعے وہ اپنی مختصر سی تھیلی کا جائزہ لے سکے گی —

اگر اخبار کا معیار آئندہ بھی وہی رہے گا جو اس نمبر کا ہے تو ہم ابھی
سے مایوس ہو چکے - اداریہ کی انگریزی میں پوپ اور ڈرائیڈن کا اسلوب
اختیار کیا گیا ہے - یہ برا نہیں ہے کہ جہاں اردو میں اب بھی طلسم ہوش
ربا اور فسانۂ عجائب کی پیروی کرنے والے حضرات موجود ہیں کیوں نہ
انگریزی کا وہ دور زندہ کیا جاے جب ایک ایک جملے میں سو سو بل اور ہر
ہر بل میں ہزاروں پیچ ہوتے تھے —

انگریزی کے چار صفحات میں سے ڈیڑھ صفحہ اُن شقوں کے لیے وقف ہے جو
بعض حکام نے ایڈیٹر صاحب کے خطوط کے جواب میں ارسال کی تھیں - یہ علی گڑہ
کی سنت دیرینہ ہے جس کے متعلق کچھہ کہنا سوے ادب سمجھا جاے گا —

شعبۂ اردو ایک قصیدہ سے شروع ہوتا ہے جو نواب صاحب بھوپال کی تعریف میں ہے - پھر کچھہ خطوط اور 'کھلنڈرے پن' کی باتیں ہیں - ایک دو رخی تصویر ہے جس میں سے ایک طرف کچھہ گمنام علیگ صاحبان کا گروپ ہے اور دوسری طرف ایک کارٹون ہے —

اگر واقعتاً یہ جریدہ علی گڑہ کی اصلاح کے لیے نکالا گیا ہے تو اس کا پیرایہ زیادہ متین اور سنجیدہ ہونا چاهیے - اسے ان بنیادی مسائل کو پیش کرنا چاهیے جن پر علی گڑہ کی موجودہ ممات اور آئندہ حیات کا دار و مدار ہے —

(نا خدا)

435

همایوں کا روسی ادب نمبر

مئی سنہ ۳۵ ع - مرتبہ بشیر احمد صاحب بی - اے (آکسن)

حجم - معمولی نمبروں سے کچھہ زیادہ —

روسی ادب سے ہندوستانی تعلیم یافتہ طبقے کی روز افزوں دلچسپی اس ذہنیت کا پرتو ہے جو نظام زندگی کے انتشار کی وجہ سے پیدا ہوگئی ہے - بے کاری اور افلاس کی گراں باری ادب کو رومانی فضا سے نکال کر حقیقت نگاری کی طرف آنے کے لیے مجبور کر رهی ہے —

اس لیے جب ہم نے سنا کہ پنجاب کا ممتاز ماہ نامہ 'همایوں' ایک روسی ادب نمبر نکال رہا ہے تو ہمیں خوشی ہوئی اور ہم اس کی اشاعت کے منتظر رہے - لیکن یہ دیکھہ کر مایوسی ہوئی کہ ادارہ نے اس کی ترتیب میں کاوش سے کام نہیں لیا - ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں

کہ پورے روسی ادب کا احاطہ ایک آدہ سو صفحات کے رسالے میں کیسے کیا جا سکتا ہے۔ طالسطائی، دستوویسکی، گورکی یا کسی بھی قابل ذکر ادیب کے تعارف کے لیے اتنا بڑا نمبر مشکل سے کافی ہوتا۔ چاہیے یہ تھا کہ روسی ادب کے ہر دور کا ایک مختصر سا تجزیہ پیش کیا جاتا اور ہمیں یقین تھا کہ پیش نظر رسالہ میں کم از کم دور قدیم اور دور جدید پر اجمالی نظر ڈالی گئی ہوگی۔ لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ روسی ادب پر کوئی تنقیدی مضمون نہیں ہے اور جو ایک 'طائرانہ نگاہ' ہے بھی تو اس کی حیثیت ادیبوں کی پیدائش اور موت کی تاریخوں کے گوشوارہ سے زیادہ نہیں! پھر یہ سمجھ میں نہ آیا کہ اس ادبی نمبر میں 'بولشیوک روس کا پس منظر' 'لینن خدا کے حضور میں' اور 'روسی تاریخ کے مشہور سنین' کی اشاعت کا کیا موقع و محل تھا، بلا بریں' بولشیوک روس کا پس منظر جس مطالعے اور تحقیق کا محتاج ہوگا اس مضمون کے احاطے سے باہر ہے ــــ

یہ بھی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ نمبر پورے روسی ادب کے لیے وقف ہے یا جدید روسی ادب کے لیے۔ اگر کلاسک ادب کی مثالیں دینا منظور تھیں تو دستوویسکی یا پیشکن کو کیوں کر نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ اور اگر طرز جدید کو نمایاں کرنا تھا تو گواکی، رومیناف، بیبل یا ایرن برگ کو کیسے فراموش کیا جا سکتا ہے مثالوں کے انتخاب میں بھی خوش ذوقی سے کام نہیں لیا گیا ــــ

مختصر یہ کہ اس نمبر کی ترتیب جلدی میں کی گئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کل ترجمے قلم برداشتہ ہوے ہیں اور وہ بھی ایک ہی قلم سے۔ اس قلم کی گل‌فشانی ملاحظہ ہو:

"جنگ کی ستم آفرینیوں کی یاد'

اور اس کے ہر ایک صید بسمل کا تصور'

وابستہ کردیتا ہے میرا رشتۂ ہمدردی'

مرتے ہوے نوجوان دوست اور پیاری بیوی سے زیادہ اہم ہستی کے ساتھ"۔

ایک تو ترجمہ در ترجمہ اور پھر یہ الجھی ہوئی تحریر — ستم بالاے ستم ہے —

رسالے کے آخر میں ایک دلچسپ فروگزاشت ملے گی - ایک نظم اور ایک اشتہار ساتھہ ساتھہ چھپے ہیں — جن میں سے نظم کا عنوان ہے 'عشق انوکھی ریت ہے پیارے' جواب برآمد 'صرف بالغوں کے لیے'! مضامین اور اشتہارات ایک صفحے پر نہ چھاپے جائیں تو اچھا ہو —

اُمید ہے کہ ادارۂ ہمایوں اپنے آئندہ فرانسیسی ادب نمبر میں ایسی خامیوں کا اعادہ نہ ہونے دے گا —

"ناخدا"

435